نقشِ نو

۲۰۱۶ - ۲۰۱۷

سالانہ عالمی اردو جریدہ

(قومی سیمینار 'انیسویں صدی میں اردو ادب و صحافت
منشی دوارکا پرساد افق کے خصوصی حوالے سے' میں پیش کردہ مقالات)

شعبۂ اردو

حمیدیہ گرلس ڈگری کالج الہ آباد

الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

Scanned with CamScanner

پروفیسر ظفر احمد صدیقی، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے

مخصوص سیشن: اردو زبان کے مختلف علاقائی تجربات میں ڈائس پر تشریف فرما ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط، ڈاکٹر عا
شہنواز شبلی، ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی، ڈاکٹر لئیق رضوی، ڈاکٹر منظور گوئق، ڈاکٹر ریحان حسن

Scanned with CamScanner

نقشِ نو

سالانہ عالمی اردو جریدہ

شمارہ نہم

۲۰۱۶۔۲۰۱۷

(قومی سیمینار 'انیسویں صدی میں اردو ادب و صحافت:
منشی دوارکا پرساد افق کے خصوصی حوالے سے' میں پیش کردہ مقالات)

مدیر: ناصحہ عثمانی معاون مدیر: زرینہ بیگم

شعبۂ اردو

حمیدیہ گرلز ڈگری کالج

الہ آباد سنٹرل یونیورسٹی، الہ آباد۔ یو۔ پی۔ انڈیا

Scanned with CamScanner

"نقشِ نو" سالانہ عالمی اردو جریدہ ۔ شمارہ نہم

سرپرست: مسز تزئین احسان اللہ

نگراں: ڈاکٹر یوسف نفیس

مجلسِ مشاورت:

پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی

ڈاکٹر ریحانہ طارق

ڈاکٹر مامون ایمن

مجلسِ ادارت:

اعزازی مدیر: پروفیسر عبدالحق

مدیر: مسز ناصحہ عثمانی

معاون مدیر: مسز زرینہ بیگم

معاونین:

ڈاکٹر شبانہ عزیز

ڈاکٹر ندرت محمود

ڈاکٹر فرح ہاشم

کائنات انصاری

کمپیوٹر کمپوزنگ: تسلیم

ناشر: شعبۂ اردو، حمیدیہ گرلز ڈگری کالج، نوراللہ روڈ، الہ آباد۔ یو۔ پی۔ انڈیا

فون نمبر: 0532-2656526 موبائل نمبر: 9559258741

ای میل: hamidia_alld@yahoo.co.in

naseha29@yahoo.co.in

ISSN 2320-3781 **Naqsh-E-Nau**

قیمت: اندرونِ ملک 100 روپئے ، بیرونِ ملک 10 ڈالر (ڈاک خرچ الگ)

"نقشِ نو" کے مشمولات میں ظاہر کردہ نفسِ مضمون سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

(جملہ حقوق بحق شعبۂ اردو، حمیدیہ گرلز ڈگری کالج محفوظ ہیں۔)

Scanned with CamScanner

فہرست

نمبر شمار	عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
	حرفے چند	ناصحہ عثمانی	
۱۔	انیسویں صدی کا ادبی اور صحافتی سفر	ڈاکٹر ریحان حسن	۳
۲۔	منشی دواریکا پرشاد ایک منفرد صحافی	ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی	۳۰
۳۔	انیسویں صدی میں اردو صحافت	ڈاکٹر ابرار رحمانی	۳۵
۴۔	دشت تو دشت ہے دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے	ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی	۴۳
۵۔	دوارکا پرشاد افق کی تقدیسی شاعری	ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط	۵۳
۶۔	افق کی صحافتی و ادبی خدمات	ڈاکٹر ارشاد احمد	۶۶
۷۔	انیسویں صدی کے ادبی و صحافتی سفر کا ایک ناول۔۔۔۔۔	ڈاکٹر نفیس بانو	۷۵
۸۔	منظوم صحافت کے موجد افق لکھنوی	ڈاکٹر لئیق رضوی	۸۵
۹۔	لکھنؤ کی تہذیب و ثقافت کا عکاس	ڈاکٹر اسلم جمشید پوری	۹۱
۱۰۔	دبستان لکھنؤ کا ادبی و صحافی منظر نامہ موجودہ تناظر میں	ڈاکٹر محمد نسیم الدین ندوی	۱۰۱
۱۱۔	انیسویں صدی کے لکھنؤ کا تاریخی پس منظر	ڈاکٹر ندیم اشرف	۱۰۹
۱۲۔	افق کی صحافتی خدمات	مسز زرینہ بیگم	۱۱۷
۱۳۔	تہذیب الاخلاق کی ادبی و سماجی خدمات	رضوانہ شمسی	۱۳۰
۱۴۔	سرزمینِ دکن میں اردو صحافت	ڈاکٹر جوہی بیگم	۱۳۶

Scanned with CamScanner

۱۵۔	انیسویں صدی میں ادب وصحافت ایک تعارف	ڈاکٹر شاہد خان	۱۴۴
۱۶۔	انیسویں صدی کے صحافتی سفر پر ایک نظر	ڈاکٹر زینت رضا	۱۵۲
۱۷۔	انیسویں صدی کی صحافت میں 'تاریخ بغاوت ہند' کا حصہ	ڈاکٹر نزہت فاطمہ	۱۵۷
۱۸۔	اودھ پنچ کی ادبی وصحافتی خدمات	ڈاکٹر فرح ہاشم	۱۶۴
۱۹۔	سرسیّد اور صحافت	ڈاکٹر صدیقہ جابر	۱۷۰
۲۰۔	لکھنؤ میں اردو اخبارات کی روایت اور نظم اخبار	محمد افضل	۱۸۴
۱۲۔	ہندوستان میں فارسی صحافت (انیسویں صدی میں)	عابدہ	۱۹۹
۲۲۔	دوارکا پرشاد افق۔ادب وصحافت کے آئینے میں	عرشیہ سرفراز	۲۰۵
۲۳۔	انیسویں صدی میں اردو صحافت کی سمت ورفتار	سلمان عبدالصمد	۲۱۷
۲۴۔	انیسویں صدی میں اردو صحافت	روپہلا ثاقب	۲۲۴
۲۵۔	انیسویں صدی کا ادبی اور صحافتی سفر: ایک تجزیہ	شمشاد بی	۲۳۰
۲۶۔	انیسویں صدی کا لکھنؤ، تاریخ، ادب اور صحافت۔۔۔	سفینہ سماوی	۲۳۹

Scanned with CamScanner

حرفے چند

دانشورانِ اردو ادب بخوبی واقف ہیں کہ انیسویں صدی برصغیر کی تاریخ میں ایک اہم حیثیت رکھتی ہے۔ انگریز حکومت کی غلامی اور اس سے ہونے والے اثرات اس صدی میں ظہور پذیر ہوئے۔ یہ صدی ہندوستان کی تاریخی و تہذیبی منظر نامہ پر ایک انقلاب آفریں عہد کی شکل میں درج ہے اور اس تبدیلی نے صرف تاریخ و سیاست کو ہی نہیں ادب کو بھی متاثر کیا۔ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کے قیام نے ایک طرف اردو زبان کو مقبول و معروف کیا وہیں اودھ کے قیام نے ادبی فضا کو بھی زرخیز کیا۔ اردو صحافت کا آغاز بھی اسی صدی کی ابتدا میں ہوا۔ اردو صحافت نے اپنے عہد کے اہم ترین مسائل اور عوامی جذبات و احساسات کی ترجمانی کا فریضہ جرأت مندی سے ادا کیا۔ انیسویں صدی کے اہم اور مشہور اخبارات کی صف میں منشی دوارکا پرساد افق کا اخبار 'نظم' بھی تھا۔ 'نظم' اخبار ۱۵/اگست ۱۸۸۸ء کو جاری ہوا۔ اس اخبار نے نظم کی شکل میں اخبار کی ایک مثال قائم کی۔ افق نظم اخبار، پنجاب سماچار، دھرم سجیون کے مدیر رہے۔ بھارت پرتاپ اودھ پنچ، زمانہ، اودھ اخبار، شیو شمبھو جیسے مشہور اخبارات میں ان کی غزلیں اور مضامین مستقل شائع ہوتے رہے۔ منشی دوارکا پرساد افق کی وابستگی اودھ اخبار سے بھی رہی وہاں بھی انہوں نے قابل قدر خدمات انجام دیں۔ نظم اخبار کے صفحہ اوّل پر ایک شعر درج ہوتا تھا۔

از تمنائے تمنا و تمنائے افق
گشت نظم اخبار مہر عالم آرائے افق

'نظم اخبار' کی تمام خبریں منظوم ہونے کے ساتھ ساتھ بہت معلوماتی بھی ہوا کرتی تھیں۔ ان کی صحافتی خدمات کا چہار جانب چرچا تھا۔ علمی و ادبی دنیا میں افق لکھنوی کی کافی شہرت تھی۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ صرف افق لکھنوی ہی نہیں بلکہ ان کے پورے خاندان نے اردو ادب کی خدمات انجام دی ہیں۔ چنانچہ افق کی صحافتی اور ادبی خدمات کو مدنظر رکھتے ہوئے ادبی حلقہ میں افق کو ان کے مستحق مقام سے متعارف کرانے نیز انیسویں صدی میں اردو ادب و صحافت کے تجزیاتی مقاصد کے پیش نظر حمیدیہ گرلس ڈگری کالج، الہ آباد کے شعبۂ اردو نے یو۔ جی۔ سی۔، نئی دہلی کے تعاون سے

Scanned with CamScanner

دو روزہ قومی سیمینار کا انعقاد بموضوع ''انیسویں صدی میں اردو ادب و صحافت: دوارکا پرساد افق کے خصوصی حوالے سے'' بتاریخ ۱۷، ۱۸ فروری ۲۰۱۶ء کو کیا۔ افق کی پوتی ڈاکٹر کومل بھٹناگر افتتاحی جلسہ کی اعزازی مہمان تھیں انہوں نے اپنے خطبہ میں افق کی پیدائش اور خاندان کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کی۔ افق کے دادا فارسی کے اچھے شاعر اور بڑے نثر نگار تھے ان کی شاعری میں صوفیانہ خیالات کا اظہار ہے۔ افق نے ۱۸۷۵ء میں نوبستہ میں ایک مطبع قائم کیا جہاں سے ہفت روزہ اخبار 'تمنائی'' اور ''مہر ظرافت'' وغیرہ نکلتا تھا۔ اس میں رام پور کے نواب کا کلام چھپتا تھا۔ اس وقت آزادی کی تحریک شروع ہو چکی تھی انگریز حکمراں ان قلم کاروں، دانشوروں سے خوف زدہ رہتے تھے لیکن ان ادبا نے اس سلسلے میں اپنے قلم کے ذریعہ عوام میں بیداری پیدا کی۔ افق نے بطور نثر نگار، ناول نگار، غزل گو غرض ہر صنف میں طبع آزمائی کی اور معیاری کلام پیش کیا۔ وہ ملک الشعرا بھی کہلائے۔ انھوں نے نظم اخبار چھ سال تک لکھنؤ سے نکالا جس میں منظوم خبریں ہوا کرتی تھیں۔ انھوں نے مہابھارت اور رامائن کا منظوم ترجمہ بھی کیا۔

افق کی ادبی اور صحافتی اہمیت کو دنیائے اردو سے روشناس کرانے اور افق کی ہمہ جہت شخصیت کو برسر عام لانے کی یہ کوشش یقیناً کامیاب ہوئی اور مذکورہ سیمینار میں تقریباً ۴۰ مقالات پیش کیے گئے۔ تکرار سے گریز کرتے ہوئے کچھ مضامین اس بار شامل اشاعت نہیں ہو سکے۔ ایسے مقالہ نگاروں سے ادارہ نیز نقش نو کی مجلس ادارت معذرت خواہ ہے۔ پھر بھی نسل نو کی نمائندگی اور حوصلہ افضائی کے لئے بعض مضامین کی تکرار ناگزیر تھی یقین ہے کہ قارئین ہماری اس مجبوری کو سمجھیں گے۔ امید ہے کہ یہ شمارہ انیسویں صدی کے ادب و صحافت نیز افق فہمی میں ایک قابل قدر اضافہ ثابت ہوگا۔ مجلس ادارت سبھی مقالہ نگاروں کی تہ دل سے شکر گزار ہے کہ ان کی معاونت کے بغیر یہ کام ممکن نہیں تھا۔ یہ خصوصی شمارہ قارئین کے ہاتھوں میں ہے آپ کی رائے شمارے کی کامیابی کی ضامن ہے۔

ناصحہ عثمانی

Scanned with CamScanner

انیسویں صدی کا ادبی اور صحافتی سفر

صحافت لفظ صحیفے سے نکلا ہے جس کے لغوی معنی کتاب یا رسالہ کے ہیں۔ لیکن صحافت سے مراد ایسا مواد لیا جاتا ہے جو مقررہ وقت پر شائع ہو اور ہمارے گرد و پیش میں رونما ہونے والے واقعات و حالات سے باخبر کرے۔ خود ہمارے نبی کریم حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کو "مخبر صادق" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ انسانوں کی ہدایت و رہبری کے لئے جو سلسلہ چلا انھیں بھی ہم انبیاء کرام کہتے ہیں۔ دراصل لفظ انبیاء نبی سے بنا ہے اور لفظ نبی نبا سے مشتق ہے جس کے معنی خبر کے ہیں اس روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ عوام تک خبریں پہچانا ایسا مقدس فریضہ ہے جسے انبیاء کرام نے بھی انجام دیا ہے۔ اس طرح صحافت کا پیشہ اسلامی نقطۂ نظر سے قابل قدر ہے۔

انیسویں صدی میں جب اردو صحافت کا آغاز ہوا تو صحافیوں نے اردو صحافت کو بطور پیشہ اختیار کرنے کے بجائے عبادت سمجھ کر فریضہ انجام دیا۔ اسی لئے عوام تک سچی خبریں پہچانے کی خاطر صحافیوں نے اپنی جان کی پروانہ کی جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام میں صحافت کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ اردو زبان چونکہ ملک میں رابطہ کی زبان تھی لہذا اپنی فطری دلکشی اور عوامی مقبولیت کے سبب دیگر زبانوں کے مقابلے میں اردو صحافت نے دوسری زبانوں کی صحافت کو بہت پیچھے چھوڑ دیا۔

سچ تو یہ ہے کہ سرزمین ہندوستان پر انگریزوں کی آمد کے بعد پریس اور اخبارات نے جنم لیا چونکہ شہر کلکتہ انگریزوں کی حکومت، تہذیب، تعلیم اور تجارت کا مرکز تھا لہذا سب سے پہلے ۲۹ر جنوری ۱۷۸۰ء میں کلکتہ سے ہی اخبار انگریزی میں "بنگال گزٹ" شائع ہوا جس میں انگریز عہدیداروں کے جارحانہ اقدام اور مظالم پر تنقید کی جاتی تھی لہٰذا اخبار کے ایڈیٹر اور مالک آگسٹس ہکی کو دھوکہ سے ۱۸۸۱ء میں گرفتار کر کے ملک بدر کر دیا گیا اور عدالت عالیہ (سپریم کورٹ) نے اشاعت پر پابندی بھی لگا دی لارڈ منٹو (۱۸۵۷ء تا ۱۸۱۳ء) نے اخبارات کو تنبیہ کی کہ وہ ایسے مضامین کو شائع کرنے سے پرہیز کریں کہ جس میں نفرت انگیز مضامین ہوں۔ یورپی صحافی ڈاکٹر

Scanned with CamScanner

جیمز برائس نے ''ایشاٹک مرر'' جاری کیا جس کی نقل کرتے ہوئے دیگر اخبارات نے بھی اپنا رویہ تبدیل کرلیا۔ ۱۸۱۸ء میں گورنر جنرل نے اخبار کو محاسبہ (سینسر شپ) کی قید و بند سے آزاد کرتے ہوئے قواعد و ضوابط بھی بنائے۔ حکومت کی ان پابندیوں کی بدولت اردو صحافت کا جب آغاز ہوا تو حالات موافق نہ تھے۔ سرزمین ہند پر ملکی زبان میں پہلا اخبار ۱۷۹۴ء میں سری رنگا پٹن کرناٹک سے ٹیپو سلطان نے ہفت روزہ ''فوجی اخبار'' نکالا اس تحقیق کی رو سے اردو صحافت کی عمر اب تک ۲۲۲ سال قرار پاتی ہے۔ مولوی نصیر الدین ہاشمی نے ۱۷۹۶ء اور ۱۸۰۲ء کے درمیان شائع ہونے والے اخبار ''اعظم الاخبار'' کو جنوبی ہند کا پہلا اردو اخبار تسلیم کیا ہے۔ ایک تحقیق یہ بھی ہے کہ مولوی اکرام علی نے اردو کا پہلا اخبار ''اردو اخبار'' ۱۸۱۰ء میں شائع کیا اس تحقیق کے اعتبار سے اردو صحافت کی اب تک مدت حیات ۲۰۶ سال ہوتی ہے۔ بیشتر لوگوں کا اس پر اتفاق ہے کہ اردو زبان کا پہلا اخبار ''جام جہاں نما'' ۲۷ر مارچ ۱۸۲۲ء میں کلکتہ سے شائع ہوا اس تحقیق کی رو سے اردو صحافت کی عمر ۱۸۴ سال ہوتی ہے۔ ان تحقیقات کی روشنی میں اردو صحافت کے آغاز کی حتمی تاریخ طے نہیں البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اردو صحافت کی دو سو سال سے زائد حیات ہو چکی ہے فی الوقت آر۔ این۔ آئی کے ڈائریکٹر جنرل ایس۔ ایم۔ خاں کے مطابق ہندوستان میں اردو اخبارات و رسائل کی مجموعی تعداد چار کروڑ ۱۲ لاکھ ۷۳ ہزار ۹۴۹ ہے جن میں ایک لاکھ پانچ ہزار ۱۴۴۳ اخبار اور رسالے رجسٹرڈ ہیں۔

دراصل ''جام جہاں نما'' بنیادی طور پر فارسی اخبار تھا۔ اس ہفت روزہ کے چھ شمارے اردو زبان میں شائع ہوئے پھر اس کا فارسی ضمیمہ ۱۹ر مئی ۱۸۲۲ء کو شائع ہونا شروع ہوا۔ اخبار کی مقبولیت کے پیش نظر اردو حصہ فارسی میں ضم ہو گیا پھر ۱۸۲۳ء میں فارسی کے ساتھ اردو ضمیمہ نکلنے لگا جو چار سال آٹھ مہینے جاری رہنے کے بعد ۲۳ر جنوری ۱۸۲۸ء کو بند ہو گیا۔ اس اخبار کے مالک فورٹ ولیم کے خزانۂ عامرہ کے دفتر کے محرر ہری ہر دت بنگو تھے اخبار کے پرنٹر ولیم پیٹرس ہوپکنس تھے یہ اخبار چار صفحات پر چھپتا تھا ہر صفحے میں دو کالم ہوتے تھے ہر بڑے شہر میں اس کے نمائندے

Scanned with CamScanner

تھے علمی اور ادبی حلقوں میں قدر و منزلت کی نظروں سے اخبار کو دیکھا جاتا تھا اس اخبار کے خریداروں میں مرزا غالب جیسی نابغۂ روزگار شخصیت بھی تھی۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اردو صحافت کے آغاز ''جام جہاں نما'' کے چار سال بعد ہندی صحافت کی ابتداء ہفت روزہ ''اوڈنٹ مارتنڈے'' سے ۱۸۲۶ء میں ہوئی۔ اس پہلے ہندی اخبار کے ایڈیٹر پنڈت جُگل کشور تھے۔

صحافت کی تاریخ میں شہر کلکتہ کو یہ فخر و افتخار حاصل ہے کہ اردو، فارسی اور ہندی صحافت کا آغاز اسی شہر سے ہوا۔ ہندوستان میں انگریزی صحافت کے آغاز کے ۳۸ سال بعد پہلا اخبار بنگلہ میں ''ڈگ درشن'' ۱۸۱۸ء میں شائع ہوا۔ دراصل یہ اخبار فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شائع ہوتا تھا اس اخبار کے بانی ہری ہردت پرنٹر ولیم ہوپ کنگ اور ایڈیٹر لالہ سدا سکھ تھے۔ ابتداء میں یہ اخبار انگریزی پالیسی کے مطابق شائع ہوتا رہا لیکن جب راجہ رنجیت سنگھ کے خلاف ایک مضمون شائع ہوا تو ایسٹ انڈیا کمپنی اس قدر خفا ہوئی کہ اخبار سے قطع تعلق کر لیا۔ چونکہ وسائل محدود تھے اس لئے ۲۲ر جنوری ۱۸۲۸ء کو اخبار کا اردو ایڈیشن بند ہو گیا لیکن پادریوں نے اس اخبار کے ذریعہ ہندوستانیوں کو صحافت کی جانب راغب کر دیا۔

۱۸۱۸ء میں ہی بنگلہ زبان کا پہلا ہفتہ وار اخبار ''سماچار دین'' سری رامپور سے شائع ہوا۔ سرزمین مدراس سے تمل زبان میں پہلا اخبار ۱۸۳۳ء میں ''تمل میگزین'' نکلا۔ ۱۸۳۵ء میں اردو زبان میں ۳۵ اخبارات شائع ہوتے تھے۔ انیسویں صدی تک اردو کے جو اخبارات شائع ہوتے تھے وہ نصف فارسی اور نصف اردو زبان میں ہوتے لیکن ۱۸۳۶ء میں خالص اردو کا پہلا اخبار ''دہلی اردو اخبار'' جلوہ افروز ہوا جس نے کاروان صحافت کو آگے بڑھانے میں قابل قدر کردار ادا کیا۔ دراصل یہ اخبار ہفتہ وار تھا اور اس کے مالک و ایڈیٹر مولانا محمد باقر دہلوی تھے اس اخبار کی خصوصیت یہ تھی کہ خبروں کے اعتبار سے اس سے بہتر کوئی اخبار نہ تھا اخبار کا ایک حصہ ادبی صحافت کے لئے بھی مختص تھا جس میں شعراء کی تخلیقات کے علاوہ غالبؔ و ذوقؔ جیسے شعراء کی نوک جھونک اور ادبی واقعات بھی شائع ہوتے تھے۔ ''دہلی اردو اخبار'' میں علمی، ادبی اور تاریخی مضامین

Scanned with CamScanner

کو ترجیح دی جاتی تھی اس لئے یہ اخبار علمی حلقہ میں قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ اس پہلے آزاد خیال اخبار نے حب الوطنی، حریت پسندی اور بے باکی کا درس دیا۔ اخبار کے مدیر مولانا محمد باقر نے جنگ آزادی کی تحریک کی کھل کر حمایت کی جس کے پاداش میں فرنگیوں کے گولی کا نشانہ بنے اور اس طرح ۱۸۵۷ء میں یہ اخبار بھی بند ہو گیا۔

۱۸۳۷ء میں سر سید احمد خاں کے بھائی نے ''سید الاخبار'' شائع کیا۔ ریاست مدھیہ پردیش میں ''جام جہاں نما'' کے شائع ہونے کے آٹھ سال بعد ۱۸۴۰ء میں ''اخبار گوالیار'' سے اردو صحافت کا آغاز ہوا۔ جنوبی ہند سر زمین مدراس سے اردو زبان میں پہلا اخبار ۱۸۴۱ء میں سید رحمت اللہ کی ادارت میں ہفت روزہ ''اعظم الاخبار'' کا اجراء ہوا۔ ڈاکٹر عبدالحق کا کہنا ہے کہ یہ جنوبی ہند کا پہلا اخبار ہے ۱۸۴۵ء میں ماسٹر رام چندر نے ''فوائد الناظرین'' نکالا۔ ریاست اتر پردیش سے اردو کا پہلا اخبار پر فیسر سینفک نے آگرہ سے ۱۸۸۴ء میں ''سر دل اخبار'' کے نام سے جاری کیا لیکن احمد ابراہیم علوی کی تحقیق یہ ہے کہ اردو کا پہلا اخبار ''خیر خواہ ہند'' تھا جو ۱۸۳۷ء میں مرزا پور سے شائع ہوا جسکے مدیر پادری آرسی ماتھر تھے ۱۸۴۷ء میں منشی قمر الدین نے آگرہ سے ہفت روزہ ''اسد الاخبار'' جاری کیا اور بنارس سے ''بنارس اخبار''، لکھنو سے ''لکھنو اخبار'' شائع کیا اس اخبار کو لکھنو کا پہلا اخبار ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اس کے علاوہ ۱۸۴۸ء میں ''بنارس گزٹ'' کا اجراء ہوا نیز سدھا کر اخبار، باغ و بہار اور بریلی سے ''عمدۃ الاخبار'' جاری ہوئے نیز آگرہ سے ۶ / مارچ ۱۸۴۹ء میں بیک وقت ہندی اور اردو میں ''مالوہ اخبار'' شائع ہوا اسی سال ''آفتاب عالم اخبار'' مدراس سے نکلا۔ ۱۸۵۰ میں ''مخزن الاخبار'' اور ''طلسم حیرت'' (مدراس پنچ) جاری ہوا۔

اردو صحافت کے لئے سر زمین پنجاب بہت زرخیز علاقہ رہا ہے۔ ۱۸۵۰ء میں منشی ہر سکھ رائے نے فارسی زبان میں ہفت روزہ ''کوہ نور'' کا اجراء کیا۔ اسی سال گوجرانوالہ سے منشی گنڈا مل نے ۱۶ صفحات پر مشتمل اخبار ''گلزار پنجاب'' شائع کیا۔ کوہ نور کے کے اجراء کے کچھ عرصہ بعد ہی ''دریائے نور'' جاری ہوا۔ اس اخبار کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ شہر لاہور کا یہ پہلا مکمل اردو اخبار

Scanned with CamScanner

تھا۔اس اخبار کے مدیر محب الدین حسین تھے۔ چھ صفحات پر ہر اتوار کو یہ اخبار شائع ہوتا۔ ۱۸۵۱ء میں منشی سندر لال اخبار کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ اخبار میں سرکاری محکموں اور پولیس کی بدعنوانیوں کا ذکر ہوتا تھا اس لئے عوام میں تو اس اخبار کو بیحد مقبولیت حاصل تھی لیکن خواص میں نہیں چونکہ اس اخبار کو حکومت کی سرپرستی حاصل نہ تھی لہٰذا زیادہ زمانے تک جاری نہ رہ سکا۔

پنجاب میں اردو اخبارات کا مرکز شہر لدھیانہ بھی رہا ہے یہاں سے جولائی ۱۸۵۱ء میں محمد حسین خاں کی ادارت میں ''نور علی نور'' طبع ہوا۔اس کے علاوہ شہر امرتسر سے ۱۸۵۱ء میں ''باغ نور'' اور ملتان سے ''ریاض نور'' شائع ہوا اس اخبار کے ایڈیٹر منشی محمد مہدی حسن خاں تھے۔اسی سال مدراس سے ''تعلیم الاخبار'' کا اجراء ہوا۔شہر پنجاب میں لاہور کے بعد اردو اخبارات کا دوسرا مرکز سیالکوٹ تھا یہاں سے ماہ جولائی ۱۸۵۲ء میں بارہ صفحات پر مشتمل ہفتہ وار اخبار ''خورشید'' جلوہ افروز ہوا۔

سرزمین پنجاب سے پہلا پندرہ روزہ اخبار یکم جنوری ۱۸۵۳ء کو لاہور سے جاری ہوا۔ یہ اخبار ۲۸ صفحات پر مشتمل تھا سرکاری احکامات کے علاوہ علمی اور تاریخی مضامین بھی اہتمام سے شائع ہوتے تھے۔اس اخبار کے ایڈیٹر اور مالک لالہ دیوان چند تھے۔سیالکوٹ سے جون ۱۸۵۳ء میں دوسرا ہفت روزہ اخبار ''چشمۂ فیض'' کا اجراء ہوا۔خورشید اور چشمۂ فیض کو دیوان چند نے نکالا تھا۔''چشمۂ فیض'' کو تو سرکار انگلشیہ کی سرپرستی بھی حاصل تھی اس کے باوجود اخبار آزادیٔ رائے کا قائل تھا۔حکومت کی ناانصافیوں کے خلاف مضامین اور خبریں بھی شائع ہوتی تھیں۔کوہِ نور اور چشمۂ فیض میں چشمکیں بھی رہا کرتی تھیں۔''چشمۂ فیض'' اردو کا پہلا اخبار ہے جسے سنسر کیا گیا۔چونکہ یہ اخبار سیالکوٹ سے شائع ہوتا تھا اس لئے حکام کو سنسر کرنے میں دشواریاں پیش آتی تھیں لہٰذا سرکاری نوٹس کے مطابق ۱۸۵۷ء کی تحریک جنگ آزادی کے زمانے میں مطبع کو سیالکوٹ سے لاہور مجبوراً منتقل کرنا پڑا جب اکتوبر ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی ختم ہوگئی تو دوبارہ یہ اخبار سیالکوٹ سے شائع ہونے لگا۔

Scanned with CamScanner

لالہ دیوان چند کا نام اردو زبان کے ان فدائیوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی تمام تر حیات اردو اخبار نویسی کے لئے وقف کر دی تھی اس لئے انہیں سیالکوٹ کے بابائے صحافت کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ دراصل انہوں نے ہی شہر سیالکوٹ کو اردو اخبار کا مرکز بنایا تھا۔ انھوں نے متعدد اخبارات اس شہر سے نکالے جنہوں نے عوام کی بے لوث خدمت کی انھیں اخباروں میں ''وکٹوریہ پیپر'' بھی ہے۔ یہ اخبار ۱۸۵۳ء سے ۱۹۲۵ء تک جاری رہا۔

ریاست بہار ایک ایسا صوبہ ہے۔ جہاں انگریزی اور ہندی صحافت سے قبل ہی اردو صحافت کی داغ بیل پڑ چکی تھی یہاں سے اردو کا پہلا اخبار ۱۸۵۳ء میں ''نورالانوار'' جاری ہوا۔ اس اخبار کے مالک سید محمد ہاشم بلگرامی اور ایڈیٹر سید خورشید احمد تھے اس اخبار کے متعلق معلومات اختر شہنشاہی سے کچھ اس طرح فراہم ہوتی ہے۔ ''نورالانوار'' آرہ ضلع شاہ آباد محلہ پھاٹک سادات بلگرام، مالک سید محمد ہاشم بلگرامی اثنا عشریٰ مہتمم سید خورشید احمد اثنا عشریٰ اجرائے جولائی ۱۸۵۳ء'' (اختر شہنشاہی صفحہ ۲۷۵)

دہلی سے ۱۸۳۷ء سے ۱۸۵۶ء تک ''صادق الاخبار'' کے نام سے چار اخبار شائع ہوئے اس کے علاوہ ۱۸۵۴ء میں ''کریم الاخبار'' جاری ہوا۔ شہر لاہور ہیرا منڈی سے تیس صفحات پر مشتمل یکم جولائی کو ۱۸۵۴ء میں ''معلم ہند'' کا اجرا ہوا۔ پشاور سے ماہ نومبر میں ''خوش بہار'' شائع ہوا۔ ضلع گورداسپور بٹالہ سے منشی محمد بخش کے زیر اہتمام ۲۲ر دسمبر ۱۸۵۴ء میں ہی ''نیر اعظم'' جاری ہوا اور اسی سال گجرات سے ہفتہ وار اخبار ''مطلع انوار'' شائع ہوا۔ منشی دیدار بخش کی ادارت میں لاہور سے ۱۸۵۵ء میں ''لاہور گزٹ'' نکلا۔ ریاست بہار سے ''پٹنہ ہرکارا'' ۲۱ر اپریل ۱۸۵۵ء کو دوسرا اردو اخبار نکلا۔ اس اخبار کے مالک شاہ ابوتراب تھے۔ یہ اخبار مہینے میں تین مرتبہ انگریزی کی پہلی، گیارہویں اور اکیسویں تاریخ کو نکلتا تھا۔ ۱۲ صفحات پر مشتمل یہ اخبار یکم مارچ ۱۸۵۶ء تک نکلتا رہا اسی سال ریاست حیدرآباد سے اردو صحافت کا آغاز طبی رسالے سے ہوا۔

Scanned with CamScanner

سیالکوٹ سے مطبع چشمۂ فیض کے مالک لالہ دیوان چند نے ۳۰ر جنوری ۱۸۵۶ء کو ماہنامہ ''نور علی نور'' نکالا اس رسالہ میں تہذیب و اخلاق، تجارت، جغرافیہ اور علم طب وغیرہ پر مضامین ہوتے تھے اسی سال مدراس سے مظہر الاخبار اور جامع الاخبار بھی شائع ہوا۔ انیسویں صدی میں مدراس جیسے شہر سے اردو اخبارات کا جاری ہونا اردو زبان اور صحافت کی اہمیت و وقعت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

۱۸۵۶ء میں منشی محمد عظیم کے زیر اہتمام ''پنجابی اخبار'' کی اشاعت ہوئی۔ یہ اخبار سنجیدہ مذاق کا ترجمان تھا اور محکمۂ تعلیم پنجاب کی سرپرستی بھی اس اخبار کو حاصل تھی۔ اسی سال یکم ستمبر کو پٹنہ سے ''اخبار بہار'' اور یکم مئی سے ویکلی رپورٹ کی اشاعت ہوئی۔ اور اسی سال منشی نولکشور نے ''سفیر آگرہ کے نام سے اخبار جاری کیا جسے بے پناہ مقبولیت و شہرت حاصل ہوئی۔ اس کے علاوہ آٹھ صفحات پر مشتمل اخبار ''طلسم لکھنو'' کے نام سے مولوی محمد یعقوب فرنگی محلی نے ۱۵ جولائی ۱۸۵۶ء میں شائع کیا یہ اخبار قومی مفاد کو ترجیح دیتا تھا یہ اخبار ۱۸۵۷ء کی انقلاب کی ناکامی کے بعد بند ہو گیا۔ اودھ کے نواب واجد علی شاہ کا پرستار و ہمنوا اخبار ''سحر سامری ۱۷ نومبر کو جاری ہوا۔ اخبار کے مدیر گھیر نارائن عیاش اور پنڈت بیج ناتھ تھے اس اخبار نے نواب واجد علی شاہ کی معزولی کی شدید مخالفت کرتے ہوئے فرنگی حکمرانوں کی خوب خبر لی طلسم لکھنو اور سحر سامری نے اودھ کی صحافت کو راہ دکھائی۔ ماہ اپریل ۱۸۵۷ء میں سیالکوٹ سے پندرہ روزہ اخبار ''چشمۂ خورشید'' شائع ہوا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد صحافت سے مسلمان کافی عرصہ تک بے تعلق رہے۔ ۱۸۵۸ء میں اردو کے محض چھ اخبار باقی رہ گئے لیکن یہ صورتحال بہت دنوں تک برقرار نہ رہی بر عظیم کے مسلمان مایوسی، تعلیمی پستی، سیاسی اور اقتصادی بحران سے نکلے اور پھر ہر علاقے سے اخبارات شائع ہونے لگے۔ اس دور کا آغاز ''اودھ اخبار'' سے ہوتا ہے۔ منشی نولکشور نے ریاست اتر پردیش لکھنؤ سے ۱۸۵۸ء میں اخبار جاری کیا ''اودھ اخبار''۔ ابتداء میں میں ہفتہ وار چھپا چودہ سال تک ہفتہ وار رہنے کے بعد ہفتے میں دوبار پھر تین بار اور ۱۸۷۶ء میں ہر دوسرے روز نکلنے لگا بالآخر

Scanned with CamScanner

۱۸۷۷ء میں روزنامہ ہوگیا اخبار کی ضخامت چار صفحے سے اڑتالیس صفحات تک تھی یہ اخبار غیر فرقہ وارانہ اخبار تھا اس عہد کے بڑے بڑے ادیب، دانشور اور انشاء پرداز اخبار سے وابستہ تھے اسی اخبار میں ۱۸۷۸ء سے دسمبر ۱۸۷۹ء تک ''فسانۂ آزاد'' کے توسط سے خوجی جیسا کردار عطا کیا جس کے ذریعے لکھنؤ کی مٹتی ہوئی تہذیب سے بھرپور واقفیت ہوتی ہے۔'' (ریحان حسن، ادبی مطالعے، مطبوعہ آئی کن پبلیشرس ۲۰۱۴ء صفحہ ۱۳۱)

''اودھ اخبار'' انگریزوں کا مخالف تو نہیں تھا لیکن موقع پڑنے پر حکومت وقت کے خلاف بے باکی سے اظہار خیال کرتا تھا۔ دراصل یہ اخبار اصلاح معاشرہ کا علمبردار تھا اسی عہد میں اینگلو انڈین صحافت نے مسلمانوں کے خلاف مہم چلا رکھی تھی ایسے حالات میں کسی مسلمان اخبار کو مقابلہ کرنے کی تاب نہ تھی ان حالات میں سرسید احمد خاں اور کچھ دوسرے افراد نے ملت کو خواب غفلت سے بیدار کیا۔

۱۸۵۸ء اردو صحافت کے لئے نا قابل فراموش سال ہے اس لئے کہ اسی سال اردو کا پہلا روزنامہ ''اردو گائیڈ'' مولوی کبیر الدین احمد کی ادارت میں شائع ہوا۔ یہ اخبار پہلے مظہر العجائب کلکتہ سے شائع ہوتا تھا بعدہ اس کا اپنا پریس بھی قائم ہوگیا۔ غدر کے بعد بہار سے شائع ہونے والا پہلا اخبار ''عظیم الاخبار'' ہے جو جولائی ۱۸۵۹ء میں پٹنہ سے نکلا یہ اخبار ہفتہ وار تھا۔ اسی سال آگرہ سے کندن لال کی ادارت میں ماہنامہ ''تاریخ بغاوت ہند'' شائع ہوا۔ سجن لال کا کہنا ہے کہ غدر کے بعد ۱۸۶۰ء میں حیدرآباد سے نکلنے والا ''آفتاب دکن'' حیدرآباد کا پہلا اخبار ہے (Vistas of Modren Indian History) اس اخبار کے مالک و مدیر قاضی محمد قطب تھے۔ کلکتہ سے اسی سال ''رفیق الہند'' کا بھی اجرا ہوا۔ اردو اخبار کی مناسبت سے اسی سال گنگا پرشاد ورما کی ادارت میں ''اودھ گزٹ'' شائع کیا گیا۔

انیسویں صدی کے رسائل میں انجمن اسلامی، گلزار جہاں اور مخزن الادویہ کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ ماہنامہ ''انجمن اسلام'' جنوری ۱۸۶۳ء میں کلکتہ سے شائع ہوا۔ دراصل یہ

Scanned with CamScanner

رسالہ انجمن اسلام کے ترجمان ہونے کے ساتھ ساتھ سرسید احمد خاں کی تحریک کا موید بھی تھا۔اس رسالہ کو ہندوستان میں مسلمانوں کی تحریک نو کا پہلا رسالہ ہونے کا اعزاز بھی حاصل تھا۔

۱۸۶۵ء میں کلکتہ سے ''سلطانی'' کا اجرا ہوا ۱۸۶۶ء میں ساسائنٹیفک سوسائٹی کا ترجمان ''سائنٹیفک سوسائٹی'' کا آغاز ہوا جس نے اردو صحافت کی ترویج واشاعت میں نمایاں کارنامہ انجام دیا۔اخبار نے اردو زبان وادب،قوم وملک اور اردو صحافت پر گہرے نقوش ثبت کیے۔اس اخبار نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد آزادئ صحافت کا نعرہ بھی بلند کیا اور حکومت کی غلطیوں کی نشاندہی بھی کی۔ اور ۱۸۶۷ء میں مولوی محمد حسین نے ''رتن پرکاش'' رتلام سے شائع کیا ۔اسی سال صفیر بلگرامی اور سخن دہلوی کی ادارت میں آرہ سے سہ ماہی ''منیر الفوائد'' نکلا نیز ۱۸۶۸ء میں کلکتہ سے ''دہ زمین'' جلوہ افروز ہوا۔

سرسید تحریک سے متعلق مظفر پور سے ''اخبار الاخبار'' کا اجرا ہوا اس کے علاوہ مظفر پور سے ۱۵ر ستمبر ۱۸۶۸ء میں ۱۶ صفحات پر مشتمل پندرہ روزہ ''مطبع چشمہ نور'' شائع ہوا اس اخبار کے مدیر بابو اجودھیا پرشاد منیری تھے۔یکم جنوری ۱۸۶۹ء میں منشی سورج مل کی ادارت میں پٹنہ سے ''چشمہ علم کا اجرا ہوا۔۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء میں علی گڑھ سے رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' کا اجراء ہوا جس کا مقصد اخبار میں یوں درج تھا ''مسلمانان ہند کو کامل درجہ کی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے گا تا کہ ان کا شمار دنیا کی معزز اور مہذب قوموں میں ہو۔'' (اردو صحافت نمبر، نیا دور لکھنو جون۔جولائی ۲۰۱۲ء، صفحہ ۷۷)

رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' ماہ میں ایک بار یا دو بار اور کبھی کبھی تین بار شائع ہوتا تھا رسالہ میں خبروں کو ترجیح نہ دی جاتی تھی بلکہ مسلمانوں کی تعلیم اور معاشی، سماجی، مذہبی تعلیم اور دینی مسائل کو ترجیح دیا جاتا تھا۔بلاشبہ اس رسالے نے صحافت کا اعلیٰ معیار پیش کرتے ہوئے اردو نثر کے دامن کو وسیع کیا۔یکم ستمبر ۱۸۷۰ء سے دسمبر ۱۸۷۰ء میں منشی قربان علی خاں اخبار کے ایڈیٹر رہے۔

Scanned with CamScanner

۲۴ر مارچ ۱۸۷۱ء میں ریاست مدھیہ پردیش سے خالص اردو زبان کا پہلا اخبار حکیم اصغر حسین اخگر فرخ آبادی کی ادارت میں ''عمدۃ الاخبار'' شائع ہوا۔ ۱۸۷۵ء میں کھجوہ ضلع سارن (سیوان) سے ''اصلاح'' جلوہ افروز ہوا۔ ۱۸۷۱ء میں گیا سے ''گلدستہ نظائر اور مظفر پور سے ''شعاع مہر'' کی اشاعت ہوئی اسی سال ریاض خیرآبادی نے گورکھپور سے ''ریاض الاخبار'' شائع کر کے گورکھپور میں اردو صحافت کی داغ بیل ڈالی۔ ۱۸۷۲ء میں ''ریاض الاخبار'' ریاض خیرآبادی نے جاری کیا اور پٹنہ سے بابو گرو پرشاد سین نے انگریزی میں ''بہار ہیرالڈ'' (BIHAR HIRALD) شائع کیا اس اخبار کے دو سال بعد ہندی اخبار ''بہار بندھو'' پٹنہ سے نکلا۔ یہ اخبار دو سال قبل کلکتہ سے پنڈت کیشو رام بھٹ کی ادارت میں شائع ہوا تھا بعد میں وہ پٹنہ آئے اسی سال مونگیر سے ''نادر الاخبار'' کا اجراء ہوا۔ ۱۸۷۳ء میں آرہ سے ''ضیاء الاخبار'' اور ۱۸۷۴ء میں صفیر بلگرامی کی ادارت میں اس کا ضمیمہ اور اسی سال پٹنہ سے شاد عظیم آبادی کی ادارت میں ''ہفتہ وار نسیم سحر'' شائع ہوا۔ ریاست جموں و کشمیر سے ۱۸۷۶ء میں منشی ہرمکھ رائے نے سرینگر سے ہفت روزہ ''تحفۂ کشمیر'' کا اجراء کیا۔ رشید تاثیر کی تحقیق کے مطابق وادیٔ کشمیر کا یہ پہلا اخبار ہے۔

(نقوشِ صحافت، رشید تاثیر، صفحہ ۴۷)

ریاست مدھیہ پردیش میں شہر بھوپال اردو صحافت کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ گارساں د تاسی کی اطلاع کے مطابق ۱۸۷۶ء میں بھوپال سے ''اختر ہند'' افق صحافت پر طلوع ہوا۔ اسی سال لکھنؤ کے محلّہ نوبستہ سے ماہانہ رسالہ ۲۴ر جولائی کو سولہ صفحات پر مشتمل ''گلدستۂ سخن'' شائع ہوا اس رسالہ کے مالک لالہ پورن چند سیٹھ لالہ رام سہائے تمنا تھے۔ محلّہ نوبستہ سے اسی سن میں ہفتہ روز ''تمنائی اخبار'' کا بھی اجرا ہوجسکے مدیر رام سہائے تمنا تھے۔ منشی سجاد حسین کا کوروی کی ادارت میں ۱۶ جنوری ۱۸۷۷ء کو ''اودھ پنچ'' منظر عام پر آیا جو عوام دوست اور انگریز دشمن اخبار تھا اخبار نے بڑی بے باکی اور دانشمندی کے ساتھ ایسی راہ نکالی کہ ''سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے''

Scanned with CamScanner

اخبار نے طنزیہ انداز میں انگریزوں کی ملک دشمن پالیسی کا پردہ فاش کیا اس اخبار کی عوامی مقبولیت کا یہ اثر تھا کہ اس کی اتباع میں کم و بیش پینتالیس (۴۵) اخبارات شائع ہوئے اخبار کی انقلابی خدمات کا ذکر ڈاکٹر وزیر آغا نے کچھ یوں کہا ہے۔

''انیسویں صدی کے آخر میں سیاسی ہنگاموں نے دو بڑے ہنگاموں کی صورت میں ظہور پایا۔ پہلا ہنگامہ ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی، دوسرا ہنگامہ ''اودھ پنچ'' یہاں جنگ آزادی قلم سے لڑی گئی۔'' (دوماہی شیرازہ سرینگر، نومبر ۱۹۶۳ء بحوالہ ماہنامہ شاہراہ [طنز و مزاح نمبر، صفحہ ۲۳۲])

اودھ پنچ میں خبروں کے ساتھ ساتھ عوامی مسائل پر رائے کا اظہار بھی ہوتا تھا۔ سیاسی طور پر یہ اخبار کانگریس کا حامی تھا۔ اس اخبار نے سرسید تحریک کی بھرپور مخالفت کی تعلیم نسواں اور بے پردگی کی مخالفت کی اخبار کے قلم کاروں میں منشی سجاد حسین، مرزا مچھو بیگ عاشق، تربھون ناتھ ہجر، پنڈت جوالا پرشاد برق اور اکبر الہ آباد جیسی نابغۂ روزگار شخصیتیں تھیں۔

جنگ آزادی کے بعد صوبۂ پنجاب سے بیشمار اردو اخبارات شائع ہوئے جن میں بیشتر اخبار تو لاہور سے بھی شائع ہوتے تھے اس لئے کہ پنجاب میں اس شہر کو دارالخلافہ کی حیثیت حاصل تھی۔ لیکن صوبۂ پنجاب میں شہر لاہور کے علاوہ دوسرے شہروں سے بھی بیشمار اردو اخبارات نکلے جن میں لالہ نرائن داس وکیل کی ادارت میں ہوشیار پور سے پندرہ روزہ اخبار ''اتالیق زمینداراں'' یکم اپریل ۱۸۷۷ء میں جاری ہوا۔ یہ پہلا اخبار تھا جس میں زمینداروں سے متعلق مضامین باقاعدگی سے شائع ہوتے تھے۔ شہر لاہور سے یکم جون ۱۸۷۷ء میں ہفتہ وار اخبار ''خورشید عالم'' شائع ہوا جس کے مالک منشی جگن ناتھ اور مہتمم منشی برج لال تھے۔ کلکتہ سے ۱۸۷۷ء میں ہی ''القوانین'' شائع ہوا اسی سال صوبہ مدھیہ پردیش کھنڈوہ سے ''ریلوے سماچار'' کا اجراء ہوا اسی سنہ میں حیدرآباد سے ''خورشید دکن'' شائع ہوا مرزا کاظم غازی کی ادارت میں ۱۸۷۸ء میں اس کی اشاعت بند ہوئی۔ بدر شکیب نے اس اخبار کو حیدرآباد کا پہلا اخبار قرار دیا ہے اور الہ آباد سے قیصر الاخبار، کا اجراء ہوا اس اخبار میں انگریز حکمرانوں پر طنزیہ انداز میں تبصرہ ہوتا

Scanned with CamScanner

تھا۔

صوبۂ پنجاب میں پروقار اردو صحافت کو فروغ دینے والوں میں پادری رجب علی کا شمار سرفہرست ہے۔ پادری رجب علی نے اپنی ادارت میں سولہ صفحات پر مشتمل ہفتہ وار اخبار ''سفیر ہند'' یکم جنوری کو ۱۸۷۸ء میں امرتسر سے شائع کیا۔ اور محمد کبیرالدین نے الہ آباد سے ۶۔ جنوری کو ''احسن الاخبار'' جاری کیا۔ چھپرہ سے ''نسیم سارن'' اور گیا سے ''مجموعہ نظائر'' کی اشاعت ہوئی اسی سال شہر امرتسر سے لالہ بشن دت رام نے ''مجلس اخلاقیہ'' شائع کیا۔ جس میں اخلاقی مضامین کو ترجیح دی جاتی تھی۔

انیسویں صدی میں سرزمین پنجاب پر اردو صحافت کی تاریخ میں ''انجمن پنجاب'' پہلا اخبار ہے جس نے اخبار بینی کا شوق عوام میں پیدا کیا اس اخبار کی اشاعت ایک ہزار چھ سو گیارہ تھی اس کے ایڈیٹر پنڈت ایودھیا پرشاد تھے بعدہ مولانا محمد حسین آزاد ایڈیٹر ہوئے۔ شہر لاہور سے آٹھ صفحات پر مشتمل ہفت روزہ اخبار ''اخباروں کا قبلہ گاہ'' ۱۸۷۸ء میں جاری ہوا اس اخبار کا ضمیمہ ''پنجاب پنچ'' کے نام سے بھی شائع ہوتا تھا اخبار کے بانی مولوی فتح دین بسمل ایڈیٹر مولوی نہال دین اور مہتمم دیوان بھگوان داس تھے۔

ریاست حیدرآباد سے بیشمار اخبارات نکلے لیکن پہلا اخبار ہونے کا اعزاز کس اخبار کو حاصل ہے اس سلسلے میں اختلافات ہیں ڈاکٹر طاہر مسعود نے ۱۸۷۸ء میں حیدرآباد دکن سے نکلنے والے اخبار ''آصف الاخبار'' کو پہلا اخبار ہونے کا اعزاز دیا ہے (ڈاکٹر طاہر مسعود، اردو صحافت انیسویں صدی میں، ۲۰۰۹ء، صفحہ ۸۴۲) اس اخبار کے مالک و مدیر نارائن راؤ تھے۔

۱۸۷۹ء میں سیالکوٹ سے ماہنامہ ''خضر ہند'' کی اشاعت ہوئی جس کے مالک لالہ دیوان چند اور مہتمم لالہ ہزاری لال تھے۔ اسی سال بارہ صفحات پر مشتمل ماہنامہ ''آئینۂ آئین ہند'' شائع ہوا جس کی ادارت کے فرائض مولوی فاخر حسین نے انجام دی اور مہتمم منشی برج لال تھے۔ اس ماہنامہ کی خصوصیت یہ تھی کہ قانونی مضامین کثرت سے شائع ہوتے تھے۔ اسی سال برکت علی

Scanned with CamScanner

شوکت کی ادارت میں سولہ صفحات پر مشتمل دھرم پرداینی سبھا کپور نے ہفتہ وار اخبار ''سبھا'' شائع کیا اس اخبار کے سرپرست متھرا داس اور مہتمم بابو پوہلومل تھے۔ اسی سال ریاست مدھیہ پردیش سے مولانا امجد علی اشہری نے ''والا جاہی'' کا اجراء کیا۔

لاہور سے ایک سو دس صفحات پر مشتمل ۱۸۸۰ء میں قانونی ماہنامہ ''نظائر قانون ہند'' شائع ہوا جس کے مالک منشی ہرسکھ رائے مہتمم لالہ جگت نارائن اور مترجم سید جواد علی شاہ تھے۔ لاہور سے ہی اسی سال سید ابوالحسن کی ادارت میں چالیس صفحات پر مشتمل پندرہ روزہ اخبار ''خزینۃ القوانین'' کی اشاعت ہوئی۔ اس کے علاوہ ہیرا منڈی لاہور سے بارہ صفحات پر مشتمل منشی حسین علی فرحت دہلوی نے ''دہلی منچ'' کا اجراء کیا جس میں ظریفانہ مضامین کو اولیت حاصل ہوتی تھی۔ اسی سال کلکتہ سے ''گوہر'' کی اشاعت ہوئی۔ اس کے علاوہ ریاست حیدرآباد سے سید حسن رضوی کی ادارت میں ''شفق'' اور حاجی فرقان کی ادارت میں ''شوکت الاسلام'' جاری ہوا۔ نیز بہار سے ''مشیر بہار'' آب وتاب کے ساتھ شائع ہوا۔

انیسویں صدی کے اخبارات میں ایک اہم اخبار متھرا پرشاد اختر کی ادارت میں نکلنے والا اخبار ''دارالسلطنت'' تھا۔ یہ اخبار ۴ رمئی ۱۸۸۱ء میں جاری ہوا۔ ۱۸۷۱ء میں اخبار کے مالک شیخ احسان اللہ عرف بادشاہ سوداگر دہلوی سے مولوی عبدالکریم کے والد محمد نادر نے خرید لیا تو اس اخبار کے ایڈیٹر مولوی عبدالکریم ہوگئے۔ یہ اخبار کسی خاص فرقے کا طرفدار نہ تھا بلکہ ملک اور قوم کی وکالت اس کا طرۂ امتیاز تھا یہ اخبار انگریزی اخباروں کے طریقے پر چلنے کی کوشش کرتا تھا۔ اسی سال منشی سلطان علی صولت کے زیر اہتمام آٹھ صفحات پر مشتمل اخبار ''آفتاب ہند'' جالندھر سے شائع ہوا اس کے علاوہ مدھیہ پردیش سے امجد علی اشہری کی ادارت میں ''دبیر الملک'' جاری ہوا نیز پٹنہ سے سہ روزہ ''انڈین کرانیکل'' کا اجرا ہوا۔

انیسویں صدی میں ''گلدستہ نتیجۂ سخن'' کو ہندوستان گیر شہرت حاصل ہوئی۔ گلدستہ نتیجۂ سخن یکم فروری ۱۸۸۲ء میں شائع ہوا اس کے مالک ومدیر محمد وزیر علی وزیر تھے۔ اسی سال لالہ تھورام

Scanned with CamScanner

کی ادارت میں برہم سماج کی طرف سے ہفتہ وار اخبار ''ریفارمر'' لاہور سے جاری ہوا۔ اس کے علاوہ اٹاوہ سے مولوی بشیر الدین احمد نے ''نجم الاخبار'' جاری کیا نیز انھوں نے انقلابی اخبار ''البشیر'' بھی شائع کیا جس میں حصول آزادی سے متعلق مضامین اور خبروں کی اشاعت کو ترجیح دی جاتی تھی نیز گورکھپور سے اسی سال ''فتنہ'' جاری ہوا۔

انیسویں صدی میں ریاست جموں و کشمیر سے مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد میں اردو صحافت کا آغاز ''بدیابلاس'' نامی سرکاری گزٹ سے ہوتا ہے جیسا کہ محمد یوسف ٹینگ رقمطراز ہیں:

''ریاست میں اردو کا پہلا اخبار ''بدیابلاس'' ۱۸۸۲ء میں شائع ہوا۔'' (ریاست میں اردو ادب، محمد یوسف ٹینگ ''بازیافت'' ۱۹۸۴ء صفحہ ۵۱)

''بدیابلاس'' کے پہلے مدیر پنڈت گوپی ناتھ گرٹو تھے۔ ڈاکٹر ظفر حیدری کا کہنا ہے کہ ''ریاست کا پہلا اخبار بدیابلاس مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد میں ۱۸۶۷ء میں اجراء ہوا (نیا دور، اردو صحافت نمبر، جون جولائی، ۲۰۱۱ء، صفحہ ۱۵۷)۔ اس اخبار کی اشاعت کے بعد ریاست میں اخبار کی ضرورت تو شدت سے محسوس کی جارہی تھی لیکن کسی شخص کو اخبار نکالنے کی اجازت نہ تھی اگر کوئی یہ جرأت کرتا تو جلاوطنی کا سامنا کرنا پڑتا یا جائیداد ضبط کرلی جاتی نتیجتاً ریاست کے باہر کشمیریوں نے اخبارات و رسائل نکالے اور انیسویں صدی میں تاریخ صحافت میں اہم نام رقم کرایا۔ ریاست جموں و کشمیر میں باقاعدہ صحافت کا آغاز بیسویں صدی میں ۱۹۲۴ء میں ''رنبیر'' سے ہوتا ہے۔ یکم جنوری ۱۸۸۲ء میں سید عبدالبصیر حضور بلگرامی کی ادارت میں لکھنو سے ''روزنامچہ لکھنو'' شائع ہوا اور بہار شریف سے ہفتہ وار ''شرف الاخبار'' کا اجراء ہوا۔ اسی سال یکم ستمبر کو محلہ نوبستہ سے ہفتہ وار ''مہر ظرافت''، مطبع تمنائی سے شائع ہوا یہ اخبار آٹھ صفحات پر مشتمل تھا مالک رام پورن چندر زرّہ اور ایڈیٹر لالہ رام سہائے تمنا تھے

ریاست حیدرآباد سے نکلنے والے اخبار ''ہزار داستان'' کو ڈاکٹر ممتاز مہدی (ڈاکٹر ممتاز مہدی، حیدرآباد کے اردو روزناموں کی ادبی خدمات ۱۹۹۸ء، صفحہ ۶۳) اور بدر شکیب (بدر

Scanned with CamScanner

شکیب، اردو صحافت ۱۹۵۲ء، صفحہ ۱۷۴) نے حیدرآباد کا پہلا روزنامہ قرار دیا ہے اس اخبار کی اشاعت کی تاریخ ۱۸۸۳ء ہے۔

لاہور سے ۱۸۸۳ء میں ہی بتیس صفحات پر محیط رسالہ ''آئینہ ہند'' جاری ہوا۔ اس کے علاوہ سید مٹھا بازار لاہور سے اسی سال لالہ زکی رام خلف لالہ میاں داس کی ادارت میں ''کلید قوانین'' کی اشاعت عمل میں آئی جس میں عدالتوں کے فیصلے شائع ہوتے تھے۔ اسی سال ستیہ نند اگنی ہوتری کی ادارت میں آٹھ صفحات پر مشتمل پندرہ روزہ اخبار ''دھرم جیون'' محلہ بھدر کالی لاہور سے شائع ہوا۔ دراصل یہ اخبار راجہ رام موہن رائے کے افکار و نظریات کا ترجمان تھا۔ اسی سنہ میں بھروچیاں برادری کا ترجمان ماہنامہ ''سکھدائیک سبھا'' راولپنڈی سے جاری ہوا۔ اسی سال کپورتھلہ سے حکیم عاشق کی ادارت میں ماہنامہ ''جامع مسائل علم طب'' شائع ہوا اس کے علاوہ سید مٹھا بازار لاہور سے آٹھ صفحات پر مشتمل ہفتہ وار اخبار ''دیش اُپکاک'' کا اجراء ہوا جس میں اصلاحی اور مذہبی مضامین کو ترجیح دی جاتی تھی۔ حضرت ریاض خیرآبادی نے خیرآباد سے ''ریاض الاخبار'' شائع کیا اس کے علاوہ انھوں نے تار برقی ماہنامہ ''گلدستہ ریاض'' اور ۸ جولائی ۱۸۸۳ء میں گورکھپور سے ماہنامہ ''فتنہ اور عطر فتنہ'' شائع کیا۔ اسی سال مولوی احمد حسن شوکت نے میرٹھ سے ''خم خانہ ہند'' کا اجراء کیا جس میں مسلمانوں کو کانگریس میں شامل ہونے کی دعوت دی جاتی تھی۔

شہر لاہور سے علمی، ادبی اور اصلاحی مضامین پر مشتمل ہفتہ وار اخبار ''رفیق ہند'' ۵ر جنوری ۱۸۸۴ء میں جلوہ افروز ہوا۔ اسی سنہ میں حکیم جعفر علی بیمار کی ادارت میں پندرہ روزہ اخبار ''مہذب'' کپورتھلہ سے طلوع ہوا۔ یہ اخبار خالص طور پر اخلاقی تھا۔ اسی سال گئوؤں کی حفاظت کی خاطر بجواڑہ ضلع ہوشیار پور سے ہفتہ وار اخبار ''گئو رکھشا'' کا اجراء ہوا۔ اسی سال آنریری مجسٹریٹ راجہ رائے سنگھ نے رسالہ ''ہندوستان'' لندن سے جاری کیا یہ رسالہ اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں ایک ساتھ جاری ہوتا تھا اخبار کا مقصد یہ تھا کہ انگلستان کے انگریزوں کو ان کے مظالم

Scanned with CamScanner

سے باخبر کیا جائے۔

۳۱ر جنوری ۱۸۸۴ء میں ہی مرزا عبداللہ کی ادارت میں سولہ صفحات پر مشتمل ماہنامہ ''انجمن رفاہ عام'' لدھیانہ سے شائع ہوا چونکہ شہر لدھیانہ دری اور قالین سازی کا مرکز تھا اس لئے اس ماہنامہ میں دری و قالین اور حرفت وصنعت سے متعلق مضامین کو ترجیح دی جاتی تھی۔ اسی سال پنڈت شِو ناتھ کی ادارت میں چھتیس صفحات پر مشتمل ماہنامہ ''راوئ بے نظر'' مچھی ہٹہ لاہور سے جاری ہوا جس میں عظیم شخصیتوں کے کوائف وحالات اہتمام کے ساتھ شائع کئے جاتے تھے۔ نیز سکھوں سے متعلق بھائی فتح سنگھ کی ادارت میں ملتان سے ہفتہ وار اخبار ''خالصہ پنجاب'' کا اجراء ہوا۔ اس کے علاوہ بہار سے ''مہر سوز'' کی اشاعت عمل میں آئی۔ اسی سنہ میں یکم اکتوبر کو سالگ رام کول کی ادارت میں ''کوچہ مصر بیلی'' رام لاہور سے ''خیر خواہ کشمیر'' ظہور پذیر ہوا۔ اس کے علاوہ یکم اکتوبر کو آٹھ صفحات پر مشتمل ''نسیم صبح'' ہیرا منڈی لاہور سے شائع ہوا۔ اس اخبار کے مدیر منشی سیف الحق ادیب تھے۔ یکم نومبر کو اسی سال راولپنڈی سے ''تاج الاخبار'' کا اجراء ہوا جس کے ایڈیٹر منشی رام بہار خلیق تھے۔ اسی سنہ میں ہیرا منڈی لاہور سے سیف الحق ادیب کی ادارت میں ''شفیق ہند'' کی اشاعت عمل میں آئی اس اخبار کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ہر شام کو ''شامِ وصال'' کے نام سے ضمیمہ بھی چھپتا تھا۔

انیسویں صدی میں ملک گیر شہرت حاصل کرنے والے رسالوں میں ''نور بصیرت'' کا بھی نام نامی ہے۔ رسالہ کا پہلا شمارہ جولائی ۱۸۸۴ء میں کلکتہ سے شائع ہوا رسالہ کے مدیر مولوی سید محمد عبدالغفور شہباز تھے۔ اس رسالہ کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ صرف نثر میں شائع ہونے والا یہ پہلا رسالہ ہے اس سے قبل اردو میں عموماً گلدستے شائع ہوا کرتے تھے جن میں شعراء کے کلام ہوتے لیکن ''نورِ بصیرت'' ایک ایسا رسالہ تھا جو مکمل طور پر نثر میں ہوتا۔ اسی سال محلّہ صدری دروازہ سیالکوٹ سے ہفتہ وار اخبار ''وزیر ہند'' نکلتا تھا یہ اخبار سولہ صفحات پر محیط تھا اور اخبار کے مالک مرزا موحد جالندھری تھے اس کے علاوہ عیسائیوں کے ہفوات واعتراضات کا جواب دینے کے لئے

Scanned with CamScanner

ماہنامہ ''انجمن حمایت اسلام'' کا اجراء عمل میں آیا۔ اسی سال کلکتہ سے ''مخزن الادویہ'' جاری ہوا جس میں دیسی ادویات وعلاج کے علاوہ ہندوستان وایران کے قدیم نسخے شائع ہوتے تھے جو حکمت کے شائقین کے لئے خاصہ کی چیز ہوا کرتا تھا۔ رسالہ کے مدیر آقائی احمد شیرازی ایرانی تھے۔ اس کے علاوہ نورالاخبار رہنمائے بنگال اور وطن بھی شائع ہوا۔

ریاست حیدرآباد سے ۱۸۸۴ء میں ہی ''پیک آصفی'' شائع ہوا جسے بعض محققین نے ریاست حیدرآباد کا پہلا اخبار ہونے کا اعزاز دیا ہے۔ اخبار کے متعلق مولانا امداد صابری رقمطراز ہیں:

''حیدرآباد محلہ دارالشفا قریب حمام باولی سے یکم جنوری ۱۸۸۴ء کو چار صفحات پر یہ روزنامہ اخبار شائع ہوا۔ مالک مولوی سید احمد زید بلگرامی تھے۔''

(مولانا امداد صابری، تاریخ صحافت اردو، جلد دوم، صفحہ ۳۲۹)

روزنامہ ''پیک آصفی'' ہزار داستان (۱۸۸۳ء) کے روزنامہ بننے سے ایک سال قبل بطور روزنامہ جاری ہو چکا تھا لہذا ''پیک آصفی'' کو حیدرآباد کا پہلا روزنامہ کہا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ اسی سال محب حسین نے ''معلم شفیق'' جاری کیا۔ شہر رتلام سے مولوی سید قادری شوق کی ادارت میں یکم جنوری ۱۸۸۵ء کو ماہنامہ ''گلدستہ'' شائع ہوا۔ اسی سال ۵/جنوری کو صوبۂ پنجاب میں جہلم سے ہفتہ وار اخبار ''غم خوار ہند'' جلوہ افروز ہوا نیز منشی رام سنگھ کی ادارت میں سولہ صفحات پر مشتمل ہفتہ وار اخبار ''آفتاب عالمتاب'' طلوع ہوا۔

انیسویں صدی کی تاریخ صحافت میں ایک اہم نام منشی محمد عبدالرحیم شاہ آبدؔ کا ہے جنہوں نے کلکتہ سے ۲۶/اپریل ۱۸۸۵ء میں روزنامہ پیک صبا اور بہار ہند شائع کیا۔ بہار ہند اور پیک صبا کے مالک عمر محمد ناخدا تھے اور ہفتہ وار ''جام جہاں نما'' کے مالک منشی غلام حسین تھے لیکن ان تمام اخبارات کے ایڈیٹر محمد عبدالرحیم شاہ آبدؔ ہی تھے۔

۱۵/اگست ۱۸۸۵ء میں پنڈت جگ موہن ناتھ شوقؔ کی ادارت مین ماہنامہ ''نالہ دل

Scanned with CamScanner

سوز'' جلوہ افروز ہوا۔ اس کے علاوہ حسن بن عبداللہ عمادنواز جنگ کی ادارت میں ''حسن'' کا اجراء ہوا اس ماہنامہ میں شائع ہونے والے معیاری مضامین پر، مضمون نگار کو ایک اشرفی عطا کی جاتی تھی۔ انیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں بھوپال سے ہفت روزہ سفیر عالم، ماہنامہ سرمایہ فراست، ماہنامہ جریدۂ انتظامیہ، جاورہ سے احتشام الاخبار، رتلام سے ماہنامہ گلشن داغ، اندور سے معلم تجارت جبل پور سے تبلیغ ہفت روزہ، پندرہ روزہ مظفری، ماہنامہ گل رعنا، سہ ماہی گلبن، بھوپال سے پندرہ روزہ ہلال اور پندرہ روزہ ''الریاض'' ظہور پذیر ہوئے۔ اس کے علاوہ ۱۴ جولائی کو اسی سال بہار شریف سے ''صدق و بوقلمون صدق'' اور سارن سے ''گلدستہ سارن'' پٹنہ سے نوائے عشق'' اور ''اخبار پنچ'' شائع ہوا۔ یکم جنوری ۱۸۸۵ء میں گورکھپور سے نکلنے والے اخبار 'فتنہ' اور 'عطر فتنہ' کے فتنہ میں نثری مضامین اور عطر فتنہ میں نظمیں، غزلیں اور رسائل سے ماخوذ مواد شائع کئے جاتے تھے۔

مارچ ۱۸۸۵ء میں اپنی نوعیت کا منفرد رسالہ امیر علی کی ادارت میں کلکتہ سے ماہنامہ ''گلزار جہاں'' شائع ہوا اسے اردو زبان میں پہلا اسپورٹس رسالہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اسی سال کلکتہ سے حب الوطن، خیر خواہ خلائق، علیم الاخبار اور فلک جاری ہوئے۔ اس کے علاوہ لکھنو سے عاشق علی عاشق کی ادارت میں ''اختر اودھ'' جاری ہوا۔ نیز مشہور شاعر امیر مینائی کی سرپرستی میں یکم فروری کو رسالہ ''دامن گلچیں'' محلہ کٹرہ ابوتراب خان لکھنو سے شائع ہوا۔

یکم جنوری ۱۸۸۶ء میں پنڈت راج ناتھ نے ملتان سے ہفت روزہ ''دانش ہند'' شائع کیا۔ اس کے علاوہ ہال بازار امرتسر سے محمد حسین نے آٹھ صفحات پر مشتمل ''ریاض ہند'' نکالا۔ نیز منشی محبوب عالم کے زیر اہتمام ماہانہ رسالہ ''زمیندار'' وزیر آباد گوجرانوالہ سے جلوہ افروز ہوا۔ اسی سال مارچ میں انارکلی لاہور سے ہفتہ وار اخبار ''اپریل پیپر'' شائع ہوا۔ اس اخبار میں انگریزی ناولوں کے تراجم کثرت سے شائع ہوتے تھے۔ اخبار کے مہتمم سید رحمت علی شاہ تھے۔ اس کے علاوہ ۱۵ اپریل کو شملہ حال ہماچل پردیش سے منشی عبدالقادر نائب کے زیر ادارت بتیس صفحات پر

Scanned with CamScanner

مشتمل ماہانہ گلدستہ ''غنچۂ مراد'' کا اجراء ہوا۔ ماہ مئی میں راولپنڈی سے گورو سنگھ سبھا کا ترجمان ''سری گورست پرکاش'' ظہور پذیر ہوا۔ اسی سال سردار پرتاپ سنگھ کی ادارت میں آٹھ صفحات پر مشتمل ہفتہ وار اخبار ''پنجاب سماچار'' اونا ہماچل پردیش سے جاری ہوا جو مطبع قیصری جالندھر سے چھپتا تھا۔ نیز پٹنہ سے ''انسٹی چیوٹ'' اور آرہ سے ''اسٹار آف انڈیا'' آفتاب عالم اور عالم آرا کا اجراء ہوا۔

علمی، ادبی اور تاریخی دنیا میں دستاویزی حیثیت کا حامل مجلّہ پادری رجب علی کی ادارت میں یکم جنوری ۱۸۸۷ء کو امرتسر سے ''پنجاب ریویو'' شائع ہوا یہ جریدہ ۱۵۶ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ رسالہ کو امریکی مشنری کی سرپرستی بھی حاصل تھی۔ اسی سال ماہِ فروری میں محکمہ تعلیم پنجاب سے ''سکول ماسٹر'' وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ سے جاری ہوا اس کے علاوہ یکم مارچ کو لالہ دیوی دیال کی ادارت میں آٹھ صفحات پر مشتمل ہفتہ وار اخبار ''فیض عام'' ٹاؤن ہال امرتسر سے شائع ہوا۔ نیز ۹ر اپریل کو ہرگوپال دتاتریہ نے گمٹی بازار لاہور سے ہفتہ وار اخبار ''راوی'' جاری کیا۔ اس کے علاوہ پٹنہ سے ہفتہ وار ''انیس'' کی اشاعت عمل میں آئی۔ حیدرآباد سے نکلنے والے روزنامہ ''پیک آصفی'' کے لئے احتمال ہے کہ ۱۸۸۷ء میں ہی شائع ہوا۔ لیکن انیسویں صدی کی تاریخ صحافت میں جو مقبولیت اور شہرت ''پیسہ اخبار'' کے حصہ میں آئی وہ کسی اور کو کم ہی نصیب ہوئی۔ یہ اخبار ابتدا میں ۱۸۸۷ء میں ضلع گوجرانوالہ سے شائع ہوا بعد میں انارکلی لاہور سے چھپنے لگا جنوری ۱۸۹۶ء میں اخبار ہفتہ وار سے روزنامہ ہوگیا۔ اخبار کی اشاعت دس ہزار سے زائد تھی اس عہد میں اخبار نے اشاعت کا جو ریکارڈ قائم کیا اس کی مثال نہیں ملتی۔ یہ اخبار ۳۸ سال تک باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا۔ اخبار کے مدیر مولوی محبوب عالم تھے اخبار کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ باقاعدہ پوسٹ آفس ''پیسہ اخبار پوسٹ آفس'' قائم ہوا۔ اسی سال کلکتہ سے ''احمدی'' کا اجراء ہوا۔ اس کے علاوہ مولانا عبدالحلیم شرر کی ادارت میں علم وادب کا نقیب ماہنامہ ''دلگداز'' جاری ہوا مولانا نے اخبار کے اجراء کے وقت یہ اعلان کیا ''دلگداز اردو رنگ سخن میں ایک نئی روح پھونکنے

Scanned with CamScanner

اور نئی طرح کی قوت مقناطیسی پیدا کرنے کے لئے جاری ہوا ہے۔" (مضامین شرر، مولانا عبدالحلیم شرر جلد اول، صفحہ ۲۱) دلگداز ۱۸۸۸ء سے ۱۸۹۱ء تک جاری رہا پھر حیدرآباد سے کچھ دن تک نکلا پھر عبدالحلیم شرر ۱۹۰۰ء میں لکھنو آئے تو از سر نو دلگداز جاری کیا۔ عبدالحلیم شرر نے اس کے علاوہ سات اخبار و رسائل جاری کئے جن میں محشر ہفت روزہ، پردہ غفلت پندرہ روزہ، الفرقان ماہنامہ، اتحاد پندرہ روزہ، مہذب ہفت روزہ اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کے علاوہ یکم جنوری ۱۸۸۷ء میں مولانا الطاف حسین حالی نے سہ ماہی رسالہ "خادم الطلباء" کے نام سے جاری کیا جس کے ایڈیٹر ذکاءاللہ خان تھے۔

لاہور سے منشی ہرسکھ رائے نے فارسی زبان میں ہفت روزہ "کوہِ نور" شائع کیا تھا یہ اخبار اردو زبان میں ۱۸۸۸ء میں جاری ہوا۔ یہ اخبار بارہ صفحات پر شائع ہوتا تھا۔ یہ واحد اخبار تھا کہ جس کی تعداد اشاعت پورے ملک کے اردو اخبارات سے زیادہ تھی۔ اسے حکومت برطانیہ کی سرپرستی بھی حاصل تھی اور انگریز افسر بھی ہندوستانی زبان میں مہارت حاصل کرنے کی غرض سے اسی اخبار کو خریدتے تھے۔

۵/اگست ۱۸۸۸ء میں ملک الشعراء منشی دوارکا پرشاد افق نے اپنے بڑے بھائی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے محلہ نوبستہ لکھنؤ سے اپنی نوعیت کا منفرد اخبار "نظم اخبار" جاری کیا۔ یہ اخبار مہینہ میں دو بار پانچویں اور بیسویں تاریخوں میں بارہ صفحات پر شائع ہوتا تھا۔ اس اخبار کے مالک دوارکا پرشاد افق اور ان کے معاون رام سہائے تمنا تھے۔ نظم اخبار کے بارہ صفحات میں سے آٹھ صفحات نظم کے لئے مختص تھا جب کہ چار صفحات نثر میں ہوتے تھے۔ اخبار کے صفحہ اول پر اخبار کے نام کے نیچے یہ شعر درج ہوتا تھا۔

اے تمنائے تمنا و تمنائے افق
گشت نظم اخبار مہر عالم آرائے تمنا

نظم اخبار کے صفحہ اول پر اخبار کے اغراض و مقاصد ۲۴ اشعار میں نظم ہوتے تھے جس کے آخری شعر میں اخبار کی تاریخ بھی نظم ہے۔

Scanned with CamScanner

مچادے شاعری کی اے افق دھوم — دکھا دے جلوۂ اخبار منظوم
مہینہ میں ہو جوش نظم و دوبا — بنے ماہ دو ہفتہ جس میں اخبار
ہر اک انداز کے مضموں ہوں اس میں — مطالب نثر کے موضوع ہوں اس میں
ہو بہرِ مرگ مضموں فکر صیاد — رہے خامہ مثال سرو آزاد
ذہانت کوئی باریکی نہ چھوڑے — قلم جودت ہر اک مضموں میں توڑے
ملے غافل جو محو خواب آرام — تو یہ پانی کے چھینٹے کا کرے کام
خبر کے واسطے یہ تار ہو جائے — گلوئے علم و فن کا ہار ہو جائے
بنے یہ مخبر حالاتِ عالم — دوائر اس کے سب ہوں ساغر و جم
رہے پہنے یہ فردوسی کا جامہ — بیان جنگ میں شاہ نامہ
ہو خوش اس کی روش سے کل زمانہ — نہ دکھنے دے یہ تسبیحوں کا دانہ
ظرافت کا نیا انداز دکھلائے — مذاقِ فکر کا اعجاز دکھلائے
ضمیمہ میں بہارِ نثر دکھلائے — جمالِ گلعزار نثر دکھلائے
غرض اخبار کے جو جو ہیں منصب — وہ سب اس میں نظر طرار انصب
بڑھا تعریف سے توقیر اشعار — رقم کر بے بدل منظوم اخبار

۱۸۸۸ء

اس مثنوی سے اخبار کے اغراض و مقاصد کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے۔ اخبار "نظم" کی خصوصیات و امتیازات میں سے ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اخبار آٹھ صفحات میں عاشقانہ غزلوں کے ساتھ منظوم خبریں اور تبصرے بھی شائع کیا کرتا تھا۔ ماہ مارچ ۱۸۹۰ء کے شمارہ ۵ میں ہولی کے سماں کا افق نے منظر یوں کھینچا ہے۔

عروساں نو گاتی ہیں ہولیاں — چھپاتی ہیں مسکی ہوئی چولیاں
ہر اک گھر سوابند رابن سے — ہر اک بڑھ کے شے کشن ہوبن سے ہے

Scanned with CamScanner

جسے دیکھئے وہ ساغر بدست جسے دیکھئے وہ ہے صہبا پرست
عنانِ سمند زباں تھام کر بس اس شعر پر اس کو انجام کر

لگے دشمنوں کے کلیجے میں آگ
مبارک ہو گل نازنیوں کو بھاگ

"نظم اخبار" میں منظوم خبروں کا انداز ملاحظہ ہو۔

یہاں کی ہے طوائف ایک مشہور پرستاں کی پری فردوس کی حور
زمانے میں ہے دارو نام اس کا تھا یوسف بندۂ بے دام اس کا
مزاج حسن ہفت افلاک پر تھا پئے عشاق غصہ ناک پر تھا
ہے لب عشاق کو جاں بخش اس کا تھا یار غار میراں بخش اس کا
محبت میں بہم شیر و شکر تھے گل و بلبل پئے اہل نظر تھے
وفاداری کے دم بھرتے تھے دونوں نہ تھا کھٹکا مزے کرتے تھے دونوں
فلک نے تفرقہ کی رہ نکالی گرہ دارو کے نازک دل میں ڈالی
ہوا دارو کو شق بے وفائی نظر سے صورت عاشق گرائی
بگاڑی ایک عرصہ سے بنی بات نئے دھوکے کی چالو سے کیا بات
سرِ عاشق پہ مارا خنجر جور جو اپنے لئے ڈھونڈا کوئی اور
نہ میراں بخش کی سمجھی قدامت جفا سے بند کی صاحب سلامت
ہوا بے تاب میران بخش کا دل جگر سینے میں تڑپا شکل بسمل
رکھی دارو کی اٹھتے بیٹھتے تاک کسی دن پا کے موقع کاٹ لی ناک
مٹا اسباب خودبینی کا دم میں گئی چہرے کی مرغوبی عدم میں
گئی جب بے رخی سے اس طرح ناک نہ تاب آئی ہوئی دارو غضبناک
رخِ مطلب پہ کی غازے کی مالش عدالت چڑھ کے کی عاشق پہ مالش

Scanned with CamScanner

جہاں کو اس خبر سے آگاہی ہے
بس اب پیسی پہ پیسی ہو رہی ہے

سچ تو یہ ہے کہ منشی دوارکا پرشاد افق نے اس قبیل کی خبریں اخبار میں نظمیہ انداز میں شائع کر کے اپنی پرگوئی کا ہی ثبوت ہی فراہم نہیں کیا بلکہ میدانِ صحافت میں ایسا کارنامہ انجام دیا کہ جس کی نظیر صحافت کی دنیا میں نظر نہیں آتی۔ ڈاکٹر کومل بھٹناگر کا یہ کہنا صداقت پر مبنی ہے:

''صحافت کی تاریخ کا پہلا اور شاید آخری تجربہ ہو۔'' (ڈاکٹر کومل بھٹناگر، ملک الشعراء منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی، صفحہ ۳۱۸)

''نظم اخبار'' کی اشاعت میں مالی تعاون کرنے والوں میں نظام حیدرآباد اور ان کے دربار سے وابستہ مہاراجہ گردھاری پرشاد باقی جیسی شخصیات تھیں۔ یہ اخبار ہمیشہ قومی یکجہتی، حب الوطنی اور رواداری کا علمبردار رہا۔ اخبار کی مدت حیات چار سال تھی۔ نظم اخبار میں ہر قسم کی خبریں ہوتی تھیں اس لئے اخبار کو عوام میں مقبولیت بھی حاصل تھی۔ اخبار کی عوامی مقبولیت کا اندازہ سلطان الاخبار بنگلور مطبوعہ ۴ فروری ۱۸۸۹ء کے اس بیان سے بخوبی ہوتا ہے۔

''ہندوستان کا اکلوتا اخبار دفتر مطبع میں آتا ہے ہم نے اس اخبار کو غور سے دیکھا اور اوس کے منظومہ مضامین کو نکتہ چینی کے خیال سے پڑھا ہمیں خوشی حاصل ہوئی کہ باوجود اس خیال کے ہم نے اس اخبار کو ہر طرح سے عمدہ پایا نظم میں فصاحت کے ساتھ شاعرانہ مناسبات موجود حشو نظم اخبار کے کلام سے مفقود خبروں کو موتیوں کے سلک نظم میں ایسا پرویا ہے گویا دریا کو کوزہ میں بند کیا ہے کہیں مسدس کہیں رباعیات اور کہیں مثنویات کی دھوم ہے۔ ہر ایک شعر میں زمانہ کی حالت اور نیچرل مضامین کا ہجوم ہے خط و خال غنج و دلال سے قطع نظر کر کے جو فی زمانہ ایشیائی شاعری کا لب لباب ہے اس اخبار کے اڈیٹر نے مہذب زمانے کی چال ڈھال کے مطابق اپنی طبعیت کے ایسے جوہر دکھائے کہ بیساختہ کہنا پڑتا ہے کہ شعر گوئی اس کا نام ہے۔ اگرچہ اخبار نویسی درحقیقت کسی پیرایہ میں ہو آسان کام نہیں ہے اور جو لوگ اس کشتی کے ملاح ہیں انھیں خوب معلوم ہے کہ کسی منجدھار میں میں کشتی چلانیکا کام پڑتا ہے ---یادگار افق صفحہ ۱۴

Scanned with CamScanner

منشی دوارکا پرشاد ایڈیٹر نظم اخبار پر آفریں کہ اس شیریں پیشہ شاعری نے جب سے نظم اخبار کو نکالا برابر اوسکا اہتمام کیا۔ لکھنو کیا سارے ہند میں اپنے نظم اخبار کی دھوم مچادی ہندیوں پر ثابت کر دیا کہ ابھی ہند کی خاک میں وہ زور ہے کہ جس طرف سے اس اہم کام کی انجام دہی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ہے"

(امرت کا پیالہ یادگار رافق، منشی رام نرائن مشتاق تمنائی پریس نو بستہ لکھنو، ستمبر ۱۹۱۴ء، صفحہ ۱۵)

۱۸۷۹ء میں کلکتہ سے "کلکتہ پنچ" کی اشاعت ہوئی اور ۱۸۹۰ء میں لاہور سے "کھتری سماچار" جاری ہوا جس کے مدیر ہیرالال کپور تھے اس کے علاوہ مولانا عبدالحلیم شرر نے یکم اگست کو مہذب اخبار جاری کیا اسی سال ڈاکٹر مکند لال نے ماہنامہ "تاریخ بغاوت ہند" آگرہ سے نکالا جس میں ۱۸۵۷ء کے دوراں رونما ہونے والے مظالم کی روداد اہتمام کے ساتھ شائع ہوتی تھی نیز منشی ایودیا پرشاد نے اجمیر سے "خلق خدا" نام کا اخبار جاری کیا ۱۸۹۱ء میں منشی گنیش لال نے میرٹھ سے "جلوہ طور" نکالا جس کے ایڈیٹر سید ظہیر الدین تھے۔ نیز ۱۸۹۲ء میں ہفتہ وار اخبار منشی حامد حسن کی ادارت میں کپورتھلہ سے "کپورتھلہ" اخبار ظہور پذیر ہوا یہ اخبار بارہ صفحات پر محیط تھا۔ اسی سال گورکھپور سے "الوقت" اور علی گڑھ سے "محمڈن اینگلو میگزین" شائع ہوا جس کے مدیر محمد شبلی نعمانی تھے ۱۸۹۴ء میں مرزا عبدالتقی قزلباش کی ادارت میں ماہنامہ "روشنی" کا اجرا ہوا۔

انیسویں صدی میں اردو اخبار نویسی کو ایک نئی جہت سے روشناس کرانے والوں میں اہم نام امرتسر سے نکلنے والے اخبار "وکیل" کا بھی ہے۔ ۱۸۹۵ء میں یہ اخبار شائع ہوا۔ اخبار بارہ صفحات پر محیط تھا نیز یہ اخبار مہاتما گاندھی کے افکار و نظریات کا موید بھی تھا۔ اس اخبار نے نہ صرف شہر امرتسر میں اردو صحافت کی بنیاد مضبوط کی بلکہ پورے ملک میں اس اخبار نے شہر کا نام بھی روشن کیا۔ اس اخبار کے مدیران میں بیشتر ایسے افراد رہے جنہیں مستند اہل قلم تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس اخبار کے ایڈیٹروں میں مرزا حیرت دہلوی، مولوی عبداللہ منہاس، مرزا جالب دہلوی، مولانا ابوالکلام آزاد اور حکیم فیروز الدین جیسی شخصیات تھیں یہ شخصیات دنیائے صحافت میں کسی تعارف

Scanned with CamScanner

کی محتاج نہیں ہیں اخبار کے زبان و بیان کے متعلق مولانا حسرت موہانی کا فرمانا تھا کہ:

''زبان کی صحت اور لٹریچر کی خوبی کے لحاظ سے وکیل ایک خاص امتیازی شان رکھتا ہے۔''

(پنجاب میں اردو صحافت، مولفین رام سرن آصل اوتار، اوم پرکاش سونی، مطبوعہ چوپڑہ پرنٹنگ پریس، باغ کرم بخش جالندھر، ۱۹۸۸ء صفحہ ۳۶)

شہر امرتسر سے ہی ۱۸۹۵ء ہفتہ وار اخبار ''جہاں نما'' کی اشاعت ہوئی اس اخبار کے مدیر نرائن سنگھ اہلووالیہ تھے۔ اسی سال دیوان آتمارام کی ادارت میں وزیر آباد گوجرانوالہ سے ہفتہ وار اخبار ''پنجاب آرگن'' جلوہ افروز ہوا اور گورکھپور سے ''صلح کل'' شائع ہوا۔ اسی سنہ میں لاہور سے ''انتخاب لاجواب'' نمودار ہوا۔ اس اخبار میں دلچسپی کے مضامین اور سائنسی مضامین کو اولیت دی جاتی تھی اخبار کی اہمیت کا اندازہ منشی محمد دین فوق کے اس بیان سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے وہ رقم طراز ہیں:

''ایک ایسا عجیب وغریب رسالہ بنام ''انتخاب لاجواب'' جاری کیا گیا ہے وہ نہ صرف ہندوستان بھر میں اپنی قسم کا واحد رسالہ ہی شمار ہوتا ہے بلکہ نہایت کامیابی سے چل رہا ہے اس کی اشاعت دو ہزار کے قریب ہے۔''

۱۸۹۶ء میں لکھنو سے نوبت رائے نظر کی ادارت میں ''خدنگ نظر'' شائع ہوا اس رسالے کا ہر شمارہ تین حصوں پر منقسم رہتا تھا پہلا حصہ نظموں کے لئے مخصوص تھا جبکہ دوسرا غزلوں کے لئے اور تیسرا ناول نگار رینالڈ کے ایک ناول کے اردو ترجمہ کے لئے مختص تھا اس رسالے کے نثری حصہ کی ادارت سے مولانا آزاد بھی وابستہ رہے۔ گیا سے اسی سال شہرہ آفاق'' کا اجرا ہوا اور ۱۸۹۶ء میں ہوشیار پور سے ہفتہ وار اخبار ''دوآبہ'' نمودار ہوا۔ ایک سال مدت حیات رہی دوبارہ ۱۹۰۴ء میں پھر جاری ہوا۔ اسی سال آریہ سماجیوں کا نقیب ہفتہ وار ''تازہ اخبار'' پنڈت دادن خاں نے شائع کیا۔ جنوری ۱۸۹۷ء میں بنوں سے ہفتہ وار اخبار ''تحفۂ سرحد'' پیارے لال شاکر کی ادارت میں شائع ہوا۔ اس اخبار کے مالک ڈاکٹر تھیوڈر تھے۔ اسی سال احمدیوں کے افکار

Scanned with CamScanner

وجذبات کا ترجمان قادیان ضلع گورداسپور سے ''الحکم'' جاری ہوا۔ یہ ہفتہ وار اخبار تھا مدیر یعقوب علی تراب تھے۔ اسی سال پٹنہ سے الہادی، ادیب، رسالہ مخزن تحقیق ملقب، اخبار تہذیب تحفہ حنفیہ اور بہار شریف سے ''الشرف'' جاری ہوا۔ اس کے علاوہ خواتین کی فلاح و بہبود اور اصلاح کی غرض سے یکم جولائی ۱۸۹۸ء میں لاہور سے ہفتہ وار اخبار ''تہذیب نسواں'' کی اشاعت عمل میں آئی۔ یہ اخبار ۵۱ سال تک اپنے فریضے کو انجام دیتا رہا اخبار کے ایڈیٹر مولوی سید ممتاز علی تھے۔

انیسویں صدی ۱۸۹۹ میں مولوی امجد علی اشہری نے ''سفیر دکن جاری کیا۔ اور اسی سال ''مشیر دکن'' کا بھی اجراء ہوا۔ پنجاب سے آریہ سماج کا آرگن اکتوبر میں جالندھر سے ''آریہ مسافر'' شائع ہوا۔ یہ جریدہ ۹۰ صفحات پر محیط ہوتا تھا اس کے مدیر شری وزیر چند تھے۔ اس کے علاوہ فیروزہ آباد سے ''ادیب'' جاری ہوا جس میں بیشتر ادبی و شعری تخلیقات شائع ہوتی تھیں۔

انیسویں صدی کے سو سالہ صحافتی سفر پر تفصیلی روشنی ڈالنے کے لئے تو دفتر درکار ہے لیکن اس مقالے میں حتی الامکان اس بات کی سعی کی گئی ہے کہ برعظیم کے مختلف شہروں کے ان مشہور و مقتدر رسائل و جرائد کا ذکر آجائے کہ جنھوں نے اردو صحافت کو پروقار بنانے میں سرگرم حصہ لیا ہے۔ صد سالہ صحافتی سفر خصوصاً اردو زبان کی صحافت پر نگاہ ڈالنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تقریباً پچیس فیصد اردو اخبارات کے مالک و مدیر اہل ہنود تھے اور قارئین کی اکثریت بھی ہندو طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔ اگر یہ کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا کہ اردو صحافت کو پروقار بنانے میں غیر مسلم صحافیوں کا بھی گراں قدر حصہ ہے۔ اس کے علاوہ جنگ آزادی کی تحریک میں نمایاں کردار ادا کر کے ملک کو آزادی سے ہمکنار کرانے میں بھی اردو صحافت کا ہی غیر معمولی کردار ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ صحافت کو پروقار اور باعظمت بنانے میں اردو صحافت نے جو کردار ادا کیا ہے اسے تاریخ صحافت کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

انیسویں صدی کے سو سالہ صحافتی سفر کے ذکر سے یہ واضح ہے کہ سو سال کے عرصے میں میں تمام اخبارات نثر ہی میں شائع ہوتے تھے البتہ ۱۸۸۸ء میں اپنی نوعیت کا منفرد اخبار ''نظم

Scanned with CamScanner

اخبار'' نظم میں جلوہ افروز ہوا جس نے اردو صحافت کو ایک نئی راہ سے روشناس کرایا۔ اس جائزہ سے یہ بھی واضح ہے کہ مشرقی پنجاب، مدراس اور شملہ وغیرہ اردو صحافت کا گہوارہ رہ چکے ہیں لیکن افسوس فی الوقت یہاں سے کوئی قابل ذکر اخبار شائع نہیں ہوتا پنجاب سے اس عہد میں ''ہند سماچار'' کے نام سے اخبار شائع ہوتا ہے کہ جس کی زبان بہت ہی خراب ہوا کرتی ہے ایسے حالات میں سرکاری اداروں اور اردو کے شائقین کو اردو صحافت کے ان گہواروں کی جانب بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے تا کہ وہاں سے قابل اطمینان اردو زبان میں اخبارات شائع ہو سکیں اس لئے کہ موجودہ عہد میں بھی اردو کے قارئین قابل اطمینان حد تک وہاں موجود ہیں صرف خاطر خواہ توجہ درکار ہے اگر سرکاری محکمے اور اردو سے محبت کرنے والوں نے توجہ کر لی تو جس طرح اردو صحافت کا ماضی تابناک رہا ہے اس طرح حال اور مستقبل بھی تابناک اور روشن رہے گا۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر ریحان حسن
شعبۂ اردو، فارسی، گرونانک دیو یونیورسٹی، امرتسر، پنجاب
موبائل نمبر: 8559020015

Scanned with CamScanner

منشی دوار یکا پرشاد ایک منفرد صحافی

صحافت کی کتاریخ بہت پرانی ہے، صحافت کی اس قدیم وجدید کی بحث یہاں پر قطعی مناسب نہیں سمجھتا، لیکن ایک بات ضرور ہے کہ عہد کی قدروں کے عروج وزوال کے ساتھ لسانیت میں بھی تغیر وتبدل ہوتا رہتا ہے، اور اس کے ارتقا اور انحطاط میں اس زمانے کے سماجی حالات کا بہت بڑا رول ہوتا ہے، اور یہ تبدیلی تدریجی طور سے مرحلہ در مرحلہ وقوع پذیر ہوتی رہتی ہے۔ جس کا مشاہدہ تاریخ کے مطالعہ سے کیا جاتا ہے۔ دنیا کی بہت سی زبانیں اپنے تمام عروج کے ساتھ آج تاریخی باقیات کا حصہ بن کر رہ گئیں ہیں۔ لہٰذا زبان کو زندہ رکھنے کے لیے اس سے وابستہ تمام فنون اصناف پر خاص توجہ کی ضرورت ہے۔

ہماری اردو صحافت کا بھی یہی حال رہا ہے۔ یہ زمانہ کے مدوجزر اور سماجی غیر ہم آہنگی سے ہمیشہ نبرد آزما رہی ہے، اور ہماری زبان سے تعلق رکھنے والا شعبہ یعنی صحافت کو ہمیشہ ایک انتہائی درجہ حاصل رہا ہے۔ چونکہ اس کا تعلق براہ راست عوام سے رہا ہے، اور سماج ومعاشرہ کے تمام تر سیاسی، سماجی ومذہبی اور غیر مذہبی حقائق ونقائص کی ترسیل کو بیباک انداز میں بیان کرنا بڑی جرأت و ہمت کی بات ہوتی ہے۔ اردو کی صحافتی تاریخ میں ایسے کچھ اہم صحافی گزرے ہیں جنھوں نے اپنے قلم کا استعمال صحافت کے میدان میں بڑے انقلابی اور اور غیر جانبدارانہ انداز میں کیا ہے، جس کی وجہ سے انھیں اس زمانے کی حکومتوں نے معتوب بھی کیا، اگر بات یہی تک محدود ہوتی تو اس کی زیادہ اہمیت نہ ہوتی لیکن، انگریزوں کا مولوی محمد باقر کو ان کی بیباک صحافت کی وجہ سے توپ کے دہانے پہ باندھ کر گولے سے اُڑا دینا، اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ایک صحافی کی قلم سے لکھی گئی تحریروں میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ حکمرانوں کے دلوں میں خوف اور ان کے پایۂ تخت کو متزلزل کر دیتی ہے اور عوام میں ایک انقلاب برپا کر دیتی ہے۔ اس سے صحافی اور صحافت کی طاقت واستقامت کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

Scanned with CamScanner

آج کے صحافی اور صحافت پر میں مزید تبصرہ نہیں کرسکتا اس لئے کہ یہ بات آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ آج صحافت کا کیا حال ہے اور خاص کر اردو صحافت کس زوال اور انحطاط اور بحران سے گزر رہی ہے۔ اس بحران کے لئے ایک دوسرے پر الزام تراشی سے زیادہ مناسب یہ ہے کہ اس کے اصل محرکات پر غور کرنا وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ ورنہ صحافت کے اس تجارتی مسابقت میں نقصان کسی اور کا نہیں بلکہ ہماری اردو صحافت کا ہی ہوگا۔

اردو صحافت کے اس زریں دور کو ہم کس طرح فراموش کر سکتے ہیں، جب صحافت کے متعلق قلم کے ایک سے بڑھ کر ایک بیباک سپاہی اور نابغۂ روزگار شخصیات وابستہ تھیں، جنھوں نے اردو صحافت کو نئی ترقیوں سے روشناس کرایا، اور اسے آسمان کی بلندیوں سے ہمکنار کیا، منشی جی اپنے زمانے کے ایک بڑی علمی شخصیت تھے، اور ان کی علمی لیاقت اور ادبی ذہانت کا ایک زمانہ معترف رہا ہے۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ انھوں نے جو مقبولیت اور شہرت ان کے علمی کارنامے کے ذریعہ ملنی چاہیے تھی وہ اس سے محروم رہے۔ لیکن ادھر کچھ برسوں سے ان کے سلسلہ سے کچھ کام ضرور ہو رہا ہے۔ جو کچھ نہ ہونے سے ہونے کے مترادف ہے۔

منشی دواریکا پرشاد جی ایک علمی ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے، انھوں نے اردو زبان کی تمام اصناف سخن میں قابل قدر کارنامہ انجام دیا ہے، جس پر بیک وقت گفتگو کرنا بہت مشکل ہے، وہ فطری طور سے شاعر تھے لیکن، وہ جتنے بڑے شاعر تھے اس سے کہیں زیادہ بڑھ کر ایک مضبوط اور بیباک صحافی بھی تھے۔ اس لئے کہ اس عہد میں اردو صحافت کے شعبہ سے وابستہ زیادہ تر غیر مسلم حضرات تھے جنھوں نے اردو صحافت کو بہت فروغ دیا۔ پروفیسر مجاور حسین کا یہ اقتباس منشی جی کی صحافت سے متعلق آپ بھی ملاحظہ کریں۔

> ''انیسویں صدی میں اردو کے افق پر غیر مسلم حاوی رہے آگرہ کے صدالاخبار کے کیدار ناتھ ٹھاٹھے، ''مفید ہند'' کے منشی ایودھیا پرشاد، ''مالوا اخبار'' کے دھرم نرائن، ''کوہ نور'' لاہور کے منشی ہرسکھ

Scanned with CamScanner

رائے اور لالہ جنت نرائن، ''زائرین ہند'' کے ہرونش لال، ''نورالا بصار'' آگرہ (۱۸۵۲) کے منشی سدا سکھ لال، ہفتہ وار آفتاب ہند کے بابو گووند رگھوناتھ سنگھ، گوالیار جگت کے پنڈت اوما چرن ہفتہ وار چشمہ خورشید کے منشی دیوان چند، آگرہ کے ہفتہ وار خلائق کے منشی شیونرائن کے اسمائے گرامی اردو صحافت کے زریں باب کا تابناک عنوان ہے۔''

(نیا دور لکھنؤ، اردو صحافت نمبر جون جولائی، ۲۰۱۱ صفحہ ۱۰۲)

اس اقتباس سے آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس صحافت کو یہاں تک پہنچانے میں غیر مسلم صحافیوں کا ایک اہم رول ہے، جسے ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی علمی و اخلاقی رواداری کی ایک بہترین علامت کہا جا سکتا ہے۔ آج جب قدریں ختم ہو چکی ہیں اس لئے کہ ہماری اردو زبان کو بھی ہندوستانی سماج کی طرف مختلف طبقات اور الگ الگ رنگوں اور مذہبوں اور مسلکوں کی طرح تقسیم کر دیا گیا ہے۔ یہ افسوسناک صورت حال ہے، لیکن منشی دواریکا پرشاد جس عہد سے وابستہ تھے وہ بہت خالص ہندوستانی و اخلاقی قدروں کے احترام کا دور تھا، اس لئے ہندو مسلم کے درمیان کسی طرح کا ادبی و علمی خط امتیاز نہیں تھا، لیکن موجودہ حالات اس کے بالکل برعکس ہیں، لہٰذا منشی دواریکا پرشاد نے صحافت کے میدان میں بھی کھل کر اپنے جوہر کا مظاہرہ کیا، انھوں نے شروع میں مختلف اخبارات میں اپنی خدمات انجام دیں، ان میں ''بھارت پرتاپ'' اور ''بار خاص'' کا نام اہم ہے، جسے انھوں نے خبروں کو منظوم پیرایہ اظہار کا وسیلہ قرار دیا، اس کے ذریعہ ان کے زبان و بیان پر کامل دسترس کی دلیل تھی، اور اخبار کی دنیا میں یہ ایک نیا تجربہ تھا جس نے لوگوں کو چونکا دیا۔ افق لکھنوی کے انہیں کمالات کا اعتراف پروفیسر سید مسعود حسین رضوی نے بھی کیا ہے یہ اقتباس ملاحظہ کریں۔

Scanned with CamScanner

''جناب افق نے مختلف حیثیتوں سے شعروادب کی بڑی
خدمت کی ہے وہ کئی اخباروں کے ایڈیٹر ہیں کئی ناول تصنیف
کیے کئی سوانح عمریاں لکھیں، رسالوں میں مضامین شائع کیے
گئے گیت بنائے، ڈرامے لکھے اہم کتابوں کے اردو میں ترجمے
کیے اور خاص طور پر شاعری میں شہرت حاصل کی انھوں نے
غزل سے زیادہ نظم کی طرف توجہ کی وہ تمام اصناف سخن پر قادر
تھے اور ان کی نظموں کا میدان بہت وسیع تھا.....''

(منشی دواریکا پرشاد افق، مصنف ڈاکٹر کومل بھٹناگر)

پروفیسر نیر مسعود کے اس اقتباس کے ذریعہ ان کے ہمہ جہت خوبیوں کا انکشاف ہوتا ہے اور اردو زبان وادب میں خاص طور سے ان کی سب سے زیادہ محبوب ترین صنف نظم تھی جس کا استعمال انھوں نے اپنی جولانی طبع کا بڑے موثر انداز میں کیا، اور انھوں نے صحافت کی دنیا میں خود کو ایک نئے انداز سے متعارف کرایا، اس کی خاص وجہ یہ تھی کی انھوں نے، پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ کے بعد ۵/اگست ۱۸۸۸ میں انھوں نے باضابطہ ایک اخبار نکالنے کی شروعات کی جس کا نام انھوں نے ''نظم اخبار'' رکھا یہ اخبار ۱۲/صفحات پر مشتمل ہوتا تھا جس میں سے آٹھ صفحات منظوم خبروں کے لئے مخصوص ہوتا تھا، اور خبروں کو منظوم بذات خود فرماتے اور چار صفحات نثر میں ہوتے، یہ پندرہ روزہ اخبار تھا لہذا اس کی اشاعت دو مرتبہ کی جاتی تھی۔ اس اخبار کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ لوگ اس اخبار کے منتظر رہتے، اور اس کی پذیرائی ہاتھوں ہاتھ کی جاتی۔ منشی دواریکا پرشاد کا صحافت کی دنیا میں یہ ایک نیا تجربہ تھا، اس لئے اسے کافی سراہا گیا۔ میں ان کے اس ''نظم اخبار'' میں شائع ہونے والی ایک منظوم خبر پر اپنی بات کا اختتام کرنا چاہتا ہوں۔ ۵/مارچ ۱۸۹۰ کے شمارے میں شائع ہونے والی ایک اہم خبر جو شاہ ایران کے ہندوستان کی آمد کے موقع پر منشی جی

Scanned with CamScanner

نے اپنے ''اخبار نظم'' میں بڑے نمایاں طور پر شائع کی تھی، اس خبر کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

جو ایراں کے شہر، کشور ستاں ہیں
نظیر سنجرو نوشیرواں ہیں
حرم ہے ساتھ ان کے، چشم بددور
جو خلد خلدِ خطۂ ایراں کے ہیں حور
ہیں ان سب سے، چراغ خانداں سات
زمین فارس پر ہیں، آسماں سات

یہ نظم اسی طرح کے چار بند پر مشتمل ہے، منشی جی کے اس منظوم خبر کے ان اشعار سے خود اندازہ لگائیں کہ انہیں صحافت کے میدان میں بھی کتنی مہارت اور قدرت حاصل تھی، اور کس طرح کے جدت پسند طبیعت کے حامل تھے لہذا انھوں نے صحافت کے میدان میں اک گرانقدر تجربہ کیا یہ اور بات ہے کہ یہ تجربہ اتنا مقبول عام نہ ہوسکا کیونکہ یہ فن صرف منشی جی تک ہی محدود رہا کیونکہ سب منشی جی تو نہیں ہوسکتے اس لئے جب بھی صحافت کی بات کی جائے گی تو منشی جی کا نام بڑے ادب واحترام کے ساتھ لیا جائے گا۔

☆☆☆

ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی
مدیر: نیا دور، لکھنو

Scanned with CamScanner

انیسویں صدی میں اردو صحافت

ایک آدھ دعویٰ کو اگر ہم نظر انداز کر دیں کہ اردو صحافت کا اجرا 1793 سے ہوتا ہے تو ہم اسی پوائنٹ پر لوٹ کر آ جاتے ہیں کہ اردو صحافت یا کسی بھی زبان کی صحافت کا آغاز انیسویں صدی ہے جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعہ انگریزوں نے پہلے بڑی چالاکی اور عیاری سے بادشاہ وقت کو اپنا دست نگر بنایا اور ان کے تاج کو کاسۂ گدائی روزمرہ کے اخراجات کے لئے نام نہاد مغل حکمرانوں کو ان انگریزوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا پڑتا تھا۔ ہندوستان کی حالت دگرگوں تھی اور ہر حساس شخص اپنے ملک کی اس حالت سے پریشان تھا چنانچہ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق محبان وطن کچھ نہ کچھ کر گزرنے کی خواہش رکھتا تھا۔ لیکن بے بسی اور بے کسی انہیں خاموش بیٹھے رہنے پر مجبور کر دیتی۔

حالات خواہ کیسے بھی ہوں جذبات واحساسات کو کسی نہ کسی شکل میں سامنے آنا چاہئے۔ سینے میں دبے ہوئے جذبات و احساسات کی زیادتی سے محبان وطن کے سامنے ایک ہی راستہ کہ وہ اپنے جذبات کا کسی طرح سے اظہار کریں تا کہ دل ودماغ کا بوجھ کچھ کچھ تو ہلکا ہو۔

کہتے ہیں کہ سیاست کا صحافت سے گہرا تعلق ہے۔ اور اس وقت سیاست کے نام پر غلامی سے نجات اور حصول آزادی تھا۔ جس کی ایک ہی صورت تھی کہ غلامی کے خلاف اپنے غم و غصہ کا اظہار کرتے رہنا ہے تا کہ معلوم ہو کہ ہندوستان واسی ابھی ان کے سینے میں غلامی اور ظلم و زیادتی کے خلاف آگ دہک رہی ہے اور کسی آن اس آگ سے وہ بدیسی حکمرانوں کو جلا کر بھسم کر دیں گے۔

حضرات شاید میں اپنے موضوع سے تھوڑا سا بھٹک رہا ہوں۔ مجھے 19 ویں صدی کی صحافت پر گفتگو کرنی ہے۔ اپنے وطن کے اس وقت کے منظر نامے میں کچھ ایسے جیالے ہمیشہ

Scanned with CamScanner

سامنے آتے رہے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں میں کچھ لوگ وہ تھے جو اپنے قلم کو تلوار اور کاغذ کو ڈھال بنا کر غاصبان وطن کے سامنے سینہ سپر ہوتے رہے ہیں اور یہی قلم اور کاغذ متحد ہو کر صحافت کو جلا بخش رہے تھے۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی سیاست اور صحافت کی۔ انیسویں صدی کے ہندوستان کی زبوں حالی کی تصویر سب کے سامنے تھی، لیکن صحافت کے ذریعہ اپنے جذبات کا اظہار کرنے والوں کی تعداد کم نہ تھی۔ کمی تھی تو ہمت اور جرأت کی۔

انیسویں صدی کو صحافت کے آغاز کی صدی کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ اس صدی کے آغاز کے ساتھ ہی ہندوستان میں صحافت کا آغاز ہوتا ہے۔ گو کہ اس سے پہلے بھی صحافت ہوتی رہی تھی لیکن وہ انگریزی تک محدود تھی۔ انگریزوں نے اس صحافت کو آلہ کار بنایا اور اس کا فائدہ نہیں ملا۔

جہاں تک اردو میں صحافت کا تعلق ہے تو اب تک کی تحقیق کے مطابق کلکتہ سے نکلنے والا 'جام جہاں نما' (مالک ہری ہر دت، مدیر: منشی سدا سکھ لال) شاید اردو کا پہلا اخبار تھا جو 1822 میں نکلنا شروع ہوا۔ لیکن دو وجہوں سے اس اخبار کو ہم اپنا اخبار نہیں کہہ سکتے۔ ایک تو یہ کہ یہ اخبار پورے طور پر انگریزوں کا تھا اور دوسرے یہ کہ یہ اردو میں کم کم اور فارسی میں ذرا زیادہ تھا۔ لیکن خوشی کی بات صرف اتنی ہے کہ یہ اخبار اردو میں بھی تھا۔ 1822 میں نکلنے والا یہ اخبار 'جام جہاں نما' 1822 تک جاری رہا۔

تازہ ترین دعویٰ کے مطابق 1810 میں کلکتہ سے ہی ایک اردو خبار نکالا تھا۔ اس دعوے کی بنیاد پر اردو کے سب سے بڑے سرکاری ادارے قومی کونسل نے دوسو سالہ جشن صحافت منانے کا اعلان کیا، لیکن یہ دعویٰ محض دعویٰ ہی معلوم ہوتا ہے اور یہ بات تبھی محقق ہو سکتی ہے جب یہ پایۂ تحقیق کو پہنچ جائے۔ جیسا کہ میں نے شروع میں ہی کہا ہے کہ دعویٰ تو اس کے پہلے کا بھی ہے کہ ٹیپو سلطان نے 1793 میں کرناٹک کے سری رنگا پٹنم سے اردو میں 'فوجی اخبار' کے نام سے

Scanned with CamScanner

ایک اخبار نکالا تھا۔ اس کا ذکر مشہور تاریخ داں بپن چندرا نے بھی کیا ہے۔ اگر اس دعوے کو سچ مان لیا جائے تو اردو صحافت کی تاریخ دو سو سال نہیں بلکہ سوا دو سو سال پر محیط ہے، لیکن یہ دعویٰ بھی محض دعویٰ ہے اس کو حتمی نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں خوش فہمی کی بات کچھ اور ہے۔

البتہ اس بات سے تھوڑی سی تسکین ہو سکتی ہے کہ 'جامِ جہاں نما' سے پہلے بھی اردو میں اخبارات نکلے لیکن یہ سب قلمی اخبار تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسے اخبار کی وقعت اور افادیت کتنی ہو سکتی ہے۔ ان میں سے بیشتر اخبار مغل بادشاہوں نے نکالے اور اس کے لیے انہوں نے وقائع نویس بھی مقرر کیے تھے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں انیسویں صدی میں نکلنے والے تقریباً تمام اخبارات کی ایک فہرست درج کر دی جائے۔ جہاں تک ہماری رسائی ہو سکتی ہے اس کی روشنی میں ان اخبارات میں 'جام جہاں نما' کو بہر حال اولیت حاصل ہے۔ اس کے بعد 1837 میں دہلی اردو اخبار مولوی محمد باقر جنہیں انگریزوں نے ایک انگریز کے قتل کے جرم میں شہید کر دیا تھا۔ 'سید الاخبار' (1852) سرسید کے بڑے بھائی سید محمد خاں نے دہلی سے ہی جاری کیا۔ سرسید نے اسی اخبار سے چھپنے چھپانے کا سلسلہ شروع کیا۔ 'فوائد الناظرین' (1852) (ماسٹر رام چندر) 'قرآن السعدین' (1852) 'کوہ نور لاہور' (1850) ایڈیٹر ہرسکھ لال' ہفت روزہ 'جامع الاخبار' مدراس (1841) ایڈیٹر سید رحمت اللہ، اعظم الاخبار (بریلی، 1848) آفتاب عالم تاب (1849) رئیس الاخبار، تیسر الاخبار، عمدۃ الاخبار، مخزن الاخبار، (1850) تعلیم الاخبار (1851) نعیم الاخبار، امیر الاخبار (1853)، مراۃ الاخبار (1854) قاصد الاخبار، صبح صادق، طلسم حیرت (1856) مظہر الاخبار، خلاصۃ الاخبار۔ آپ کے شہر الہ آباد سے بھی نور الابصار کے نام سے 1852 میں منشی سدا سکھ لال کی ادارت میں پندرہ روزہ اخبار نکلا کرتا تھا، جو ادبی اور علمی نوعیت کا تھا۔ یہ وہ اخبار ہیں جو 1857 تک نکلتے اور بند ہوتے رہے ہیں۔

1822 سے 1857 تک ایک اندازے کے مطابق کم از کم 122 اخبارات نکلتے

Scanned with CamScanner

رہے جو بیشتر ہفت روزہ اخبار تھے۔ کسی انجمن یا تنظیم کے تحت نکلنے والے اخبارات کی تعداد 19 تھی۔ بیشتر اخبارات کے جاری ہونے کی تاریخ تو معلوم ہو جاتی ہے مگر سال اختتام نہیں معلوم ہوتی ہے۔

1858 سے نکلنے والے اخبارات سیاسی بھی ہوتے تھے اور سماجی بھی۔ ایک اندازے کے مطابق ان کی تعداد 374 بتائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اسی دوران ان ریاستی اخبارات کی تعداد بھی 41 بتائی گئی ہے۔

اس دور میں مذہبی اخبارات بھی نکلتے تھے جن کی تعداد کم وبیش 73 بتائی جاتی ہے۔ دولسانی اخبارات کی تعداد 37 ہے۔ جن میں بیشتر انگریزی میں ایک ساتھ شائع ہونے والے اخبارات ہیں۔ چھ سات اخبار سہ لسانی بھی تھے۔ ایک 'سرکاری اخبار 1870 میں ناگپور سے نکلتا تھا یہ ایک ساتھ اردو انگریزی اور مراٹھی میں شائع ہوتا تھا۔ دہلی سے سید الاخبار جو منشی مراری لال کے زیر ادارت 1873 میں نکلنا شروع ہوا وہ بیک وقت انگریزی، اردو اور ہندی میں شائع ہوتا تھا۔ ہندو پرکاش نام کا رسالہ امرتسر سے 1873 میں پادری رجب علی کی ادارت میں، اردو ناگری اور گرمکھی میں شائع ہوتا تھا۔ لاہور سے رومن اخبار کے نام سے 1879 میں اردو اور رومن رسم الخط میں شائع ہوا کرتا تھا۔

بھاگلپور سے بھاگلپور نیوز کے نام سے 1882 میں انگریزی، ہندی اور اردو میں شائع ہوتا تھا۔ رین گزٹ بانس بریلی سے 1885 میں رائے کشن لال کی ادارت میں انگریزی، اردو ہندی میں ایک ساتھ شائع ہوتا تھا۔

زبوں حالی کے اس دور میں بھی ہمارے ہندوستان سے طنزیہ و مزاحیہ اخبارات بھی نکلتے تھے۔ ان کی تعداد بھی قابل لحاظ 71 ہے۔ ان اخبارات میں سے اودھ پنچ لکھنؤ سے منشی سجاد حسین کی ادارت میں 1877 میں جاری ہوا۔ پٹنہ سے 'الپنچ' کے نام سے 1885 میں فضل حق آزاد کی ادارت میں جاری ہوا۔

Scanned with CamScanner

آپ کے الہ آباد سے بھی 1886 میں حافظ سید محمد اسماعیل کی نگرانی میں ایک ہفت روزہ نکلتا تھا۔ مذکورہ بالا تقریباً 71 پرچوں میں جو شہرت اودھ پنچ لکھنؤ اور الہ پنچ کو ملی وہ کسی اور کو نہیں ملی۔

اب تک ہم نے جتنے اخبارات کا ذکر کیا ان میں سے بیشتر ہفتہ وار تھے۔ اکا دکا پندرہ روزہ بھی ہوتے تھے۔ لیکن جہاں تک انسان کی عادت و فطرت کا سوال ہے وہ ہر آن تلاش و جستجو میں لگا رہتا ہے۔ وہ نئی نئی خبریں جاننے اور سننے کا متمنی ہوتا ہے چنانچہ اس دور میں بھی یعنی 1885 سے 1900 کے درمیان کم سے کم 32 اخبارات روزنامے کی شکل میں شائع ہوتے تھے۔ ان میں دو تین اخباروں نے ہی شہرت پائی جن میں لکھنؤ کا اودھ اخبار جو منشی نولکشور کی ادارت میں 1877 میں قیصر الاخبار الہ آباد سے منشی سراج الدین احمد خاں کی ادارت میں 1872 میں، اردو گائیڈ کبیر الدین احمد خاں کی نگرانی میں کلکتہ 1884 سے جاری ہوا۔

15 اگست 1888 میں لکھنؤ سے دوارکا پرساد افق نے ایک پندرہ روزہ اخبار 'نظم' کے نام سے جاری کیا جو عوام میں بہت مقبول ہوا کیونکہ افق نے اس اخبار کو محض خبر تک محدود نہیں کیا بلکہ ادب بھی ان کے پیش نظر تھا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس میں خبروں کو بھی منظوم طور پر شائع کیا جاتا تھا۔ خبر کو منظوم پیش کرنا چونکہ ایک انوکھا تجربہ تھا اس لیے لوگوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ افق کے اخبار 'نظم' ادب اور صحافت کا حسین امتزاج تھا۔

لاہور سے اخبار عام 1891 میں بمبئی سے سلطان الاخبار کے نام سے 1897 میں حکیم محمد عبدالحمید فرخ دہلوی نے جاری کیا جو 1934 تک جاری رہا۔ لاہور سے 1897 میں مولوی محبوب عالم کی نگرانی میں ایک روزنامہ 'پیسہ اخبار' نکالنا شروع کیا۔ ادھر دہلی سے روزنامہ اخبار 1897 میں منشی غیور احمد نے جاری کیا۔ اسی دور میں مختلف نوعیت کے کچھ اور اخبار جاری ہوئے جن میں تعلیمی اخبارات 10 مختلف شہروں سے نکلتے تھے۔ قانونی اخبارات پانچ کی تعداد میں پیشہ وارانہ اخبارات سات مختلف شہروں سے، خواتین کے دو اخبارات دہلی اور لاہور سے،

Scanned with CamScanner

8 تجارتی اخبارات کلکتہ، دہلی، آگرہ، انبالہ اور لکھنؤ سے شائع ہوتے رہے۔ طبی اخبارات بحر حکمت لاہور سے 1862 میں اور میڈیکل پیپر میرٹھ 1883 میں جاری ہوئے۔

کئی اخبارات اردو اور دیوناگری رسم الخط میں آمنے سامنے شائع ہوتے تھے۔ آب حیات (بنسی دھر) گیان پردیپ پتریکا (پنڈت مکندرام کشمیری) انوار الشمس، سایۂ پنجاب، منگل سماچار، خورشید جہاں، فیض عام، مطلع الانوار، اس زمانے میں کئی اخبارات ایسے تھے جو ہندی اور اردو میں، اردو اور مارواڑی میں اور اردو اور انگریزی میں ایک ساتھ نکلا کرتے تھے۔

اردو گائڈ (1858) ایک خاص نوعیت کا اخبار تھا، جو مولوی کبیر الدین احمد خاں کی ادارت میں نکلا کرتا تھا۔ اکمل الاخبار (1866) جسے حکیم محمود احمد خاں نکالا کرتے تھے۔ اس اخبار سے غالب کو خاص دلچسپی تھی۔ اخبار عام (1871) جس کا سرکولیشن 1893 میں دو ہزار سے زیادہ تھا۔ جب کہ لاہور کا مشہور انگریزی اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ کی صرف سو دو سو کاپیاں چھپتی تھیں۔ ہفت روزہ اودھ اخبار لکھنؤ سے 1874 میں منشی نولکشور کی ادارت میں جاری ہوا جو بعد میں روزنامہ ہوگیا۔ پنڈت رتن لال سرشار کا فسانۂ آزاد قسط وار اسی اخبار میں شائع ہوا۔ اودھ پنچ 1877 میں منشی سجاد حسین کی ادارت میں نکلا جو ہندو مسلم اتحاد کا علمبردار تھا۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ 1866 میں علی گڑھ سے شائع ہونا شروع ہوا۔ پیسہ اخبار جو ایک پیسے کا ملتا تھا، لاہور سے 1887 نکلنا شروع ہوا۔

19 مارچ 1857 کو صادق الاخبار دہلی نے کلکتہ کے 'گلشن اخبار' کے حوالے سے یہ خبر شائع کی تھی کہ 'گلشن اخبار' کلکتہ جہاد کی تبلیغ کے لیے مسلمانوں میں اشتہارات تقسیم کر رہے ہیں۔ 1857 کے واقعات مختلف ادیب و شاعر اور صحافیوں نے اپنے جذبات اپنے اپنے طور پر اپنے ادب پاروں میں پیش کیے ہیں اور جس بہتات کے ساتھ اس طرح کے لٹریچر وجود میں آئے وہ ہمارے ادب و صحافت کا بیش بہا حصہ ہیں۔ مختلف اخباروں نے بھی اپنی اپنی خبروں میں ان واقعات کو اپنے اپنے انداز میں پیش کیا ہے۔ اس طرح کے اخبارات میں نورِ مغربی دہلی، صادق

Scanned with CamScanner

الاخبار، دہلی اردو اخبار اور بمبئی سے کشف الاخبار خاص اور اہم ہیں۔ نور مغربی نے اپنے 21 فروری 1857 کے شمارے میں ایک خبر اس طرح سے شائع کی ہے:

"علاقہ اودھ میں ایک شاہ صاحب چند روز ہوئے وارد ہوئے تھے۔ مجذوبوں کی طرح بڑ میں یہ بات کرتے تھے کہ دیکھئے عنقریب انتقام لیتا ہوں۔ سب انگریزوں کو نکلوائے دیتا ہوں۔ عوام تو ذرا سی بات میں آجاتے ہیں۔ ایک ہجوم جلد ہی وہاں جمع ہوگئی۔ کپتان اور بڑے صاحب مہتمم شہر کی بھی تجویز ہوئی کہ ان کو اٹھا دینا مناسب ہے۔ خلقت کا ہجوم اچھا نہیں۔ شاہ صاحب کو فہمائش ہوئی کہ اپنا بوریا، بستر اٹھاؤ، یہاں سے چل دو۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہرگز نہ جاؤں گا بلکہ تم سب کو نکلوادوں گا۔ 16 فروری کو بہت ہشت ہشت ہوئی۔ آخر کار لڑائی کی نوبت پہنچی۔ شاہ صاحب کے ساتھی بارہ آدمی لڑنے کو تیار ہوئے۔ دو کمپنیاں ان کے مقابلے پر آئیں۔ بندوقیں مارنے لگیں۔ اس مار پیٹ میں لیفٹیننٹ ٹامسن صاحب بہادر 22 رجمنٹ کے سواروں کے دو صاحب اور زخمی ہوئے۔ چند سپاہی مارے گئے۔ شاہ صاحب کئی آدمیوں سمیت گرفتار ہوئے، باقی ساتھی بھاگ گئے۔"

20 ستمبر 1857 دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔ 21 ستمبر کو بہادر شاہ نے ہمایوں کے مقبرہ میں انگریزوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے، اس کی تصویر کشی کرتے ہوئے خواجہ حسن نظامی نے لکھا ہے:

"آہ! دہلی دربار کی نمائش گاہ میں داخل ہوتے ہی ایک تصویر پر نظر پڑی، جس میں بزم تیموری کی گل ہونے والی شمع ابوالظفر بہادر شاہ مقبرہ ہمایوں میں میجر ہڈسن کے ہاتھوں گرفتار کیے جارہے ہیں۔ پشت پر ہمایوں کا مقبرہ نظر آتا ہے جس پر کچھ عجیب دلگیر افسردگی چھائی ہوئی ہے۔ بہادر شاہ عبا پہنے ہوئے کھڑے ہیں، ہاتھ میں عصا ہے، چہرہ غم والم میں ڈوبا ہوا، بڑھاپے کا رنگ اور متحملانہ یاس کا عالم ہے، میجر ہیڈسن سرخ وردی پہنے بادشاہ کا دامن پکڑے کھڑے ہیں اور ان کے دو ہمراہی بادشاہ کی پشت پر نظر آتے ہیں۔ میجر ہیڈسن کی بے باکانہ جرأت پر بادشاہ کا ایک

Scanned with CamScanner

بوڑھا جاں نثار تلوار سوت کر لپکتا ہے، ہاتھ میں ڈھال ہے اور بشریٰ نڈھال۔ قریب پہنچتے پہنچتے برابر والا سولجر پستول سامنے کر کے اس کا بڑھا ہوا حوصلہ پست اور جوش انتوان سرد کر دیتا ہے۔ افسوس ہے کہ دنیا کے اس مصیبت خیز انجام پر بھی لوگوں کو اس کی ہوس باقی ہے۔ نمائش سے چلتے وقت وہیں دیوان حافظ کا خود بہ خود کھلا ہوا ایک ورق نظر پڑا جس کی پہلی سطر تھی:

آخر نظرے بہ سوائے ما کن

اے دولتِ خاص و حسرت عام "

انیسویں صدی کے درد و غم کی اس تصویر یا یوں کہہ لیجئے کہ ہندوستانیوں کی تقدیر کو اس وقت کوئی نہیں بدل سکا۔ انیسویں صدی کی اردو صحافت نے بھی نہیں البتہ بیسویں صدی کی صحافت، وطن کے دور اندیشوں کی سیاست اور محبان وطن کی جرأت نے ہندوستان کو بالآخر 15 اگست 1947 غاصب انگریز حکمرانوں کے ہاتھ سے آزاد کرا ہی لیا۔

☆☆☆

ڈاکٹر ابرار رحمانی

مدیر: آج کل، دہلی

Scanned with CamScanner

ہمیں یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی جیسی نابغۂ روزگار ہستی جس نے اردو زبان وادب کے فروغ کے لئے بے لوث و بے بہا خدمات انجام دیں، نیز اردو زبان و ادب کی مختلف النوع اصناف میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا، وہ بھلا ہمارے ناقدین و قارئین کی نظروں سے کس طرح اوجھل رہے۔ البتہ افق تاریخ کا ایک حصہ ضرور ہے لیکن ان پر ہماری نگاہ کم کم پڑتی تھی۔ ہمیں حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ ایک شخص جس نے صرف ۴۹ ربرس کی عمر پائی اور اگر اس کے بچپن کے ۹/۱۰ سال نکال دیئے جائیں تو صرف چالیس بچتے ہیں۔ انہوں نے ان چالیس برسوں میں نظم ونثر کا اتنا بڑا اور گرانقدر ذخیرہ کیسے چھوڑا۔ بلاشبہ ذہن سوچنے سے قاصر ہے۔ افق کی مطبوعہ کتابوں کی تعداد تیس تک پہنچتی ہے اور ابھی کئی کتابیں قلمی نسخوں کی صورت میں موجود ہیں، جو منتظر اشاعت ہیں۔ گویا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ افق لکھنوی نے اپنی عمر کا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا اور شب و روز تصنیف وتخلیق کے کام میں لگے رہے۔

افق لکھنوی دراصل ایک کثیر الجہات اور کثیر الصفات شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے جہاں شاعری میں جمال وکمال کی صفات پیدا کئے ہیں، وہیں نثر میں بھی اپنے فن کے جوہر دکھائے۔ افق کے شعری ونثری مطبوعات کا کینوس بے حد وسیع ہے جس میں طرح طرح کی گل کاریاں اور نیرنگیاں نظر آتی ہیں۔ قدرت نے افق کو گوناگوں صفات سے مزین کیا تھا۔ ان کے تخلیقی ابعاد و جہات، حرارت وحرکت اور تازگی وتابی دیکھ کر ذہن متحیر ہو جاتا ہے کہ کیا یہ کسی ایک فرد کا کارنامہ ہے؟ اس ضمن میں ڈاکٹر اطہر مسعود خان فرماتے ہیں:

''انہوں نے تن تنہا جتنا کچھ لکھا ہے، وہ انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی کوششوں کا نتیجہ لگتا ہے۔ ان کی ذات وشخصیات گویا ایک دبستان اور ادارہ کی حیثیت رکھتی ہے۔''

(منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی: حیات وخدمات، ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خان، نیا دور، لکھنؤ، ص: ۲۴)

افق لکھنوی نے اپنی تمام زندگی تصنیف وتالیف کے لئے وقف کر رکھی تھی۔ ابتدائے عمر سے انتہائے عمر تک افق فکر نظم ونثر میں اور انتظام تصنیف وتالیف میں مصروف رہے اور تنوع وتازگی

Scanned with CamScanner

کے ساتھ ادب کی مختلف اصناف میں اضافہ بھی کیا اور ضوباری بھی عطا کی۔ غزل، نظم، مسدس، رباعی، مثنوی، مخمس، قصیدہ، نوحہ، تاریخ گوئی جیسی اپنے زمانے کی مروجہ اصناف سخن میں انہوں نے طبع آزمائی کی۔ نثر کی جن اصناف میں ان کے آثار و نقوش ملتے ہیں، ان میں تاریخ نگاری، ڈراما نگاری، ناول نگاری، سوانح نگاری اور صحافت کے علاوہ صرف و نحو، لسانیات اور عروضیات جیسے اہم موضوعات بھی شامل ہیں۔ تراجم سے بھی افق کا گہرا انسلاک وارتکاز قائم تھا۔ تصانیف کے علاوہ افق نے متعدد کتابوں کے کامیاب ترجمے بھی کئے، جن میں رامائن بالمیکی، شریمد بھگوت گیتا، مہابھارت بے حد مشہور و مقبول ہیں۔ اس سلسلے کا سب سے بڑا اور اہم کام برٹن کی 'عربین نائٹس' کا ۱۶ جلدوں میں اردو ترجمہ 'الف لیلیٰ' ہے۔ ساتھ ہی 'رامائن یک قافیہ' بھی قابل ذکر ہے کہ اس میں ایک ہی قافیہ کو نظم کیا گیا ہے۔ افق نے اس مذہبی کتاب کا منظوم ترجمہ ۲۰ سال کی عمر میں کیا تھا جس میں ۱۳۰۰ اشعار اور ۵۰۰ محاورات ہیں۔ ترجمہ اتنا آسان اور عام فہم زبان میں ہوا ہے کہ اس پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔ زود گوئی اور تخلیقی کار ہنر ہر شخص کے حصے میں نہیں آتا جو معیار و مقدار دونوں لحاظ سے قابل توجہ ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ افق لکھنوی کا خانوادہ کئی پیڑھیوں سے شاعری اور نثر نگاری کا چراغ روشن کئے ہوئے تھا۔ افق کے خانوادے نے (پردادا منشی ادے راج مطلع سے منشی پورن چند ذرہ تک) فارسی اور اردو ادب کی دنیا میں اپنی زبان دانی، ادبی خدمات اور علمی سرگرمیوں کی وجہ سے نہ صرف اپنی شناخت قائم کر لی تھی بلکہ اپنے نقوش بھی مرتسم کئے تھے۔ ظاہر ہے کہ افق اس سے بچ نہیں سکتے تھے۔ حکمت و دانائی، قوت تحریر، فکری و ادبی صلاحیت، غیر معمولی علمی صلاحیت اور ہنرمندانہ استعداد انہیں وراثت میں ملی تھی لیکن افق نے اپنی ذہانت و فطانت اور صلاحیت و قابلیت کو مزید صیقل کر کے فکر و نظر اور احساسات و مدرکات کو پُر تاثر اظہار کا وسیلہ بنا دیا۔ افق لکھنوی کی طبیعت کمسنی سے ہی موزوں اور آزاد تھی، اس لئے تنوع اور تازگی ان کی تحریرات میں در آئی ہیں۔ افق نے اپنی نگارشات کے ذریعہ نہ صرف اپنا انفراد و اختصاص منعکس کیا ہے بلکہ ہماری بصیرت و بصارت میں ارتعاش بھی پیدا کیا ہے۔ تعقل و تدبر کی نئی فضا قائم کی ہے، غور و فکر کو نیا ذہن دیا ہے اور نئی جہات و ممکنات کے در کو وا بھی کیا ہے۔ تخلیقی خوب و زشت کی قدروں سے

Scanned with CamScanner

واقفیت، کلاسیک و جدید تر ادب کے خصائص کے علم اور استدراک و ہنر مندی نے افق کی تحریرات کو اپنے ہمعصروں میں زیادہ باوقار و با اعتبار بنا دیا ہے۔

افق لکھنوی کے منظوم و منثور کلام مذہبی رواداری، قومی یکجہتی، آپسی یگانگت اور گنگا جمنی تہذیب کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ ان کی زبان ہندی، سنسکرت اور انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو، فارسی اور عربی کا حسین امتزاج ہے۔ انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ نہ صرف اردو زبان و ادب کے کئی گوشوں کو منور کیا بلکہ ان تہذیبی رویوں اور قدروں کی بھی ترجمانی کی جن کے روشن پہلوؤں کے وہ خود گواہ تھے۔

افق لکھنوی اپنے عہد کے بہت بڑے شاعر تھے۔ انگریزوں کی آمد کے بعد ملک میں جو تہذیبی و لسانی انقلاب آیا جس نے اگر ایک طرف ترقی کی راہیں کھولیں تو وہیں دوسری جانب صدیوں پرانی تہذیبی وراثت و اقدار اور رشتوں کو مجروح ہی نہیں کیا بلکہ نقصان بھی پہنچایا۔ یہ صورت حال کسی بھی حساس اور ذی فہم قلمکار کے لئے تکلیف کا باعث ہو سکتی ہے۔ اس زمانے کے تمام علما، ادبا، شعرا، فصحا اور دانشوران نے اس وقت پیدا ہونے والی خرابیوں کی طرف عوام کی وجہ مبذول کرائی لیکن اپنی شاعری کے ذریعہ جس خوبصورت اور پُر تاثر انداز میں افق لکھنوی نے لوگوں کو اپنی جانب ملتفت اور متوجہ کیا، اس سے کسی صورت انحراف و انکار نہیں کیا جا سکتا۔

لکھنؤ اسکول کی پوری شعری روایات افق کے یہاں نظر آتی ہیں اور خصوصی طور پر ناسخ اور آتش کی فکر و نظر کی جلوہ طرازیاں ٹھاٹیں مارتی دکھائی دیتی ہیں۔ ناسخ نے جہاں زبان و بیان کی نوک پلک سنوارنے پر زور دیا، وہیں آتش نے احساس و جذبے کی ترجمانی کی اور ان دونوں کا خوبصورت امتزاج اگر دیکھنا ہو تو افق کی شاعری میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افق کی شاعری صرف عشق و عاشقی کے اظہار اور تفنن طبع کی چیز نہیں۔ اس کے ذریعہ اذہان و افکار میں تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔ افق نے اپنی شاعری سے یہی کام لیا۔ ایک عرصہ گزر جانے کے بعد بھی اس کی معنویت و ندرت، تازگی و تابانی، حرارت و حرمت اور اثر آفرینی و اثر خیزی میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ادبی اصناف کو نئے رنگ و آہنگ عطا کرنے والے شعرا و ادبا میں افق ایک خداداد شاعر ہیں۔

Scanned with CamScanner

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ الق لکھنوی نے مختلف اور متعدد اصناف سخن میں طبع آزمائی کی اور جس صنف سخن کے قلم رو میں قدم رکھا، وہاں اپنے گہرے نقوش چھوڑے اور کمال و جمال کی جھلک دکھائی۔ قادر الکلامی اور قادر البیانی ان کا اختصاص رہا۔ الق کے آفاق اتنے روشن اور ان کے تخلیقی افکار کے اتنے جہات و ابعاد ہیں کہ یہ تصفیہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان کے کس پہلو پر خامہ آرائی کی جائے۔ میں نے اپنی سہولت کے لئے الق کی رباعیات کا انتخاب کیا ہے کہ اس صنف میں بھی ان کے مسدسات کی طرح ان کے فنی و فکری اور تخلیقی جوہر نکھرے نکھرے نظر آتے ہیں اور اس میدان میں بھی وہ کسی سے کم تر نہیں۔

رباعی ایک مشکل صنف سخن ہے۔ یہ ایک ایسی اکائی ہے جس کے مصرعوں میں ایک خیال کو مسلسل تدریجی ارتقا کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ تدریجی ارتقا کی صورت یہ ہوتی ہے کہ پہلے مصرعے میں مناسب الفاظ کے ساتھ ایک خیال سے روشناس کرایا جائے، دوسرے اور تیسرے مصرعے میں اس کے خدوخال کچھ اور نمایاں کئے جائیں اور چوتھے مصرعے میں مکمل خیال کو ایسی برجستگی اور شدت کے ساتھ سامنے لایا جائے کہ سننے والا مسحور و متحیر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ گویا چوتھا مصرع رباعی کے کیف و سرور کا خلاصہ یا جوہر ہوتا ہے جس میں تمام تر کیف و سرور سمٹ کر آ جاتے ہیں۔ رباعی کا اختصاصی پہلو یہ بھی ہے کہ یہ ۲۴ مخصوص بحروں میں (شجرۂ اخرب اور شجرۂ اخرم) ہی کہی جاتی ہے۔

موضوعات کے اعتبار سے بھی رباعی بہت اہم صنف سخن ہے۔ ابتدا میں مذہب کے زیر اثر اس میں حمد و نعت اور توحید و منقبت کا ذکر ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ متصوفانہ خیالات و احساسات کے ساتھ معارف و حقائق کا بیان بھی ہونے لگا۔ اس کے علاوہ پند و موعظت اور فلسفہ و حکمت کے مضامین بھی اس میں نظم کئے جانے لگے۔ بعد ازاں عشق و مستی اور رند مشربی کے موضوعات نے بھی صنف رباعی میں جگہ پائی۔ اخلاقیات، انسانی اقدار، مذہبی رواداری، حب الوطنی، اصلاح معاشرہ، پند و نصائح، جبر و قہر، استحصال و انتشار وغیرہ جیسے موضوعات نے بھی رباعی کے دامن کو مالا مال کیا۔ لہٰذا رباعی میں وہ تمام موضوعات نظم ہوئے ہیں، جو غزل سے مخصوص ہیں۔ بعض اوقات تو صنف رباعی مضامین کے اعتبار سے غزل سے بھی زیادہ وسعت اختیار کر لیتی ہے۔

Scanned with CamScanner

افق لکھنوی نے صنف رباعی میں کتنی رباعیاں یادگار چھوڑی ہیں، اس کا مجھے صحیح علم نہیں ہے لیکن تلاش بسیار کے بعد مجھے ان کی ۵۰/۵۵ رباعیاں دستیاب ہوئیں۔ ان رباعیات کے مطالعے سے علم ہوتا ہے کہ افق کو رباعی کہنے کا ہنر بھی خوب خوب آتا ہے۔ انہوں نے اپنے احساسات وادراکات کو مختلف زاویے سے صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیا ہے۔ اپنی شاعرانہ ہنرمندی و فنکاری سے افق نے نہ صرف اسے وسیع ورفیع کیا بلکہ اپنے علمی کمال اور وہبی جمال سے رباعی کو ضو بار و مشک بار بھی کیا ہے۔ مزید یہ کہ اپنی فکری وفنی دسترس کا کمال بھی رباعیات میں دکھایا ہے۔

افق لکھنوی کی رباعیات موضوعاتی اعتبار سے بوقلموں اور رنگا رنگ ہیں۔ انہوں نے رباعیات کے مضامین وموضوعات کو متنوع اور متمول کیا ہے اور اسی تنوع اور رنگا رنگی کے سبب ان کی رباعیات دعوت مطالعہ وفکر دیتی ہیں۔ افق کی رباعیات میں جہاں مذہبی موضوعات بیان ہوئے ہیں، وہیں سماجی موضوعات پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے۔ فلسفیانہ مسائل کو بھی موضوع بنایا گیا ہے، نئے دور کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا شاعرانہ بیان بھی موجود ہے اور انسانی نفس کے علاوہ صوفیانہ خیالات کو بھی نظم کا پیراہن عطا کیا گیا ہے۔ افق کی رباعیات میں اگر ایک طرف ایثار وقربانی اور قومی یکجہتی کے جذبے کا اظہار ملتا ہے تو دوسری طرف سماج میں پھیلی افراتفری، قتل و غارت گری، اخلاص و اخلاق کی پامالی، اضطراب و اضمحلال اور رشتوں میں انحطاط و انجماد کی تصویریں بھی منعکس ہوتی ہیں۔ ان کی رباعیات میں اگر میر انیس کا پرتو جھلکتا ہے تو حالی کی شاعری اور شاعرانہ افکار کا عکس بھی نمایاں ہے۔ غرض یہ کہ موضوعات کا ایک سیل رواں ہے جو افق کی رباعیات میں موجزن ہے، جن کی روشنی میں یہ بات بغیر کسی تامل وتردد کے کہی جاسکتی ہے کہ افق لکھنوی رباعی گویوں کی فہرست میں بھی عزت واحترام کے مستحق ہیں۔

افق لکھنوی مذہب کی اہمیت وافادیت کے قائل ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ خوب صورت اور کامیاب زندگی کے لئے اچھے معاشرے اور اچھے ماحول کی تعمیر مذہبی اقدار کے بغیر ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ افق نے اپنی رباعیوں کے ذریعہ ہندوستانیوں کے مابین محبت واخوت، اتحاد واتفاق اور رواداری وہم آہنگی کی خوب صورت فضا قائم کی ہے۔ افق کہتے ہیں:

Scanned with CamScanner

مولیٰ لامذہبی سے انساں کو بچائے　　نفرت نہ کسی دین سے ہونے پائے
مذہب پہ رہو افق ہمیشہ قائم　　سمجھے رہو جان جائے ایمان نہ جائے

ہر ایک کے وعظ و پند سے کھولو کان　　سمجھاؤ نفاق باہمی کے نقصان
کام اپنا کرو اُفق کسی کی نہ سنو　　بکنے دو انہیں جو حلق کے ہیں دربان

ہمدردیٔ قوم سے تنفر یارو　　اتنی تو نہ ہمت اپنی ہارو
عقبیٰ کو مٹا رہے ہو دنیا کے لئے　　دانستہ بہشت پر نہ لاتیں مارو

سمجھا بھائی کو صرف بھائی ہم نے　　بھولے سے بھی نہ کی بھلائی ہم نے
اور اس پہ ہے ناز حب قومی افسوس　　مسجد اک اینٹ کی بنائی ہم نے

یہ رباعیات مذاق سلیم کو ایک عجیب سرشاری کی کیفیت سے دوچار کرتی ہیں اور ہم ایک ایسی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں، جہاں محبت والفت کا دریا موجزن ہے۔

افق لکھنوی نے ہندوستان میں عجیب انتشار و خلفشار کے مناظر اور منقلب کیفیتیں دیکھیں، جن سے فرار حاصل کرنا ان جیسے حساس اور ملتہب شاعر کے لئے ممکن نہ تھا۔ ایسے میں یہ ان کی ذمہ داری بن گئی تھی کہ وہ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب واقدار کو وقت کے سرد وگرم اثرات سے بچائیں۔ افق نے اپنی رباعیات کے ذریعہ اپنے وطن سے پوری طرح وفاداری کا ثبوت دیا اور اخلاقی واصلاحی مضامین انتہائی کامیابی کے ساتھ پیش کئے:

ہمدردیٔ قوم سے نہ ہمت ہارو　　جس طرح ہو سب سے پہلے مہرہ مارو
لے لو اپنی جان تک بیچ کے مول　　سودا یہ خدا کی راہ کا ہے یارو
طامع کا عدوئے جانگزا ہے لالچ　　انسان کے حق سنکھیا ہے لالچ
ہوتے ہیں بشر افق طمع سے بدنام　　لالچ ہے بُرا، بُری بلا ہے لالچ

Scanned with CamScanner

جو لوگ زباں چلا کے ہر ایک جگہ — کرتے ہیں درست حالت قوم تباہ
ایسے ہمدرد صاحب مال افق — پنساری بنے ہیں لے کے ہلدی کی گرہ

تیشہ کھایا جو بڑھ گئی شاخ شجر — ڈنٹھل نے جو سر اٹھایا کھایا نشتر
سرکش جو ہے لازم ہے اس کو پستی — نیچا دیکھا افق بڑے بول کا سر

عالم ہو تو اپنی طبع عالی سمجھو — کامل ہو تو اپنی باکمالی سمجھو
تاریخ مراتب بزرگانِ قدیم — تقویم گزشتہ سالِ والی سمجھو

غور کیجیے تو ان رباعیوں میں اخلاقی درس کی کارفرمائی اور پند و نصائح کا صالح جذبہ جلوہ گر ہے۔

افق نے اپنے غیر معمولی مشاہدۂ حیات اور مطالعۂ کائنات سے حاصل شدہ تجربات کو اپنے معاصرین اور آنے والی نسلوں میں منتقل کر دیا ہے۔ خیالی دنیا کی پرچھائیوں کے بجائے حقیقی دنیا کے نقوش اُبھارے ہیں:

دل لیت جو قوم کی تجارت پر ہوں — بے زر جو ہیں گل کی طرح اہل زر ہوں
بازار تونگری ہو گرم اپنا افق — سوداگری دور کر کے سوداگر ہوں

بھائی کی طلب کبھی نہ اصلاً دیکھی — سمجھے نہ بھلی کسی کی دیکھا دیکھی
ہمدردی باہمی نہ کی تو نے افق — دنیا میں کبھی نہ جاتی دنیا دیکھی

آزار نہ کوئی پالنا ہی اچھا — ہر طرح بلا کو ٹالنا ہی اچھا
دور اپنے مخالفوں کو رکھنا بہتر — فاسد خون کو نکالنا ہی اچھا

تاریخی تعمیر و تخریب کے تصور کو بڑی وضاحت و فصاحت کے ساتھ افق نے پیش کیا ہے۔ انہوں نے اخلاقی و اصلاحی درس کے رموز و نکات کے خوب صورت مرقعے کھینچے ہیں اور حسین گلدستے سجائے ہیں جو

Scanned with CamScanner

فکر و تخیل کے حامل ہیں۔ مطالعے کے دوران حظ و بہجت کا احساس ہوتا افق لکھنوی ہندوستانیت اور انسانی قدروں کے معراج کے دلدادہ ہیں۔ وہ حب الوطنی کے نشہ سے سرشار ہیں۔ انہوں نے نہ صرف عوام کو بیدار کیا بلکہ وطن کی محبت کا درس دیا اور ہند کی عظمت رفتہ کے نقوش احساس تفاخر سے ہویدا کئے۔ کہیں کشمیر اور دہلی کی محبت کا راگ الاپا ہے تو کہیں ہمالہ کی عظمت و افضلیت کے گن گائے ہیں:

ہندوستاں گھر جہاں پناہی کا ہے ماتھے پہ اسی کے فخر کا ٹیکا ہے
عظمت کا ثبوت قدرتی ہے یہ افق اوپر ہے ہند نیچے امریکا ہے

دنیا میں کہیں جواب کب ہند کا ہے جو جاہ ہے جو تزک ہے سب ہند کا ہے
سب خلد کے یاں آ کے مزے لوٹتے ہیں برحق جنت نشاں لقب ہند کا ہے

ہمالہ کے حوالے سے رباعیات دیکھیں:

حوروں کی طبیعت اس پہ لوٹی دیکھی وسعت میں بہشت اس سے چھوٹی دیکھی
سر ہند سے ہو گیا فلک نیچا جس وقت ہمالیہ کی چوٹی دیکھی

اور اب یہ رباعی دیکھیں:

فردوس نظیر ہے خطاب کشمیر دہلی ہے قدیم مرکز تخت و سریر
مشہور ہے لچھمیں کا گھر ملکِ دکن مشرق سے افق ہے جلوۂ مہر منیر

افق لکھنوی کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے لکھنوی محاوراتی زبان، رسیلی تراکیب اور چست بندش کے ساتھ روزمرہ کا وہ جمال فراہم کر دیا ہے کہ ان کی انفرادیت کا اعتراف ہمارے لئے لازمی امر بن جاتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ افق لکھنوی زبان و بیان کے رمز شناس ہیں۔ تشبیہات و استعارات، تلمیحات و تمثیلات اور محاورات و امثال کے استعمال پر انہیں قدرت حاصل ہے۔ علاوہ ازیں افق نے اپنی رباعیات میں ہندی لفظیات و تراکیب کا استعمال نہایت چابک دستی سے کیا ہے۔ انہوں نے ہندی الفاظ کو اردو سے کچھ اس طرح شیر و شکر کر دیا ہے کہ انہیں الگ کرنا محال ہے۔ ان کی رباعیات میں ہندی لفظیات کی نیرنگیاں، عجیب و غریب مزاج و منہاج کا پتہ دیتی ہیں جو اگر نایاب نہ سہی تو کمیاب ضرور ہیں۔ آیئے دبستان لکھنو کی زبان کا

Scanned with CamScanner

لطف، محاورے کی کرشمہ سازی اور ہندی کی آمیزش کا لطف اُٹھائیں:

اجداد کے علم و فن کے اب تک ہیں نشان — پڑھنے لکھنے کا ہم کو لیکن نہیں دھیان
ہے اہلِ قلم میں یہ لیاقت کی کمی — افسوس کہ اونچی دکان پھیکا پکوان

یوں ہی جو رہے گا عقل و ادراک سے بیر — سمجھیں گے جو ہم عزیز و ہمدرد کو غیر
اک روز ذلیل ہوں گے کچھ شبہ نہیں — بکرے کی ماں منائے گی کب تک خیر

لاکھوں کی رقم خرچ جو فرماتے ہو — دم بھر کا مزہ شراب سے پاتے ہو
اے فخرِ برادرانِ مے خوار افسوس — مسجد ایک اینٹ کے لئے ڈھاتے ہو

صہبا جو بزرگ نوش فرماتے ہیں — اولاد کو مے پلا کے گرماتے ہیں
افسوس صد افسوس حیف صد حیف افق — گیہوں کے ساتھ گھن پسے جاتے ہیں

نفرت جنھیں اقربا سے ہو دیکھئے سیر — دنگا کریں قوم سے جاں کے بغیر
کیا الٹی سمجھ ہے واہ کیا خوب ہے عقل — دریا میں رہیں، کریں مگرمچھ سے بیر

جس نے ہم قوم سے عداوت ٹھانی — کی اس نے حماقت، اس نے کی نادانی
سمجھ رہے خوب اے افق وہ یہ مثل — مارے لاٹھی جدا نہ ہوگا پانی

سر اپنے جو علم و فن کا ٹیکا ہوتا — گھر ہر گھر میں نہ مفلسی کا ہوتا
تکمیل جو علم و فن میں ہوتی ہم کو — ممکن کیا تھا جو بال بیکا ہوتا
بھوکا کوئی قوم میں ہے کوئی ننگا — جھگڑا ہے کہیں، کہیں لڑائی دنگا
اصلاح نہ ہم سے ہو سکی کچھ لیکن — جب دیکھئے تب بہائی الٹی گنگا

Scanned with CamScanner

افق لکھنوی نے ان رباعیات میں جو کمال قدرت کے ساتھ اپنا ادبی جوہر دکھایا ہے، محاوروں کو دلکش اور دل پذیر انداز میں شعری جامہ پہنایا ہے اور فن کی غواصی میں فکر کے ایسے نادر موتی لائے ہیں کہ آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں اور ان کی ہنرمندی کی بے ساختہ داد دینی پڑتی ہے۔ افق کی زبان میں روانی، برجستگی، شستگی اور سادگی بلا کی ہے۔ نیز جذبات نگاری، تخیل کی پرواز، چست تراکیب، لفظوں کے برمحل استعمال پر افق کو ید طولیٰ حاصل ہے۔

افق لکھنوی کی رباعیات اپنے موضوعات کے تنوع کے سبب قابل مطالعہ ہیں۔ ان میں قاری کیلئے فکری گہرائی ہے اور فنی پختگی بھی۔ یہ رباعیات نہ صرف افق کے خیالات و جذبات اور فلسفہ و فکر کے مظہر ہیں بلکہ ان کے تجربات و مشاہدات کے امین بھی اور ان کی شعور و آگہی کی ضوباریت کا اعلانیہ بھی ہیں۔ ان کی رباعیات میں جو تجربات کی دنیا آباد ہے، حقیقی بھی ہے اور تصوراتی بھی۔ اس سے افق کے مزاج و منہاج سے ہمیں آگاہی ہوتی ہے۔

افق کی افق تابی کے لئے ضروری ہے کہ ان پر ڈسکورس قائم ہو اور ان کی تمام تخلیقات کا محاسبہ و محاکمہ کیا جائے تاکہ ان کی تخلیقیت کے کلیدی آفاق روشن ہو سکیں۔ ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ افق کے نثری و شعری کارناموں کے کچھ حصوں کو نصاب میں داخل کیا جائے تاکہ افق شناسی کے باب روشن ہو سکیں۔ جامعات میں افق کے حوالے سے تحقیقی و تنقیدی مقالے لکھے جائیں تاکہ دور ماضی میں کی گئی کوتاہیوں کا ازالہ بھی ہو سکے۔ افق کے علمی و ادبی اور شعری و نثری اکتسابات و مدرکات کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ کسی ایک مقالے میں اس کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔

افق لکھنوی کے گرانقدر سرمایے کی حفاظت کی ذمہ داری ہم پر ہے۔ چنانچہ اہل فکر و نظر، صاحبانِ حل و عقد اور ارباب علم و دانش اگر اس کی طرف سنجیدگی سے توجہ کریں تو موجودہ و آئندہ نسل ان کے علمی و ادبی کارناموں سے مزید استفادہ کرے گی اور تازہ بہ تازہ نو بہ نو پہلوؤں کی بازیافت کا عمل بھی جاری ہوگا۔

☆☆☆

ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی، شعبۂ اُردو، مولانا آزاد نیشنل پی۔ جی۔ کالج، کلکتہ

Scanned with CamScanner

علم البشریات کے نقطۂ نظر سے بنی نوع انسان نے جتنے بھی معتقداتی تصورات کی تشکیل کی ہے، ان میں سب سے زیادہ ہمہ گیر تصور مذہب ہی کا رہا۔ چنانچہ دورِ قدیم سے لے کر آج تک تمام انسانیت مذہب ہی سے جڑی رہی ہے۔ اور کیوں نہ ہو کہ مذہب انسان کا فطری داعیہ ہے اور وہ کسی نہ کسی صورت میں انسان کے اندرون میں ضرور نمو پاتا ہے۔ یہ عقیدت کا ایسا منبع ہے جو کبھی خشک نہیں ہوتا۔ اور اپنے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں دونوں کو فیض یاب کرتا چلا جاتا ہے۔ مذہب ایسا عقیدہ ہے جو دل و دماغ دونوں کو اپیل کرتا ہے۔ اس کی شاہ راہ پر دونوں کا سفر سریع اور سہل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب ہر زمانے میں ادب کے لیے سرچشمۂ الہام رہا۔ دنیا کی بیشتر زبانوں کے ادب نے اسی کے زیرِ سایہ اپنی قوت نمو کو آزمایا ہے۔ مذہب و ادب کے اس رشتے کی تصویر کا دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ مذہب کو جاذبِ توجہ اسلوب میں سمجھانے کی کوشش ادب ہی سے ممکن ہوئی ہے اور مذہب سے تحریک پا کر ایسا ادب کلاسکی ادب کے اعلیٰ مقام پر پہنچا ہے۔ چاہے وہ 'رامائن'، 'مہابھارت' ہوں یا 'ٹروزن وار' 'پیراڈائیز لاسٹ' ہو یا 'مثنوی مولانا روم' انھیں، ان میں موجود مذہبی فکر نے ہی کلاسک کا درجہ عطا کیا ہے۔

جہاں تک اردو شعر و ادب کا تعلق ہے تو اس کی نشو و نما ہی مذہبی فضا میں ہوئی۔ صوفی، سنتوں کے مذہبی افکار نے ان کی آب یاری کی اور یہ پودہ پروان چڑھتا رہا۔ اسکی سرشت میں مذہبی عنصر کی فراوانی تھی، اس کی وجہ سے مذہبی رواداری اور جذباتی ہم آہنگی کو اردو ادب نے فروغ بخشا اور قومی یکجہتی کو استحکام نصیب ہوا۔ چنانچہ صوفیانہ تحریک کے بعد بھی اردو ادب برسوں مذہب سے جڑا رہا اور آج بھی اردو ادب مذہب کو فراموش نہیں کر رہا ہے۔

انیسویں صدی میں اگرچہ مذہبی رجحان میں کمی واقع ہو گئی تھی اور مادیت اور لذت پرستی کو فروغ حاصل تھا۔ ہندی میں 'بھکتی کال' ختم ہو گیا تھا اور 'شرنگارک ساہتیہ' لکھا جانے لگا تھا۔ 'کام بھاؤ کتا' اور 'ولاس سادھنا' کو ہندی ادب میں ترجیح دی جانے لگی تھی۔ اردو

Scanned with CamScanner

شاعری کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ ایہام پسندی کے ذریعہ ذو معنی الفاظ کے استعمال کو روا رکھا جا رہا تھا۔ سماج میں تعیش پسندی کے نا آسودہ حالات میں ذہنی آسودگی کے لیے ایہام گوئی شاعری میں مقبول تھی مگر مذہبی ادب پھر بھی لکھا جا رہا تھا۔ توریت اور بائبل کے اردو۔ ہندی ترجمے ہو رہے تھے، قرآن مجید کے ترجمہ اور تفسیریں لکھی جا رہی تھیں۔ رمائن اور مہابھارت کے قصوں کو ہندی اور اردو میں منظوم کیا جا رہا تھا۔ تمل، کنڑ اور بنگالی ادب کی بھی کم و بیش یہی حالت تھی۔ بھارتیندو ہرش چندر جہاں ہندو دھرم اور ہندو افکار کی ترویج کے لیے اپنی زبان و قلم استعمال کر رہے تھے وہاں اپنے رسائل میں قرآن اور بائبل کے ترجمے بھی شائع کر رہے تھے۔ ادھر سرسید اور ان کے رفقاء قرآن مجید کے تراجم کر رہے تھے۔ سرسید تحریک سے ہٹ کر فورٹ ولیم کالج کے زیر اہتمام مرزا کاظم علی جواںؔ نے شکنتلا ناٹک لکھا تھا اور مولوی امانت اللہ شیداؔ قرآن مجید کا ترجمہ کر رہے تھے۔ ہندی میں ''نجِ دھرم، کرم'' کی باتیں حب الوطنی کا عنصر لیے ہوئے تھیں تو اردو میں مذہبی عنصر تعیش پسندی کی نذر ہوتا جا رہا تھا۔ روحانیت اوور مادیت کی ایسی کشمکش کے ماحول میں دوارکا پرشاد افقؔ ۱۳ جولائی ۱۸۶۴ء کو لکھنؤ کے محلہ نوبستہ میں پیدا ہوئے۔ گھر کا سارا ماحول شعر و ادب کا تھا اس لیے افقؔ کی طبیعت کو یہ ماحول راس آ گیا اور بچپن ہی سے انھوں نے اردو شاعری سے اپنا ناطہ جوڑ لیا۔ افقؔ کا سارا خاندان مذہبی تھا۔ ان ہی افکار نے افقؔ کی تقدیسی شاعری کو جلا بخشی اور انھوں نے ایک دو نہیں، مذہبی عقیدت کی حامل دس دس کتابیں تصنیف کر لیں اور بعض کتابوں کے منظوم و منثور تراجم بھی کر ڈالے۔ 'رامائن یک قافیہ'، 'رامائن مسدس'، 'شری رام ناٹک'، 'کرشن شدا ما ناٹک'، 'سناتن دھرم پرکاش' اور 'سوانح عمری گروگووند سنگھ' ان کی تصانیف ہیں جبکہ 'رامائن بالمیکی'، 'مہابھارت'، 'شری مد بھگوت گیتا'، 'شری درگا درشن' وغیرہ ان کے اردو تراجم ہیں۔

بالعموم کہا جاتا ہے کہ عقیدت کی شاعری شعریت سے عاری ہوتی ہے۔ اس میں حسنِ شعری کو تلاش کرنا عبث ہے۔ یہ خیال کسی کمزور معتقدانہ شعری تصنیف پر ہو سکتا ہے کہ صادقؔ

Scanned with CamScanner

آجائے۔مگر یہ ہر تقدیسی شاعری پر بطور کلیہ لازماً تھوپا نہیں جاسکتا۔دوارکا پرساد افقؔ کی تقدیسی شاعری پر بھی یہ کلیہ اپنے مثبت نقوش مرتسم نہیں کرسکتا۔ہم بطور مثال ان کی تخلیق کردہ ''شری رام ناٹک'' کو لے سکتے ہیں۔ناٹک اردو ڈرامہ کی ابتدائی صورت ہے۔سماج میں مذہبی شعور پیدا کرنے کا یہ ادبی وسیلہ افقؔ کے زمانے میں نیا نیا تو تھا مگر نہایت مقبول رہا۔امانت کی ''اندر سبھا'' اور قیصر باغ اسٹیج پر کھیلے جانے والے ''رہس'' اس زمانے میں کافی مقبول تھے۔ممبئی کے گرانٹ روڈ پر انگریزوں اور پارسیوں نے اپنے تھیٹر قائم کر لیے تھے، جہاں مذہبی رجحان کو بڑھاوا دینے کے ساتھ عوام کی دلچسپی اور ان کی تفریح کے لئے ڈرامے اور ناٹک کھیلے جاتے تھے۔اسی زمانے میں بہرام جی فریدوں جی کا ڈرامہ ''خورشید'' اور راجہ گوپی چند'' کافی مقبول رہے۔ڈرامہ کی تکنیک کے نقطۂ نظر سے ''خورشید'' اردو کا اولین ڈراما تسلیم کیا جاتا ہے۔اس وقت ہندی میں بھارتیندو ہرش چندر کے مذہبی اور تاریخی ڈرامے بھی کافی پسند کیے جارہے تھے۔تفننِ طبع کے لیے اپنائے جانے والے ناٹک کے فن کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے دوارکا پرساد افقؔ نے بھی ایک ڈراما ''شری رام ناٹک'' کے عنوان سے لکھا تھا مگر تضیعِ اوقات اور تخریبِ اخلاق اس کا مقصد ہرگز نہیں تھا۔ ناٹک کے مزاج کے مطابق افقؔ نے اس میں روایتی انداز میں منظومات اور منظوم مکالمے (ڈایلاگ) بھی شامل کئے۔ان منظومات میں وارداتِ ڈراما کے مطابق خیال و معنی آفرینی پر فنکارانہ انداز میں توجہ دی گئی ہے۔مثلاً راون کو سیتا کو اغوا کر لینا اور کٹیا میں رام و لکشمن کا سیتا کو نہ پا کر بے چین ہو جانا۔اس بے چینی کی حالت کو افقؔ نثر میں یوں بیان کرتے ہیں۔

''اے جنگل کے برکشھو! تم نے جنک بنس کی کلپ لتا کہیں دیکھی؟
آہ! جس برکھش پر میرے من کا پنچھی بسیرا لیتا تھا، وہ آج یہا
ں سے اکھڑ گیا۔میری زندگی کی جڑ کٹ رہی۔تمھیں اپنے پھولوں
اور پھولوں کی سوگند، پتا تو بتا دو۔اے بن کے ہرنو، کی پیاری
ہرنیوں! تم میں سے کسی کو سیتا ہرن کی خبر ہو تو بتا دو۔۔۔۔وغیرہ''

Scanned with CamScanner

رام کی اس بیتابی سے لکشمن بھی بے چین ہو جاتے ہیں اور پس منظر میں یہ گیت سنائی دیتے ہیں۔

گئیں سیتا نہیں معلوم کہاں رو رو کر — پیچھے دشمن کے پڑا ہاتھ نہ کوئی دھو کر
نوکِ مژگاں نہ جنبہ ہوا خارستاں میں — روکا جھاڑی نے بھی ظالم کو نہ کانٹے بو کر
الجھی سنبل بھی نہ زلفوں کی ترفداری میں — سروں نے بھی پئے قامت نہ لگائی ٹھوکر
عوض ان آنکھوں کے اٹھا نہ ہرن بھی کوئی — نہ لڑے دیدۂ نرگس بھی مقابل ہو کر
بوئی سوسن بھی دہن کی نہ ہوا خواہی میں — نہر کی لہروں نے بھی غم نہ کیا رو رو کر
اے افق ہوش میں دشمن کو اسے لانا تھا — کی بڑی سبزۂ خوابیدہ نے غفلت سو کر

اسٹیج پر پیش کردہ ''سیتا ہرن'' کے منظر کی مناسبت سے یہ نظم، واقعہ ساری جزئیات کو شعری پیکر میں پیش کرتی ہے۔ بحیثیت شاعر افق نے منظر کشی میں محاکاتی روح سمودی ہے۔ شاعر کے اس وطیرے سے ''شری رام ناٹک'' کی اثر آفرینی میں اضافہ ہوا ہے۔

سیتا، رام اور لکشمن اجودھیا سے جنگل کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ باپ کے حکم کی پاسداری میں ان کا شوق بڑا دیدنی ہے۔ افق نے اس واقعہ کی منظر کشی میں اخلاقی پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

برائے دشت گردی بخت کے چکر سے جاتے ہیں — رہو تم شاد اے اہل وطن ہم گھر سے جاتے ہیں
ملالِ دشت گردی کیا، غمِ صحرا نوردی کیا — کہ ارشادِ پدر سے، مرضی مادر سے جاتے ہیں
نوید اے خارِ صحرا مژدہ اے دشواریِ منزل — کہ ہم رہروِ وفاداری میں چشم و سر سے جاتے ہیں

''شری رام ناٹک'' کی یہ دونوں نظمیں ڈراما نگاری افق کی شاعرانہ شخصیت کو ان کے پورے خدوخال کے ساتھ متعارف کراتی ہیں۔

''رامائن'' کو ناٹک، 'رہس' یا ڈرامے میں پیش کرنے کی اس ادبی روش' کے علاوہ افق کے عہد میں رامائن کے اردو تراجم بھی ہونے لگے تھے۔ چنانچہ پرمیشر دیال شرما کا ترجمہ رامائن بالمیکی، دوارکا پرساد افق کا 'مکمل رامائن بالمیکی'، منشی شنکر دیال فرحت کا 'رامائن منظوم'، بانکی بہاری

Scanned with CamScanner

لال کا 'رامائن بہار'، منشی سورج نرائن مہر کا 'رامائن مہر'، ...

یادگار ہیں۔ افق نے البتہ ایک ہی رامائن کو تین طرح سے ترجمے میں ڈھالا ہے۔ 'شری رام ناٹک'، 'مکمل رامائن والمیکی' اور 'رامائن یک قافیہ'۔ رامائن یک قافیہ ترجمہ نہیں افق کی اپنی تخلیق ہے اور گیارہ سو اشعار پر مشتمل ہے۔ اتنی طویل نظم کو ایک ہی قافیہ اور ایک ہی بحر و زن میں پیش کرنا نہایت مشکل امر ہے۔ یہ طویل نظم ان کی تبحر علمی اور فن پر مکمل گرفت کی دلیل ہے۔ رامائن کے سارے قصے کو انھوں نے اپنے اشعار میں بیان کر دیا ہے۔ ان کے معاصر شعرا کے یہاں رامائن پر اس قسم کی کوشش کرنے کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس پر طرفہ یہ کہ سادہ اور سپاٹ زبان کی بہ نسبت انھوں نے لکھنؤ کی فصیح زبان کو ترجیح دی اور محاوروں کا جا بجا استعمال کیا۔ 'رامائن یک قافیہ' کو افق نے ۱۸۸۶ء میں مکمل کیا تھا۔ "رام رگھو کل، کبت رگھوکل، بھان رگھ کل چندر ماں" سے تاریخ تصنیف برآمد ہوتی ہے۔ شاعر اس نظم میں شری رام چندر جی کا سراپا یوں بیان کرتے ہیں۔

دل کی خواہش ہے کہ رگھ بر کا سراپا ہو بیاں — کھینچتا ہے رام کی تصویر یوں کلکِ رواں
نور کی تصویر سر سے پاؤں تک ہیں رام چندر — سانولی صورت پہ سب کو مردمک کا ہے گماں
کان میں کنڈل مکٹ سر پر تلک زیب جبیں — مال دے جھلتی گلے میں ہاتھ میں تیر و کماں
وہ جبیں جس سے ہے چند کے تلک کی آبرو — وہ جبیں جس نے بڑھائی خور کی تو قیر و شاں
وہ بھویں جنکے اشارے سے لکھن نے دشت میں — سپ نکھا کی ناک کاٹی لے کے شمشیر رواں
وہ پلک جو جانکی کے واسطے رہتی ہے فرش — مردمک وہ جس سے ہم آغوش رہتی ہیں رماں
آنکھ وہ جس نے شری سیتا کو دیکھا باغ میں — جانکی کے ہجر میں جس سے رہے آنسو رواں

اس سراپا کے ہر شعر میں شاعر نے عضوِ بدن کے وصف کو رام چندر جی کے کسی نہ کسی واقعہ سے جوڑنے کی سعی فرمائی ہے، جس کی وجہ سے یہ سراپا محض خیال آرائی نہ رہ کر تاریخی حقائق کا منظر نامہ بن گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں صنعتوں کے استعمال نے شعری حسن میں اضافہ کیا ہے تشبیہات و استعارات اور مناسبات لفظی نے اشعار میں جان ڈال دی ہے۔ رامائن کے تہذیبی پس منظر کا خیال رکھتے ہوئے افق نے اس طویل نظم میں بعض جگہ دانستہ طور پر ہندی الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ یہ ان

کی مجبوری یا اردو کی تہی دامنی نہیں بلکہ معنی آفرینی اور رامائن کی تہذیبی روح کو بطور خاص سمجھنے کے لیے شاعر نے اس دو طیرے کو روا رکھا اور اسے صحیح سمجھا۔

رامائن یک قافیہ میں افق نے فطرت کی منظر کشی بھی انوکھے انداز میں کی ہے۔ ایسی منظر کشی میں ہندوستانی سماج کی تہذیب و ثقافت کی جھلکیاں بھی موجود ہیں۔ مثلاً صبح کی منظر کشی کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

نور کا تڑکا ہوا جب بولی مرغِ نغمہ خواں — نورِ قدرت کی تجلی دیکھ اے چشمِ جہاں
وقت آ پہنچا طلوعِ آفتابِ شرق کا — جانکی بطنِ سبو سے ہونے والی ہے عیاں
پھولنے کو ہے کنول کا پھول نافِ بشن سے — ہونے والے ہیں کنول کے پھول سے برہما عیاں
ہے کرن ہونے کو روشن چہرۂ خورشید پر — باندھنے والے ہے سہرا رام رگھو کل چنداں
برگِ اشجارِ گلستاں نے بجائے جھانجھ دف — کھول کر پڑھنے لگے بھنورے کنول کی پتھیاں
شنکھ بجتا تھا چنگی تھی جو سر بستہ کلی — تھا سرِ قطراتِ شبنم سے قدم بوس آسماں

صبح کے اس سہانے وقت میں جانکی (سیتا) باغ کی سیر کو آتی ہیں۔ نسیم نے اپنی مثنوی "گلزارِ نسیم" اور میر حسن نے "مثنوی سحر البیان" کے علاوہ دکن کے بعض مثنوی نگاروں نے شہزادیوں کی سیرِ گلشن کو نہایت مؤثر انداز میں بیان کیا ہے مگر افق کے یہاں جانکی کی سیرِ چمن کا انداز کچھ اور ہی تیور دکھاتا ہے۔

جانکی جی بھی اسی مطلب سے آئی باغ میں — پاک دامانی جلو میں تھی، حیا تھی ہم عناں
یاسمین رخ یاسمن بر سنبلیں مو سروقد — نرگسیں دیدہ سمن لب گل بدن غنچہ دہاں
وصف سوسن کے سخن بنتی تھی دانتوں کی مسی — کلمۂ تعریف گل بنتے تھے لب کو رنگِ پاں

Scanned with CamScanner

عطرِ گل سونگھا، نظر کی، پوششِ طاعوس پر　　پائی گلشن کی ضیا، دیکھے لبِ ملوطی کے پاں
سرمہ، چشمِ غنچۂ نرگس کا، سوسن کی مسی　　طوقِ قمری غازۂ برگِ نہالِ بوستاں

سیرِ چمن کی اس پوری روداد میں شاعر نے جانکی کی خوب صورتی کو بیان کرنے کے لیے اجزائے چمن ہی سے تشبیہات واستعارات چنے ہیں۔اس سے حسن سراپائے جانکی کو ایک نیا زاویۂ نگاہ ملا ہے۔افقؔ نے 'رامائن یک قافیہ' ۱۸۸۶ء مکمل کی تھی۔یہ زمانہ شاعر کے عنفوانِ شباب کا تھا۔اس لیے حسن وعشق کے بیان میں ان کے یہاں ذہن وشعور کی بہ نسبت لطیف جذبات کی نازک ضربوں سے کام لیا گیا ہے۔

دوارکا پرشاد افقؔ رامائن کے قصوں کو بیان کرتے وقت نثر سے زیادہ نظم کو مؤثر سمجھتے ہیں۔اپنے اس عندیہ کو 'رامائن والمیکی' کی سطور میں وہ یوں بیان کرتے ہیں۔

''نارد جی نے اس موقع پر جس عذب البیانی، شیریں زبانی سے کام لیا ہم اس کو پھیکی نثر میں دکھانا نہیں چاہتے۔ناظرین کی طبیعت کو تھکانا نہیں چاہتے اس لیے ان کے مطلب کو قالبِ نظم پہنانے کے خونِ جگر سے کام لے کر ناظرین کی ضیافتِ طبع کرتے ہیں۔''

(افقؔ: رامائن بالمیکی [بال کانڈ حصہ اول] لکھنؤ ص ۱۵)

پھر نارد جی کے خیالات کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں۔

رام کے نام سے رام کی صورت دیکھی　　آنکھ سے عزت واکرام کی صورت دیکھی
دیدۂ دل نے جو اس نام کی صورت دیکھی　　چشمِ باطن نے شری رام کی صورت دیکھی

دفع ہو رنج اگر لب پہ آ کار آ جائے
مکتی مل جائے زباں پر جو مکا رآ جائے

Scanned with CamScanner

جو بشر کرتا ہے سیتا کا لقب ورد زباں　　زخمِ دل سیتا ہے مٹ جاتی ہے ایذائے نہاں
منہ سے نکلا جو رماں پورے ہوئے سب ارماں　　دستِ رحمت سے سیانے سیا چاکِ داماں

جانکی جی کا جہاں نام زباں پر آیا
جان کی خیر ہوئی مقصودِ دل بر آیا

پاپ ان ناموں کے رٹ لینے سے کٹ جاتا ہے　　پاٹھ سے پاٹ یم راج کا گھٹ جاتا ہے
ٹاٹ افلاک و فلاکت کا الٹ جاتا ہے　　آ کے یم راج سرھانے سے پلٹ جاتا ہے

غمِ دنیا، غمِ فردا ، غمِ عصیاں نہ رہا
دیوتا ہو گیا انساں سے وہ انساں نہ رہا

افق کے درج بالا بیان سے پتا چلتا ہے کہ وہ نظم کو ترجیح دیتے تھے۔اس کا ایک اور ثبوت ان کا 'نظم اخبار' ہے جو مکمل طور پر نظم میں شائع ہوتا تھا۔شاید اس نوع کا وہ اردو کی صحافتی تاریخ کا یگانہ اخبار ہے جس میں اداریے سے لے کر خبریں اور اشتہارات بھی منظوم نقل کیے جاتے تھے۔ افق خود اس اخبار کا بیشتر حصہ اپنے ہاتھوں سے لکھا کرتے تھے۔ان کی نثری تخلیقات میں بھی اکثر جگہ نظمیں شامل کر لی جاتیں اور ان میں شعری خوبیوں کو اجاگر کیا جاتا۔جیسا کہ گذشتہ نظم میں رام -نام، رام۔اکرام، آکار۔مکار، سیتا (سینے کا عمل)۔سیتا (جانکی)، جانکی۔'جانکی'، 'دلبر آیا'۔'دل برایا' (دل محفوظ ہو گیا، ہندی ترکیب) وغیرہ الفاظ آئے ہیں۔لفظی صنعت کی یہ مثالیں ہیں۔ رامائن والمیکی کی یہ نظم مسدس میں ہے اور افق مسدس لکھنے میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔حالی کے بعد اس صنف میں سب سے زیادہ تخلیقات دوارکا پرشاد افق ہی کی ہیں۔

افق کا ''دش اوتار درشن'' بھی منظوم رسالہ ہے مسدس میں لکھا گیا۔اس میں ہندوؤں کے وشنو بھگوان کے دس اوتاروں کا ذکر ہے۔یہ مسدس رسالہ ''بھارت پرتاب'' کے اکتوبر ۱۹۰۱ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔

Scanned with CamScanner

ہندوؤں میں بھگوان کا ایک تصور تثلیث یا تری مورتی کا رہا ہے۔ عمل کے اعتبار سے یہ بھگوان کے تین روپ، برہما، وشنو اور مہیش ہیں۔ برہما تخلیق کا دیوتا ہے اور اپنا کام پورا کر چکا ہے۔ اب کائنات کو چلانے اور ذی روح کو پالنے کی ذمہ داری وشنو کی ہے۔ اور کائنات میں موجود ذی روح کا خاتمہ مہیش کے ذمہ ہے۔ اس تثلیث میں سب سے زیادہ وشنو کے ساتھ عقیدت رکھی جاتی ہے۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ کائنات کو اچھے ڈھنگ سے چلانے کے لیے وشنو نے دس اوتار لیے ہیں۔ ان دس اوتاروں کا ذکر افق نے اس مسدس میں بیان کیا ہے۔ یہ اوتار درج ذیل ہیں۔

۱) متسیہ اوتار (مچھلی) ۲) کتسیہ اوتار (کچھوا) ۳) ورہا اوتار (خنجیر) ۴) نرسنگھ اوتار (آدمی اور شیر کا جڑواں) ۵) وامن اوتار (بونا) ۶) پرشورام اوتار (۷) رام اوتار (۸) کرشن اوتار (۹) بدھ اوتار اور آنے والا اوتار (۱۰) کالکی اوتار ہوگا جو چار لاکھ دو سو پچاس ہزار برس بعد آئے گا۔

افق نے اس مسدس میں رام، کرشن کے اوتار کی تفصیل اور ان کے مناقب بیان کر دیئے ہیں۔ باقی تمام کے لئے ایک ایک دو دو بند سے زیادہ تفصیل نہیں ملتی۔ البتہ کلکی اوتار کے آثار بیان کرتے وقت فی زمانہ گرتی ہوئی اخلاقیاتی سطح، تہذیبی گراوٹ، سماجی بدعملی اور قدروں کی پامالی پر آج کے تناظر میں مؤثر انداز میں قلم کو رواں کیا ہے۔ ''آخر میں انہوں نے کرشن اور ادھا سے مفلس ولاچار اور بے بس و بے کسوں پر مہربانی کرنے کی درخواست کی ہے۔'' دس اوتار درشن'' میں مسدس کے تمام شعری اصولوں اور عروضی قوانین کو برتا گیا ہے۔ الفاظ کا انتخاب اور تراکیب کے استعمال پر خاص توجہ دی گئی ہے جس سے مسدس کا ہر مصرع رواں ہو گیا ہے۔ اس مسدس میں صنعتوں کا بھی وافر استعمال دکھائی دیتا ہے۔ چند اشعار بطور مثال پیش کئے جاتے ہیں۔

ایسی جب چشمِ تصور نے دکھائی جھانکی　　موہنی ڈال گئیں دل پہ ادائیں بانکی

Scanned with CamScanner

اک طرف ابر میں ضو برقِ شرر افشاں کی　　اک طرف چاند میں سرخی سحرِ خنداں کی

رادھکا جی میں نہ کچھ فرق نہ کچھ شیام میں فرق

ایک دونوں میں فقط نام کو ہے نام میں فرق

یاد رہے کہ رادھا کرشن کے حسن کا تجزیہ رنگوں کے سہارے کرنے کی مثال ہندی کے شاعر سورداس کے یہاں سے پائی جاتی ہے۔ رنگوں کے سہارے ان شعرا نے ان دونوں دیوتاؤں کے اوصاف بتائے ہیں۔ سورداس کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ وہ اندھے تھے۔ مگر انھوں نے اپنے خلاق تخیل سے رادھا کرشن کے رنگوں کا تجزیہ ایک دوہے میں اس طرح کیا ہے کہ شیام رنگ کرشن اور ہلدی رنگ رادھا ایک دوجے سے ملے تو سارا سنسار ہرا بھرا ہو گیا۔ نیلا اور پیلا رنگ ایک دوسرے میں جذب ہو کر ہرے رنگ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ رنگوں کی تبدیلی کی اس کیمیائی کیفیت کو ایک اندھے شاعر کا بیان کر دینا ایک عجوبہ سے کم نہیں۔ افق شیام رنگ کو بادل اور رادھا کے رنگ کو بجلی کے نور سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ بھی رنگوں کا ایک قسم کا تجزیہ ہی ہے۔ نظم کے آخری بند میں وہ یوں ملتجی ہیں۔

لکشمی ناتھ ہو اب مجھ پہ ترحم کی نظر　　جانکی ناتھ ہو چشمِ کرم و لطف ادھر

رادھکا ناتھ افق آپ کا ہے دستِ نگر　　دوارکا ناتھ مٹا دیجئے تکلیف و خطر

میں ہوں دین اور لقب دین دیال آپ کا ہیں

نذر ہے خونِ جگر لیجئے مال آپ کا ہیں

شری کرشن کی ایک صفت 'دین دیال' بھی ہے۔ مگر یہاں بقول منور لکھنوی شاعر اشارہ ان کے محسن پنڈت دین دیال شرما کی طرف ہے۔

(افق: دش اوتار درشن [بحوالہ: بھارت پرتاپ، اکتوبر ۱۹۰۱ء ص ۶۴)

دوارکا پرشاد افق کی تقدیسی شاعری صرف ہندو دھرم تک محدود نہیں بلکہ انھوں نے خالص اسلامی فکر کے حمدیہ اور نعتیہ اشعار بھی قلم بند کئے ہیں۔ شاعر کی مذہبی عقیدت اور رواداری

Scanned with CamScanner

کی غمازی کرتے ہیں۔ مثنوی ''سوانح عمری گرو گووند سنگھ'' کی ابتدا وہ مثنوی کی فنی روایت کے مطابق حمدیہ اشعار سے کرتے ہیں ۔

قلم کر استتی پر ماتما کی ۔۔۔ صفت لکھ خالقِ ارض و سما کی
کیا ظلمت کو آخر نور جس نے ۔۔۔ بنایا ابر سے کافور جس نے
مٹایا شب کا اندھیارا سحر سے ۔۔۔ نصیب شام چمکایا قمر سے
سوادِ دل کو نورانی عطا کی ۔۔۔ سیاہی کھوئی بجلی سے گھٹا کی
جہاں تاریکی چشمِ خواب کو دی ۔۔۔ تجلی، کرمکِ شب تاب کو دی

(بحوالہ: ڈاکٹر کومل بھٹناگر' ملک الشعرا افق لکھنوی ۲۰۰۷ ص ۲۶۰)

مجھے اپنی کوتاہ فہمی کا اقرار ہے پھر بھی میں کہہ سکتا ہوں کہ مجھے اس حمد میں سورۃ القلم اور سورۃ النور سے استفادے کا گمان ہو رہا ہے۔ سورۂ نور میں اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں بادلوں میں بجلی کا چمکنا، بادلوں کا برسنا، رات کے پردے سے دن کا نکلنا، اور دن کے پیٹ سے رات کا نکلنا نیز مختلف جانداروں کا پیدا ہونا وغیرہ کا ذکر ہے۔ افق کے شعور کی رو کا قرآن کی طرف پلٹنا ان کی مذہبی رواداری کا مظہر ہے۔ گرو گووند سنگھ کی سوانحی تاریخ گویا افتراق مذاہب کی تاریخ بنا دی گئی ہے۔ میرے دوست (مرحوم قیس جالندھری) نے بھی گرو گووند سنگھ کی تاریخ کو 'لاوا' کے عنوان سے مثنوی میں قلم بند کیا تھا۔ مگر بعض عصبیتی عناصر در آنے کی وجہ سے میرے تحقیقی مقالے میں اس کے حوالوں کو شامل کرنے سے مجھے منع کر دیا تھا۔ ایسے حساس موضوع کو بیان کرتے وقت حمدیہ اشعار نے افق کی مثنوی کی تلخی کو کم کر دیا ہے۔

اپنی طویل مثنوی 'اوتار' میں دوارکا پرشاد افق نے ہندوؤں کے اوتار کے نظریے کی فلسفیانہ تشریح کی ہے۔ انھوں نے حضرت محمد ﷺ کی توصیف بیانی میں رطب اللسان دکھائی دیتے ہیں ۔

محمد جو عرب میں پیشوا تھے ۔۔۔ بشر کی شکل میں نورِ خدا تھے

Scanned with CamScanner

مسیح خوش بیاں گوہر فشاں ہے　　محمد کی صفت میں تر زباں ہے
رسول اندر حقیقت جز خدا نیست　　بدیں پیغام جبریل آشنا نیست
محمد نیست جز آئینۂ خویش　　تو در وے می نمائی جلوۂ خویش
براں جلوہ بجاں خاطر نہادی　　بداد حسن خود انصاف دادی
بہ بیں آئینۂ دبر خویش می ناز　　جہاں فرما ازیں ہم بیش می ناز

اسی نظم میں شاعر نے حضرت علی کی منقبت میں بھی شعر کہے ہیں۔ ان تخلیقات کے علاوہ محرم کے عنوان سے لکھے گئے مسدس میں مرثیہ کا انداز نمایاں ہے۔ افق نے شہدائے کربلا کے غم کے اظہار کے ساتھ ان کی منقبت بھی بیان کی ہے۔ اگر چہ یہ مسدس صرف ایک تہوار پر لکھا گیا ہے مگر شاعر نے اس کے پس منظر کے کوائف بھی بڑی عقیدت کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ ہولی اور بسنت رتو پر لکھی گئی منظومات بھی افق کے یہاں تقدیسی عنصر لیے ہوئی ہیں۔ افق کی غزلوں اور رباعیوں میں بھی تقدیسی رجحان پایا جاتا ہے۔ 'غزل یک قافیہ' تو ساری کی ساری حضرت علی کی منقبت میں ہے۔ شاعر نے اس غزل میں 'نادِعلی'، 'ذوالفقارِعلی، تیغِ علی، ابنِ علی، سنگِ اسود کعبہ وغیرہ تراکیب استعمال کی ہیں۔ ان تراکیب کے پشِ پشت حضرت علی سے منسوب کوئی نہ کوئی واقعہ رہا ہے جسے اسلامی تاریخ میں بآسانی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اس غزل کے درج ذیل شعر معنوی لحاظ سے بھی اہم ہیں۔

ہے کافرانِ عشق کے سر پر چلی ہوئی　　ابروے یار کیا ہوئی تیغِ علی ہوئی
تھا وار ذوالفقارِ علی کا غضب کا وار　　شکلِ حسین شمر کو نادِعلی ہوئی
خط دیکھتے ہی ہو گیا آسیب اشک دور　　مہرِ لفافہ آنکھ کو نادِ علی ہوئی

ان غزلیہ اشعار میں اگر چہ سروکار کوائف عشقیہ سے ہے مگر افق نے تقدیسی عناصر کو ان سے جوڑ کر غزل کو محترم بنانے کی سعی کی ہے۔

مجموعی طور پر افق کی شاعری کی فضا تقدس مآب اور مذہبی اور جذبات کی امین ہے۔ ان

کی فکر و نظر کی دروں بینی انسانیت کے مذہبی گوشوں کو ڈھونڈ نکالتی ہے، اس لیے مذہب کی مقدس فضا ان کی شاعری پر ہمیشہ سایہ فگن رہتی ہے۔ ان کی تقدیسی شاعری شعریت سے عاری نہیں ہے اور نہ اس میں صنعتوں کی کمی ہے۔ انھوں نے گنگا جمنا میں دھلی زبان استعمال کی ہے۔ زبان کے اس تقدس نے ان کی شاعری کو مقدس بنا دیا اور مذہبی عناصر نے اسے پاکیزگی عطا کی۔

☆☆☆

ڈاکٹر یحییٰ نشیط
یوتمال، مہاراشٹر

Scanned with CamScanner

افق کی صحافتی و ادبی خدمات

ہم اہل اردو کو اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی بھی جھجک نہیں ہونی چاہئے کہ دوارکا پرشاد افق جیسی عبقری اور نابغۂ روزگار شخصیت پر جتنا کام ہونا چاہئے اتنا نہیں ہوا۔ انھوں نے اپنی محنت شاقہ، ذہنی و فکری صلاحیت اور اظہارِ بیان پر مکمل قدرت کی بدولت اردو ادب کے دامن کو لعل و گہر سے مالا مال کیا۔ ان کی تصنیفات کا تنقیدی جائزہ اور مقام و مرتبہ کا تعین صحیح طریقے سے اب تک نہیں ہو پایا ہے۔ جس کی وجہ سے اردو ادب میں انہیں وہ مقام نہیں ملا جس کے وہ مستحق تھے۔

ملک الشعراء منشی دوارکا پرشاد افق قادر الکلام شاعر، عظیم صحافی، باکمال نثر نگار اور معتبر مترجم کی حیثیت سے اردو ادب میں پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی پیدائش ۱۳ر جولائی ۱۸۶۴ء میں نوبستہ لکھنؤ کے ایک معروف کائستھ خاندان میں ہوئی تھی۔ والد محترم کا نام منشی پورن چند ذرہؔ تھا۔ وہ حکومتِ برطانیہ میں محکمہ نہر آگرہ کے سررشتہ دار تھے۔ ذرہؔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں مشقِ سخن کرتے تھے۔ افق کے خاندان میں اردو شعر و ادب کی مضبوط روایت ملتی ہے۔ یہ روایت اس قدر وسیع اور پائیدار ہے کہ اس سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ افق کے جد امجد منشی ادے راج مطلع دادا منشی ایشوری پرشاد شعاعیؔ بھی اردو اور فارسی کے مستند شاعر اور صاحبِ طرز نثر نگار تھے۔ افق کے والد کو شاعری کے ساتھ ساتھ نثری اصناف سے بھی شغف تھا۔ انھوں نے ۱۸۷۵ء میں نوبستہ، لکھنؤ میں ایک پریس قائم کیا اور ایک ہفتہ وار اخبار کا اجرا کیا جس کا نام 'تمنائی' تھا۔ منشی پورن چند ذرہؔ کے تین لڑکے ہوئے۔ ان میں افق سب سے چھوٹے لیکن ذہانت و فطانت میں یکتائے زمانہ تھے۔ افق کے بڑے بھائی منشی رام سہائے تمناؔ (۱۸۵۴-۱۹۳۲) بھی مایہ ناز شاعر اور نثر نگار تھے۔ انھوں نے متعدد کتابیں تصنیف کیں جو زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آ چکی ہیں۔ افق کے منجھلے بھائی ماتا پرشاد نیساںؔ بھی قادر الکلام شاعر اور با صلاحیت نثر نگار تھے۔ ان کی کئی تصانیف

Scanned with CamScanner

شائع ہوئیں اور ادبی حلقے میں مقبول بھی۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ افق نے خالص شعری، ادبی اور علمی ماحول میں آنکھیں کھولیں اور جب ہوش سنبھالا تو اپنے اطراف میں اردو شعر و ادب کا تذکرہ سنا اور دیکھا۔

افق کافی ذہین اور باصلاحیت انسان تھے۔ وہ خالص ادبی و علمی ماحول کے پروردہ تھے۔ گھر میں مطبع تھا جس سے ہفتہ وار اخبار شائع ہوتا تھا۔ ادباء و شعراء کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے کا سلسلہ بچپن سے ہی رہا۔ اس کے علاوہ افق کے نانیہال میں بھی ادبی ماحول تھا۔ جس نے سونے کو کندن بنانے کا کام کیا۔ ناسخ اسکول کے مشہور و معروف شاعر منشی شنکر دیال فرحت (۱۸۳۰۔۱۸۹۰ء) افق کے سگے ماموں تھے۔ فرحت نے نہ صرف یہ کہ افق کو فن شعر گوئی سے آشنا کیا بلکہ ان کے ادبی ذوق کو پروان چڑھایا۔ افق کا تخلص ابتدائی دور میں دلؔ تھا، جسے بعد میں بدل کر افق کر لیا۔ فرحت فارسی، ہندی، انگریزی اور اردو کے ماہر تھے۔ انھیں زبان و بیان پر قدرت حاصل تھی۔ افق انھیں کے سایۂ عاطفت میں رہ کر زبان و بیان کی باریکیوں اور فن شعر گوئی کے رموز سے واقفیت حاصل کی۔ فرحت کا خاص کارنامہ رامائن کا منظوم ترجمہ ہے۔ یہ باصلاحیت اور با کمال استاد کی تعلیم و تربیت کا ہی اثر ہے کہ محض بیس (۲۰) سال کی عمر میں افق نے 'رامائن یک قافیہ' منظر عام پر لانے میں کامیاب ہوئے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ خاندانی ماحول کے ساتھ ساتھ استاد محترم جو سگے ماموں تھے، انکی نکتہ رسی اور شعر فہمی کی تعلیم نے افق کی شاعری اور نثر نگاری دونوں میں نکھار لانے اور رفعت و بلندی عطا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

افق کی ادبی اور صحافتی خدمات کا احاطہ ایک مضمون میں ممکن نہیں ہے۔ ہاں ان میں چند کا تعارف ہو سکتا ہے۔ افق خود دادا اور پر گو شاعر تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری کی شروعات روایت کے مطابق غزل گوئی سے کی۔ ابتدائی دور کی غزلوں پر امیر مینائی اور داغؔ دہلوی کی شاعر کا رنگ دکھائی دیتا ہے۔ افق مرزا داغ سے زیادہ متاثر تھے۔ محض پندرہ سال کی عمر میں کہی گئی غزل میں تغزل، رومانیت اور شوخی دیکھیے ؎

Scanned with CamScanner

ہمارے زخم میں ٹھنڈک لہو سے ہوتی رہتی ہے
تسلی دل کی تکلیف رفو سے ہوتی رہتی ہے

زمانہ قدرداں ہوتا ہے صورت اور سیرت کا
گلوں کی قدر جیسے رنگ و بو سے ہوتی رہتی ہے

آج ہندی زبان میں غزل کہنے والوں کی بڑی تعداد موجود ہے۔ لیکن آج سے تقریباً سو سال قبل زمانہ شناس افق نے ہندی میں غزلیں کہی تھیں۔ ان غزلوں کے مضامین اچھوتے اور انداز بیاں پر لطف ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

بہادے پاپ جو کالندری کے جل کی دھارا ہے
جہاں ہو جائے بیڑا پار جمنا کا کنارا ہے

کہاں اے کرشن وہ مکھڑا تمہارا پیارا پیارا ہے
جو اپنے ہاتھ ہی سے رادھیکا بن کر سنورا ہے

اردو شاعری میں روایت سے انحراف اور سماجی قدروں کی عکاسی کی شروعات مولانا الطاف حسین حالؔی (۱۸۳۷۔۱۹۱۴) سے ہوئی۔ علی گڑھ کی علمی تحریک اور محمد حسین آزاد کی اصلاحی تحریک کا اثر سماج میں پھیل چکا تھا۔ ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کے بعد تحریک آزادی کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ ظاہری بات ہے ایک حساس طبع انسان پر ان کا اثر لازمی تھا۔ افق نے بھی اس کا اثر قبول کیا۔ غزل گوئی چھوڑ کر مسدس کی طرف مائل ہو گئے۔ انھیں ایسا محسوس ہوا کہ غزلوں کے ذریعہ دلی جذبات کا اظہار ممکن نہیں ہے۔ مسدس کا میدان وسیع اور بیکراں ہے۔ لیکن اس وقت بیشتر شعرا اس صنف کا استعمال صرف مرثیہ نگاری کے لیے کرتے تھے۔ میر انیس اور مرزا دبیر نے اس صنف میں کافی شہرت حاصل کی۔ افق نے روایت سے ہٹ کر مولانا حالی کی راہ اختیار کی۔ علامہ اقبالؔ، شنکر دیال فرحتؔ دتاتیریہ کیفیؔ، بنواری لال شعلہؔ، اور حکمتؔ وغیرہ نے

Scanned with CamScanner

مسدس کا میدان وسیع اور بیکراں ہے۔ لیکن اس وقت بیشتر شعرا اس صنف کا استعمال صرف مرثیہ نگاری کے لیے کرتے تھے۔ میر انیس اور مرزا دبیر نے اس صنف میں کافی شہرت حاصل کی۔ افق نے روایت سے ہٹ کر مولانا حالی کی راہ اختیار کی۔ علامہ اقبال، شنکر دیال فرحت دتا تیریہ کیفی، بنواری لال شعلہ، اور حکمت وغیرہ نے مسدس میں معاشرتی اور سیاسی مضامین باندھ کر حالی کی تحریک کو تقویت بخشی تھی۔ افق نے تحریک کو اور آگے بڑھایا۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے بالکل نئے اور غیر روایتی موضوعات پر مسدس کی ہیئت میں اشعار کہے اور کامیاب ہوئے۔ جب الوطنی سے متعلق انھوں نے چار مسدس کی تخلیق کی۔ 'آریہ ورت کی تاریخی عظمت'، قومی مسدس، مسدس افق اور درس عمل۔ اخلاقی قدروں اور معاشرتی مسائل سے متعلق مسدسوں میں 'دین وایمان کی حفاظت'، 'غریبوں کی غریبی، خودی، آہ مظلوماں، شجر اخلاق، اتفاق، خدمتِ مرشد اور مرقع عورت وغیرہ کافی اہم ہیں۔ سماجی برائیوں پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے انھوں نے "شراب کی مذمت، غفلت، اعتبار، پابندی وقت، زر کی تعریف، تندرستی، جیسے قابل ذکر مسدس قلم بند کیے۔ مسدس کی صنف میں افق کی راماین بھی مشہور ہے جس میں ۶۳ بند ہیں۔ حسن وعشق، فرزند، پریم، آدمیت اور زبان مسدس بھی اپنے موضوع اور بیان کے اعتبار سے بہت اہم ہیں۔ جھجھر اور حیدر آباد، دکن کے سفر نامے کو مسدس کی شکل دی اور پر لطف انداز میں واقعات قلم بند کیے۔ یہ دونوں مسدس پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ افق نے اپنے مسدسوں میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت کے ساتھ ساتھ اسلامی، یونانی اور مغربی تہذیب کے بھی حوالے دیے ہیں جن سے یہ پتا چلتا ہے کہ وہ انسانی ہمدردی اور مذہبی رواداری کے فروغ کے خواہاں تھے۔ ایک بند دیکھیے۔

جو کامل آج تک گزرے ہیں سب شان غریبی تھے
مسیح نامی و عیسائی لقب شانِ غریبی تھے
محمد سیدِ ملکِ عرب شانِ غریبی تھے
جناب موسیٰ والا نسب بھی شان غریبی تھے
غریبوں ہی سے شاہوں نے مدد لے کر شہی پائی

Scanned with CamScanner

غریبوں ہی کے دم سے عالموں نے آگہی پائی

افق نے مثنوی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر کئی مثنویاں لکھی ہیں۔ یہ مثنویاں رزمیہ، بزمیہ، منظری، عشقیہ، مذہبی اور اخلاقی سبھی طرح کی ہیں۔ افق کے موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان کی مثنویوں کے عنوانات دیکھئے۔ صبح کی بہار، شام کی بہار، سورج کی بہار، چاند کی بہار، بچپن کی بہار، بہارِ جوانی، پیری کی بہار، بسنت اور ہولی کی بہار، برسات کی بہاریں اور ساقی نامہ وغیرہ۔ پدماوتی، شکار میں شکار اور نور جہاں جیسی مثنویوں میں حسن و عشق کی واردات کا خوبصورت بیان ہے۔ 'راماین یک

قافیہ، اوتار، مورتی پوجن، پتر شرادھ، تیرتھ یاترا وغیرہ ان کی مذہبی مثنویات ہیں۔ اخلاقی مثنویوں میں استری دھرم، گرو سیوا، قلم کی تعریف وغیرہ اہم اور قابل ذکر ہیں۔ 'سوانح عمری گرو گووند سنگھ' (۱۶۷۵۔ ۱۷۰۸) افق کی مشہور رزمیہ مثنوی ہے۔ اس مثنوی میں افق نے حیات گرو گووند سنگھ کو معروضی انداز میں پیش کیا ہے۔ پوری مثنوی حقیقت نگاری کا آئینہ دار ہے۔ افق کی مثنویوں میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی جیتی جاگتی تصویر نظر آتی ہے۔ ان کی مثنویوں کی زبان پر لطف آسان اور رواں ہے۔ ساتھ ہی ساتھ منظر نگاری، سراپا نگاری مکالمہ نگاری اور جزئیات نگاری جیسے عناصر سے مملو ہیں۔ موقع و محل کے اعتبار سے تلمیحات و تشبیہات کا استعمال خوب تر ہے۔ کہیں کہیں نصیحت آمیز اشعار بھی ملتے ہیں جس سے ان مثنویوں کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے ۔

ملایا خاک میں زورِ جوانی — اجاڑا بوستان زندگانی
کسی کو بھی کوئی یوں کم نہ سمجھے — کسی شمشیر کو بے دم نہ سمجھے
بدن میں سانپ کے جب تک رہے دم — نہ سمجھے اس کے دانتوں کو کبھی کم
(مثنوی پدماوتی سے)

غزل کی طرح رباعی بھی ایسی صنف سخن ہے جس میں بیشتر شعراء فکر سخن کرتے ہیں۔ افق نے بھی رباعیاں کہی ہیں جن کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ انھوں نے اس صنف میں بھی اپنی خدا

Scanned with CamScanner

داد صلاحیت اور اختراعی ذہن کا ثبوت دیا ہے۔ ان کی رباعیاں حب الوطنی، اخلاقی، فلسفیانہ، قومی یکجہتی، سماجی بیداری اور سیکولرزم جیسی وسیع اور معاشرتی موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔ انھوں نے اپنی رباعیوں میں لکھنوی محاوروں کا استعمال کثرت سے کیا ہے۔ چند رباعیوں میں ہندی الفاظ کا استعمال اس طرح کیا ہے کہ اس کی خوبصورتی میں اضافہ ہو جاتا ہے ۔

ہندوستاں گھر جہاں پناہی کا ہے
ماتھے پہ اسی کے فخر کا ٹیکا ہے
عظمت کا ثبوت قدرتی ہے افق
اوپر ہے ہند نیچے امریکا ہے

مولیٰ لامذہبی سے انسان کو بچائے
نفرت نہ کسی دین سے ہونے پائے
مذہب پہ رہو افق ہمیشہ قائم
سمجھے رہو جان جائے ایمان نہ جائے

سمجھا بھائی کو صرف بھائی ہم نے
بھولے سے نہ کی کبھی بھلائی ہم نے
اور اس پہ ہے ناز حب قومی افسوس
مسجد ایک اینٹ کی بنائی ہم نے

علی جواد زیدی نے 'قصیدہ نگاران اتر پردیش' میں افق کا مختصر تعارف کرایا ہے۔ 'لمعات افق' کے حوالے سے ان کے تین قصیدوں کا ذکر کیا ہے۔ لیکن محترمہ کومل بھٹناگر نے ان کے قصائد کی تعداد چار بتائی ہے۔ ایک قصیدہ میر محبوب علی نظام دکن کی شان میں اور دوسرا انھیں کی سال گرہ کے موقع پر لکھا۔ تیسرا قصیدہ مہاراج کشن پرشاد وزیر اعظم دکن کے عطائے خطاب 'راجہ راجگاں' کے موقع پر نظم کیا۔ چوتھا قصیدہ ۱۸۸۷ء میں ملکہ وکٹوریہ کے جشن جوبلی کے موقع پر ایڈورڈ

Scanned with CamScanner

ہفتم کی تاج پوشی کے سلسلے میں کہا گیا تھا۔ ان کے علاوہ افق نے مرزا داغ دہلوی کے عطائے خطاب کی تعریف میں ایک مختصر قصیدہ فارسی میں لکھا تھا۔ اس میں داغ کی تعریف اور شاعرانہ عظمت کا ذکر ہے۔

افق نے متعدد بار حیدر آباد دکن کا سفر کیا۔ میر محبوب علی اور ان کے وزیر اعظم مہاراجہ کشن پرشاد سے قلبی لگاؤ تھا۔ حیدر آباد ان کی پسندیدہ جگہ تھی۔ اس مقام کو وہ لکشمی کا گھر کہتے تھے۔ نظام دکن نے ان کے لیے کچھ وظیفہ مقرر کیا تھا۔ وہ افق کی شاعری کو بے حد پسند کرتے تھے۔ افق نے ایک طرحی غزل ان کے دربار میں منعقد ایک مشاعرے میں پڑھی تھی۔ مصرعہ طرح تھا

"الٰہی ایسی مصیبتوں میں شباب ہم لے کے کیا کریں گے" افق نے غزل اس طرح کہی تھی

سوال بوسے کا جائے بوسہ جواب ہم لے کے کیا کریں گے
جو چیز اچھی ہو دیجیے وہ خراب ہم لے کے کیا کریں گے

سیاہ دیکھی جو فرد عصیاں تو نکیر و منکر لحد میں بولے
تیرے گنہ بے حساب ہیں جب حساب ہم لے کے کیا کریں گے

پوری غزل طوالت کی وجہ سے نقل نہیں کی جا رہی ہے۔ افق نے جب یہ غزل پڑھی تو میر محبوب علی خاں نے بڑی تعریف کی اور چوبدار کو بھیج کر پوری غزل منگوالی۔ واضح ہو کہ نظام دکن نے ان کی شاعری اور ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں 'ملک الشعرا' کے خطاب سے نوازا تھا۔

افق نے صحافت کے میدان میں جو کارنامے انجام دیے ہیں اس کے لیے ایک الگ مضمون کی ضرورت ہے۔ یہاں مختصراً ان کی صحافتی زندگی کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ افق کے دور میں شاعری کا غلغلہ تھا۔ عوام و خواص کا مزاج شاعرانہ تھا۔ پورے اودھ میں اردو کی اپنی الگ پہچان تھی۔ مسجع مقفیٰ تحریریں رائج تھیں۔ مقامی زبان پر تکلف تھی۔ اسی دور میں افق کے والد پورن چند ذرہ نے اخبار تمنا کا اجرا کیا۔ اس کی ادارت افق کے بڑے بھائی رام سہائے تمنا کے ذمے تھی۔ یہ ماہانہ رسالہ ۲۴ر جولائی ۱۸۷۶ کو شائع ہوا تھا۔ کل سولہ صفحات تھے۔ اس روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے

Scanned with CamScanner

افق نے ۱۵ر اگست ۱۸۸۸ء کو 'نظم اخبار' کی اشاعت شروع کی۔ یہ اخبار بالکل الگ نوعیت کا تھا اس کے بارہ صفحات تھے جس میں چار صفحات کی خبریں نثری ہوتی تھیں جبکہ آٹھ صفحات کی خبریں منظوم ہوتی تھیں۔ شعری ہیئت کی خبریں عام اور خاص دونوں طبقے کے ذوق تسکین کے عین مطابق تھیں۔ منظوم خبریں شائع ہوتی تھیں وہ فنی اعتبار سے اچھی شاعری کا نمونہ ہوتی تھیں۔ جناب افق شاعری کے تمام لوازمات کو ملحوظ رکھتے تھے۔ ورنہ لکھنو جیسے جگہ میں انھیں کامیابی نہیں ملتی۔ 'نظم اخبار' شاید اردو کا پہلا اور آخری تجربہ تھا۔ اس طرح کی مثال پورے برِصغیر میں کہیں اور نہیں ملتی۔ کاٹھیاواڑ کی ایک خبر کو افق سے اس طرح شائع کرتے ہیں۔

عجب سرکش ہیں اس خطے کے ڈاکو
بجا ہے گر کہیں ان کو ہلاکو

جفاکاری سے باز آتے نہیں ہیں
صدا محو دل آزاری یہ ہیں

کیا اہلِ پولیس کو حال میں تنگ
دکھا کر جوہر شمشیری کی جنگ

ڈاکٹر کومل بھٹناگر کے مطابق افق 'نظم اخبار' کے علاوہ 'پنجاب سماچار' اور 'دھرم بجیون' اخبارات کے بھی مدیر رہے۔ یہ دونوں اخبارات لاہور سے شائع ہوئے تھے۔ پنجاب سماچار ہر منگل اور سنیچر کو شائع ہوتا تھا۔ یہ اخبار افق کے مدیر بننے کے چودہ سال قبل سے شائع ہوتا تھا۔ افق نے اس میں نئی جان پھونک دی۔ اس کے مالک کا نام ہیرالال کپور تھا۔ مولانا امداد صابری نے اپنی تصنیف 'تاریخ صحافت اردو' میں اس اخبار کو ہفتہ وار بتایا ہے۔ آخرالذکر اخبار کا صحیح نام 'دھرم جیون' تھا۔ مولانا امداد صابری نے بتایا ہے کہ محلّہ بھدرکال متصل بچھووالی سے یہ پندرہ روزہ اخبار ۱۳ر جنوری ۱۸۸۲ء کو نکلا۔ آٹھ صفحات پر مشتمل تھا۔ مالک کا نام شیونارائن اگنی ہوتری اور ایڈیٹر ستیہ نارائن اگنی ہوتری تھے۔ سالانا چندہ ڈیڑھ روپے تھا۔ یہ اخبار راجہ رام موہن رائے کے

Scanned with CamScanner

خیالات کا حامی اور ہم نوا تھا۔

۱۹۱۳ء کا سال افق اور ان کے خاندان کے لیے منحوس ثابت ہوا۔ محض بیس (۲۰) سال کی عمر میں ان کا جوان بیٹا رام شنکر بیوہ اور دو معصوم بچوں کو چھوڑ کر داغ مفارقت دے گیا۔ بڑی صاحبزادی دھرم دیوی کا شوہر بھی عین جوانی میں راہی ملک عدم ہوا۔ افق ان صدموں کی وجہ سے ٹوٹ گئے۔ بیٹے کی آخری رسوم ادا کرنے کے بعد سخت علیل ہوئے اور مسلسل چھ ماہ کی علالت کے بعد ۱۳ ستمبر ۱۹۱۳ء کو اس دنیائے فانی کو خیر باد کہا۔ اردو ادب کے لیے کی گئی اپنی خدمات کی بدولت اردو شعر و ادب کی محفلوں میں افق ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

ماخذات۔

۱۔ ملک الشعرا منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی۔ ڈاکٹر کومل بھٹناگر

۲۔ منشی دوارکا پرشاد افق نمبر۔ نیا دور۔ ستمبر ۲۰۱۴

۳۔ قصیدہ نگاران اتر پردیش۔ علی جواد زیدی

۴۔ تاریخ اردو صحافت۔ مولانا امداد صابری

☆☆☆

ڈاکٹر ارشاد احمد

'آمنہ منزل' اسلامیہ نگر،

سیوان۔ بہار۔ ۸۴۱۲۳۲

موبائل۔ ۰۹۷۷۱۴۶۶۱۳۶

Scanned with CamScanner

انیسویں صدی کے ادبی وصحافتی سفر کا ایک راہی : دوارکا پرساد افق

انیسویں صدی سیاسی خلفشار اور ذہنی انتشار کی ہی صدی نہیں ہے، بلکہ معاشی وتہذیبی استحصال واضمحلال کی بھی صدی ہے۔ ایسی صورت میں ادب وصحافت نے اپنی ذمہ داری جس طرح بحسن وخوبی نبھائی، اسے دیکھتے ہوئے یہ صدی ادب وصحافت کے اعلیٰ معیار کی صدی تھی۔ اس صدی میں ادب وصحافت کا سفر میں جس سمت ورفتار کی طرف تھا، اس میں منزل کے امکانات پوشیدہ تھے۔ اس صدی کے ادب وصحافت نے سماج کو آئینہ دکھایا، اس کی دکھتی رگوں پر ہاتھ رکھا، خواب اور حقیقت کا امتیاز بتایا۔ احتجاج وانقلاب سے روشناس کرایا۔ انیسویں صدی نے جس طرح اپنا شعری سفر احساسِ تمکنت کے ساتھ طے کیا، نثری سفر بھی برق رفتاری کے ساتھ اپنی منزل پر گامزن رہی۔ شعروسخن کی رو سے اگر یہ صدی غالب سے وابستہ ہے تو شعروادب کا ارتقائی سفر سرسید کی فکری شاہراہ سے ہوکر گزرتا ہے۔ ادب اور صحافت کو وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے یہ صدی سرسید سے منسوب ہے۔ سرسید نے جوش کے ساتھ ہوش، جنون کے ساتھ حکمت کو وقت کی ضرورت بتایا۔ جذبہ پر عقل کی بالادستی نے عملی زندگی کی راہیں متعین کیں۔

انیسویں صدی میں علی گڑھ تحریک نے ذہن سازی کا کام کیا، فکر ونظر کو بالیدگی بخشی۔ موجودہ اور آنے والے وقت پر اس کی نظر گہری تھی۔ اس تحریک نے جہاں زندگی کے ہر شعبۂ حیات کو متحرک کیا وہیں ادب وصحافت میں مثبت فکر کا خون دوڑایا۔ مغربی ادب سے استفادہ کرنا سکھایا۔ غرض مصالحت ومفاہمت کی حکمتِ عملی سے کام لیا۔

انیسویں صدی کی صحافت نے نہ صرف وقت کے تیکھے تیور کو پہچانا بلکہ حکومت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی بات کہنا سکھایا۔ جس کا خمیازہ بھی بسا اوقات اخبارات اور مالکوں کو بھگتنا پڑا۔ اگرچہ دہلی کے شعری ادب پر محزونیت، دردمندی اور شکستہ پائی ہے، مگر فکر ونظر میں توانائی اور گہرائی بھی ہے، سنجیدگی ومتانت کی رعنائی بھی ہے۔ دہلی کی مسموم سیاسی فضاؤں سے تحفظ کی

Scanned with CamScanner

خاطر اہلِ قلم کا دہلی سے ترکِ وطن کا سلسلہ تو اٹھارویں ہی صدی سے شروع ہو گیا تھا۔ رفتہ رفتہ لکھنو نے اپنی الگ شناخت قایم کر لی۔ ایک طرف بنیادی ضرورتوں کی محرومیاں ہیں تو دوسری طرف زندگی کی بھرپور رعنائیاں اور تعیش کی کارفرمائیاں ہیں۔ ایسے ماحول میں دہلی کے برعکس لکھنو میں ادب و صحافت کا سفر شادمانیوں کے ساتھ طے ہوتا رہا:

خدا آباد رکھے لکھنو کے خوش مزاجوں کو
ہر اک گھر خانہ شادی ہے، ہر اک کوچہ ہے عشرت کا (سحر)

پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں:

''ہر دور کا ادب اس دور کی تہذیب کا آئینہ ہوتا ہے۔ لکھنو کو اٹھارویں صدی کے وسط سے لے کر انیسویں صدی کے آخر تک شمالی ہند کی تہذیب میں ایک نمایاں درجہ حاصل رہا۔'' (۱)

ناسخ اور آتش لکھنو کے شاہانِ ادب تھے۔ یہاں کا ادب و صحافت اپنی الگ انفرادی شان پر مصر تھا۔ ہندوستانی روایات اور ایرانی تہذیبی اثرات سے ایک ہندو مسلم مشترکہ تہذیب عالمِ وجود میں آ کر لکھنو کی تہذیب کہلاتی ہے۔ مرزا جعفر حسین کا کہنا ہے:

''وہ تہذیب نہ خالص ہندوستانی تھی اور نہ کلیتاً ایرانی تھی۔ ہندوستان اور ایران دونوں ایشیائی ممالک تھے اس لیے ہم اپنی پرانی تہذیب کو ایشیائی معاشرت کہنے میں حق بجانب ہیں۔۔۔'' (۲)

نوابینِ اودھ کی سرپرستی سے یہاں کی تہذیب اور ثقافت کو فروغ حاصل ہوا۔ 'قدیم لکھنو کی آخری بہار' کا مصنف آگے کہتا ہے:

'' انھیں کے دورِ اقتدار میں ایک زبردست احساسِ برتری لکھنو والوں میں پیدا ہو گیا تھا۔۔۔۔'' (۳)

ناسخ جن کے لیے ابواللیث صدیقی نے لکھا ہے:

Scanned with CamScanner

''ظہیر، مومن، غالب، ذوق سب کے ذاتی ارتقا میں ناسخ کے کلام اور ان کی مثال کا بڑا حصہ ضرور ہے'' (۴)

اگر چہ یہ بات شاعری کے حوالے سے کہی گئی ہے مگر افق کی صحافتی زندگی پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ افق ناسخ سے متاثر تھے۔ یہ اثر پذیری نظم اخبار میں اس طرح نظر آتی ہے کہ خبر بھی نظمیہ رنگ میں پیش کی جاتی ہے۔ صحافت کی دنیا میں یہ جدت طرازی معمولی بات نہیں۔ یوں بھی دوارکا پرساد افق کا ادبی اور صحافتی سفر اسی لکھنؤ کے لہلہاتے ادبی مرغزاروں سے ہو کر گزرا تھا۔ تاہم جس رہگزر پر وہ چل رہے تھے، اس کا رخ بہر حال انھوں نے عصرِ حاضر کی طرف رکھا۔ رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں:

''اگر غور سے دیکھا جائے تو جدت پسند طبائع نے قدامت پرستی سے گھبرا کر اپنے نام و نمود اور ندرت کے خیال سے نئی نئی راہیں نکالیں، اور شعرائے دہلی کی قدیم شاہراہ کو چھوڑ دیا۔ ناسخ اس طرزِ جدید کے پیشوائے اعظم ہیں'' (۵)

سکسینہ کے اس بیان کی روشنی میں دوارکا پرساد افق کے صحافتی سفر کا تجزیہ کیا جائے تو ان کی صحافتی تحریروں کو شعر کا جامہ پہنانے کا ایک جواز یہ سمجھ میں آتا ہے کہ انھیں اپنی انفرادیت کا لوہا منوانا مقصود رہا ہوگا۔ نظمیہ شاعری کے لیے آزاد اور حالی کی کوششوں کی طرف دھیان جاتا ہے۔ ۱۸۷۴ء میں کرنل ہالرائڈ کی سر پرستی میں جو مشاعرہ ہوا تھا اس میں عنوانات کے تحت نظمیں پڑھی گئی تھیں۔ لکھنؤ والوں کو یوں بھی دہلی والوں سے اپنی الگ شناخت پر اصرار تھا۔ چودہ سال بعد ۱۸۸۸ء میں دوارکا پرساد افق کا 'نظم' اخبار منظرِ عام پر آتا ہے۔ ان چودہ برسوں میں علی گڑھ تحریک شعر و ادب کو ایک سمت و رفتار دینے میں کافی حد تک کامیاب ہو چکی تھی۔

مگر افسوس یہ ہے کہ لکھنؤ کی صحافتی دنیا میں اس کے مثبت پہلوؤں کو دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی گئی۔ جس کا انجام زمانے نے دیکھا۔ ممکن ہے نظمیہ اخبار نکالنے میں کہیں تہہ نشیں یہ خیال ہو کہ لکھنؤ کے باہر مشاعروں میں غزل کے بجائے نظم کو اہمیت دی گئی تو کیوں نہ اس صنف میں ایک

Scanned with CamScanner

اخبار نکال کر اپنی جدت طرازی کا ثبوت پیش کیا جائے۔

انیسویں صدی کے اوائل میں بہت سے اخبار نکلنا شروع ہو گئے تھے۔ جام جہاں نما، ۱۹۲۲ء کلکتہ اردو کا پہلا اخبار۔ لاہور سے 'کوہ نور'، دہلی سے مولوی محمد باقر کا 'دہلی اردو اخبار' ۱۹۳۶ء، مرزا پور سے 'خیر خواہِ ہند' فوائد الناظر، ماسٹر رام چندر کی ادارت میں محب وطن، علی گڑھ سے سرسید کے بھائی کا سید الاخبار اور سرسید کا انسٹی ٹیوٹ گزٹ اپنی صحافتی خدمات انجام دے رہے تھے۔ غرض ملک کے مختلف مقامات سے اخبارات کی اشاعت عمل میں آ رہی تھی۔

انیسویں صدی کی ابتدائی نصف صدی میں مغربی تسلط نے سیاسی سطح پر تو اپنی بنیادیں مضبوط کر ہی لی تھیں، مگر تہذیبی حیثیت سے وہ ہندوستانیوں پر غلبہ نہیں حاصل کر پا رہے تھے۔ اپنی اسی تہذیبی حیثیت کے تحفظ اور بقا کے لیے اودھ پنچ زندگی بھر قلمی جنگ لڑتا رہا۔ تاہم وقت کے بدلتے تقاضوں پر اس کی نظر اتنی نہیں رہی جتنی بدلتے ہوئے وقت کی آہٹ محسوس کرنے والوں پر تھی۔ بہر حال یہ ایک الگ بحث ہے۔ اردو صحافت کے حوالے سے منشی دوارکا پرساد افق کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔ وہ بیک وقت مسلم الثبوت شاعر، ادیب اور صحافی تھے۔ رامائن، مہابھارت، شریمد بھاگوت کا اردو ترجمہ سرمایۂ اردو میں ان کی بیش بہا خدمت ہے۔ وہ مختلف اردو اخبارات سے وابستہ رہے۔ 'پنجاب سماچار' 'دھرم سجیون' کے علاوہ لکھنؤ کا 'اودھ اخبار' بھی ن کی خدمات کو فراموش نہیں کر سکتا۔

افق کی صحافت سے پہلے لکھنؤ کے تین اخبارات خاص اہمیت کے حامل تھے۔ 'طلسمِ لکھنؤ' ۲۵/ جولائی ۱۸۵۶ء، ہفتہ وار 'سحر سامری' ۱۷/ نومبر ۱۸۵۶ء اور اودھ اخبار ۲۸/ نومبر ۱۸۵۷ء۔ موخر الذکر دونوں اخبار کے مدیران غیر مسلم تھے۔

افق کا گھریلو ماحول ادبی تھا۔ صحافت سے دلچسپی گویا انھیں وراثت میں ملی تھی۔ دہلی کی تباہی کے بعد بہت سے خاندان لکھنؤ میں آ کر مقیم ہو گئے۔ ان کے اجداد لکھنؤ کے محلّہ نوبستہ میں آباد ہوئے۔ یہیں ان کے والد نے اپنا پریس 'مطبع تمنائی' کے نام سے قایم کیا۔ ان کے بڑے بھائی

Scanned with CamScanner

(۳)

ظرافت' نکالا کرتے تھے۔ جس کا سنہِ اشاعت بقول امداد صابری یکم ستمبر ۱۸۸۲ء تھا۔ ڈاکٹر کوہل نے سنہِ اشاعت ۱۸۸۴ء لکھا ہے جسے سلمان علی خان نے اپنے مضمون میں غلط بتایا ہے۔ ۳۶ صفحات پر مشتمل ایک ماہنامہ اخبار 'دربار' بھی ۱۲/ دسمبر ۱۹۱۱ء کو نکالا۔ سرورق پر تمنا کا درج ذیل قطعہ بھی چھپتا تھا:

دربار ہے کہ بزمِ شان و وقار یہ ہے
باغِ سخن وری کی تازہ بہار یہ ہے
قدر اس کی اے تمنا کسو دل سے ہے مناسب
دربار تاج پوشی کی یادگار یہ ہے

تمنا 'گلدستۂ سخن' نام سے ماہانہ رسالہ بھی نکالتے تھے۔ بقول افق کی پوتی ڈاکٹر کوہل بھٹناگر ان کے خاندان سے پانچ اخبارات نکلا کرتے تھے۔ منشی دوارکا پرساد افق کو شعر و ادب اور صحافت کا یہ ماحول ملا تھا۔ امداد صابری نے اپنی مشہور کتاب تاریخِ صحافت اردو، جلد سوم میں گلستانِ سخن کا ذکر کرتے ہوئے افق کے اخبار 'نظم' کا بھی ذکر کیا ہے۔ (۶)

'نظم' اخبار ماہ میں دو بار شایع ہوتا تھا۔ اخبار 'نظم' کے پہلے صفحہ پر درج ذیل شعر درج کیا جاتا تھا:

اے تمنائے تمنا و تمنائے افق
گشت نظم اخبار مہر عالم آرائے افق

اداریہ مثنوی کی شکل میں لکھا جاتا تھا۔ جس میں اخبار کے اغراض و مقاصد بیان کیے جاتے تھے۔ ایک بند مثال کے طور پر:

مچادے افتخارِ نظم کی دھوم
دکھادے جلوۂ اخبار سے دھوم

Scanned with CamScanner

مہینے میں ہو جوشِ نظم دو بار | بنے ماہ دو ہفتہ جس میں اخبار
ظرافت کا نیا انداز دکھلائے | مذاقِ فکر کا اعجاز دکھلائے
ضمیمہ میں بہارِ نثر دکھلائے | جمالِ گل عذارِ نثر دکھلائے

ازلیہ خبروں میں حالاتِ حاضرہ پر ردِ عمل، تبصرہ اور حکومت کے رویوں پر طنز ہوتا تھا۔ انگریزی حکومت کے خلاف آواز بلند کرنا، حب الوطنی کے جذبات پیدا کرنا، عوام میں بیداری کی لہر دوڑانا اخبار کا مقصد تھا ایک حسین طوائف کی بے وفائی سے اس کے عاشق میراں بخش نے اس کی ناک کاٹ لی تھی۔ معاملہ عدالت تک پہنچا۔ امداد صابری نے اس نظم کا ذکر کرتے ہوئے نظم بھی پیش کی ہے۔ نظم دلچسپ ہے۔ چند اشعار اس طرح ہیں :(۷)

شاہ کابل ہندوستان میں لارڈ گورنر سے ملاقات کرتے ہیں۔ اس خبر کو اس طرح پیش کیا:(۱۱)

خبر مشہور کرتے ہیں یہ اخبار
کہ یاں آئے گا پھر کابل کا سردار
جو ملنا لاٹ صاحب سے ہے منظور
تو ہوگا تختگاہِ خاص سے دور

اسی طرح شاہِ ایران ہندوستان آتے ہیں اور ۵/ مارچ کے نظم اخبار میں منظوم خبر اس طرح شایع ہوئی:

جو ایراں کے شہرِ کشورستاں ہیں
نظیرِ سنج و نوشیرواں ہیں
حرم پہ ساتھ ان کے چشمِ بد دور
جو خلدِ خطۂ ایراں کے ہیں حور

ہندوستانی ۱۸۵۷ء کی جنگ ہار چکے تھے لیکن اس شکست نے انھیں قومی ہم آہنگی اتحاد اور بھائی چارگی کا سبق سکھایا۔ آل احمد سرور لکھتے ہیں:

Scanned with CamScanner

''شورش ناکام رہی مگر اس کی وجہ سے ہندوستانی قوم کا تصور
ابھرا۔اسی نے بالآخر ہندوؤں اور مسلمانوں کو محض مذہبی بنیادوں
سے بلند ہوکر سیاسی مقاصد کی خاطر متحد ہونے کا درس دیا۔اس نے
یہ دکھادیا کہ عوام اگر جوش میں آجائیں تو کیا قیامت برپا کرسکتے ہیں
اس لیے اس واقعے کی یادگار منانا اور اس سے اپنی قوم اور ملکی جدوجہد
کی تاریخ شروع کرنا بالکل فطری ہے۔'' (۸) (افکار کے دیئے
ص ۴۷، آل احمد سرور، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۰)

پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب نے ان کے نظم اخبار کو ''ان کی پرگوئی اور زود گوئی کا شاہد'' کہا ہے۔لکھتے ہیں:

''انھوں نے (افق) غزل سے زیادہ نظم کی طرف توجہ کی۔وہ تمام اصنافِ سخن پر قادر تھے اور
ان کی نظموں کا میدان بہت وسیع تھا۔ان کا نظم اخبار
جو تقریباً تمام نظم میں ہوتا، ان کی پرگوئی اور زود گوئی کا شاہد ہے۔ان کا تصنیفی سرمایہ مقدار اور
معیار دونوں حیثیتوں سے قابلِ قدر ہے۔''

آگرہ اخبار نے اپنے اخبار میں افق کے اس اخبار کی تعریف وتوصیف اس طرح کی ہے:

نظم اخبار کس انداز سے نکلا دیکھو
اب تلک ہند میں جو تم نے نہ دیکھا دیکھو
اور اس باغ میں طوفانِ تماشا دیکھو
بلبلِ باغ کو یوں زمزمہ پیرا دیکھو
جس سے کانوں میں صدا لطفِ سخن کی آئے
جو ہوا آئے وہ تا تارِ ختن کی آئے

پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب نے افق کے نظم اخبار کو ''ان کی پرگوئی اور زود گوئی کا

Scanned with CamScanner

شاہد" کہا ہے۔

"انھوں نے (افق) غزل سے زیادہ نظم کی طرف توجہ کی۔ وہ تمام اصنافِ سخن پر قادر تھے اور ان کی نظموں کا میدان بہت وسیع تھا۔ ان کا نظم اخبار جو تقریباً تمام نظم میں ہوتا، ان کی پرگوئی اور زود گوئی کا شاہد ہے۔ ان کا تصنیفی سرمایہ مقدار اور معیار دونوں حیثیتوں سے قابلِ قدر ہے۔" (۹)

آل احمد سرور لکھتے ہیں:

"ادب روحِ عصر رکھتا ہے۔ وہ وقت کے تقاضوں سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ جب ہم اس سر بفلک پہاڑوں کو دیکھتے ہیں جو اپنے جلال و جمال کی وجہ سے ہم میں ایک پراسرار کیفیت پیدا کر دیتے ہیں ہمیں ان چھوٹے چھوٹے پہاڑی نالوں، سبزوادیوں اور گرتے ہوئے آبشاروں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے جو ان پہاڑوں کی متاع سے میدانوں کی جھولی بھر دیتے ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم موجودہ دور کے ہر واقعے کو تاریخی اہمیت کا حامل اور اس کی ہر موج کو ایک دریا سمجھ لیں۔ ہر کتاب کو حرفِ آخر، ہر ادیب کے کارنامے کو عظیم اور ہر شخص کو عہد آفریں کہنے سے یہ الفاظ اپنا مفہوم کھو بیٹھتے ہیں۔" (۱۰)

اس تناظر میں اگر ہم دیکھیں تو سر بہ فلک صحافت کے پہاڑوں میں نظم اخبار ایک ایسا آبشار ہے جس کی مترنم آواز ہمیں اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ افق کی شخصیت بلاشبہ تاریخی اہمیت تو رکھتی ہی ہے۔

حیرت ہے کہ رام بابو سکسینہ نے اپنی کتاب کے ۱۶ ویں باب میں اخبارات و رسائل پر روشنی ڈالی لیکن نظم اخبار کا ذکر نہیں کیا۔ اسی طرح ابواللیث صدیقی لکھنؤ کی شاعری میں افق کو جگہ نہیں دیتے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ افق کی ادبی و صحافتی خدمات کو سنجیدگی سے نہیں لیا گیا۔ پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں:

Scanned with CamScanner

"لکھنو نے دہلی کے تعلق کو ایک زنجیر سمجھا اور اس زنجیر کو توڑ کر اپنے آپ کو حقیقت سے علاحدہ کر کے مکمل فریب میں مبتلا کر دیا۔ اسی وجہ سے لکھنو کا ادب دہلی کی ادبی روایت سے الگ ہو گیا اور اس نے اپنی روایات اپنے فنی اصول اور اپنے معیار جدا مقرر کیے۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ ادبی خود مختاری جو اس زمانے میں چاہے کتنی ہی فطری معلوم ہوتی ہو، صحیح تھی یا غلط اور اس خود مختاری کا اردو ادب کی عام رفتار پر کیا اثر ہوا۔" (۱۱)

اگر دیکھا جائے تو اس خود مختاری کا اردو ادب کی عام رفتار پر یہ اثر ہوا کہ منشی دوارکا پرساد جیسی ہمہ جہت شخصیت جس نے ۵۳ سال کی مختصر زندگی میں بڑے بڑے ادبی کارنامے انجام دیے، اسے وقت نے فراموش کر دیا۔ ادب و صحافت پر ڈھیروں کتابیں لکھی جاتی رہی ہیں لیکن افق کو نظر انداز کیا گیا۔

یہ کیا کم تھا کہ منشی دوارکا پرساد افق کی دلچسپ صحافت نے بالخصوص لکھنؤ کے مخصوص ذہنیت کے عوام میں اخبار بینی کا رجحان عام کیا۔ یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ لکھنو کا جو مزاج تھا اس کے پیشِ نظر دہلی والوں میں لکھنؤ کی احساس برتری کا سکہ بھی جمانا مقصود رہا ہوگا۔ تاہم یہ اخبار لکھنؤ والوں کے ذوقِ سلیم کی تسکین کا صرف سامان ہی فراہم نہیں کر رہا تھا بلکہ اہلِ لکھنؤ کو وقت کی رفتار کا احساس بھی دلا رہا تھا۔

یوں بھی دوارکا پرساد افق کا ادبی اور صحافتی سفر اسی لکھنو کے لہلہاتے ادبی مرغزاروں سے ہو کر گزرا تھا۔ تاہم جس رہگزر پر وہ چل رہے تھے، اس کا رخ بہر حال انھوں نے عصرِ حاضر کی طرف رکھا۔ حالاتِ حاضرہ سے وہ بے خبر نہیں رہے۔ خبر کو نظمیہ رنگ میں پیش کرنا آسان نہیں۔ صحافت کی دنیا میں یہ جدت طرازی معمولی بات نہیں۔ یہ افق جیسی بے پناہ صلاحیتوں کی مالک شخصیت ہی کر سکتی تھی۔

Scanned with CamScanner

حواشی

۱۔ آل احمد سرور۔ مسرت سے بصیرت تک۔ ص ۳۵ دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۴ء

۲۔ مرزا جعفر حسین۔ قدیم لکھنؤ کی آخری بہار۔ اڈیشن دوم، قومی کونسل، دہلی ص ۵۴۲

۳۔ مرزا جعفر حسین۔ قدیم لکھنؤ کی آخری بہار۔ اڈیشن دوم، قومی کونسل دہلی ص ۵۴۲

۴۔ ابواللیث صدیقی ۔ لکھنؤ کا دبستانِ شاعری ص ۳۰

۵۔ رام بابو سکسینہ ۔ تاریخ ادب اردو ص ۲۰۰۔ جدید ایڈیشن اگست ۲۰۰۰ء

۶۔ امداد صابری۔ تاریخ صحافت اردو، جلد سوم ص ۴۱، ۳۹۔ بحوالہ نیا دور ص ۱۶۲۔ ستمبر ۲۰۱۴ء

۷۔ امداد صابری۔ تاریخ صحافت اردو۔ بحوالہ نیا دور ص ۱۶۲۔ ستمبر ۲۰۱۴ء

۸۔ افکار کے دیئے۔ آل احمد سرور۔ ص ۴۷، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۰

۹۔ بحوالہ ''دوارکا پرشاد افق'' مرتبہ ڈاکٹر کومل بھٹناگر، ص ۱۷۲۔ نیا دور

۱۰۔ پروفیسر آل احمد سرور۔ افکار کے دیے۔ ص ۹۵

۱۱۔ آل احمد سرور۔ مسرت سے بصیرت تک۔ ص ۳۶ دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۴ء

☆☆☆

ڈاکٹر نفیس بانو

وارانسی

Scanned with CamScanner

منظوم صحافت کے موجد افق لکھنوی

لکھنؤ میں اردو صحافت کی قدیم اور انتہائی مالدار روایت رہی ہے۔ صحافت کو یہاں رفتار ہی نہیں نئے رنگ و روپ بھی حاصل ہوئے۔ اردو کو پہلا روزنامہ 'اودھ اخبار' لکھنؤ سے ہی ملا۔ ظریفانہ صحافت کا سب سے روشن نقش 'اودھ پنچ' یہیں وضع ہوا اور منظوم صحافت کے آغاز کا شرف بھی اسی شہر کو حاصل ہے۔ 'نظم اخبار' (لکھنؤ) نام سے اردو کا یہ پہلا منظوم اخبار ۱۵ اگست ۱۸۸۸ کو دبستان لکھنؤ کے قادر الکلام شاعر اور صاحب طرز صحافی منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی (۱۸۶۴-۱۹۱۳) کے نوک قلم سے نکلا۔

ادب اور صحافت افق لکھنوی کو وراثت میں ملی تھی۔ شاعری تو اس گھرانے میں کئی پشتوں سے جاری تھی ہی ۱۸۷۵ میں جب دوارکا پرشاد افق ۱۱ برس کے تھے، ان کے والد منشی پورن چند نیساں نے لکھنؤ میں اپنا پریس لگایا اور ہفت روزہ 'اخبار تمنائی' جاری کیا۔ اس کی ادارت افق لکھنوی کے بڑے بھائی تمنا کے سپرد تھی۔ یکم ستمبر ۱۸۸۲ کو اسی مطبع تمنائی سے ایک اور اخبار ہفت روزہ 'مہر ظرافت' اور ۱۸۸۴ میں 'گلدستہ سخن' بھی جاری ہوئے۔ افق لکھنوی کا کارنامہ یہ ہے کی انہوں نے اس روایت کی کو توسیع کے ساتھ ساتھ اسے جدتوں اور نئے فکری دھاروں سے بھی جوڑا۔ 'نظم اخبار' افق لکھنوی کی جدت طبع، خلاقانہ مہارت اور پر گوئی کا بولتا ہوا ثبوت ہے۔ یہ پندرہ روزہ اخبار ہر مہینے کی پانچ اور بیس تاریخ کو شائع ہوتا تھا۔ ۸ صفحات کے اس چار کالمی اخبار میں تمام اچھی بری خبریں نظم کے پیرائے میں بیان کی جاتی تھیں۔ لوح پر اردو کے ساتھ انگریزی میں بھی نام درج ہوتا۔ سالانہ چندہ چار روپے تھا۔ افتتاحی شمارے میں افق لکھنوی نے مثنوی کی ہیت میں ۴۲ اشعار پر مشتمل جو منظوم اداریہ تحریر کیا ہے، وہ 'نظم اخبار' کا صحافتی منشور بھی تھا:

مچادے افتخار نظم کی دھوم　　دکھادے جلوے اخبار منظوم

Scanned with CamScanner

ہر ایک انداز کے مضموں ہوں اس میں
مطالب نثر کے موضوع ہوں اس میں

ہو بہر مرگ مضموں فکر صیاد
رہے خامہ مثال سرو آزاد

ملے غافل جو محو خواب آرام
تو یہ پانی کے چھینٹے کا کرے کام

قمر ہو یہ قتان جہل بد کو
ہو پانی آتش جہل و حسد کو

بنے یہ مخبر حالات عالم
دوائر سب ہوں اس کے ساغر جم

رعایا کا دل و جاں سے ہو غمخوار
رہے ہر دم مطیع سرکار

غرض اخبار کے جو جو ہیں منصب
وہ سب اس میں ہوں نظر ارزانصب

اردو میں ہنگامی شاعری نئی بات نہیں۔ کسی واقعے یا سانحے کو فوری طور پر روداد کی شکل میں نظم کرنے کے عملی نمونے ابتدا سے ہی ملتے ہیں۔ پہلی جنگ آزادی کے دوران مجاہدین کی معرکہ آرائی پر 'دہلی اردو اخبار' (۲۴ مئی ۱۸۵۷) میں شائع مولوی محمد حسین آزاد کی نظم ایک منظوم رپورٹ ہی ہے۔ 'اودھ پنچ' میں بھی ایسی مثالیں ہیں لیکن باقاعدہ منظوم صحافت بلاشبہ 'نظم اخبار' سے ہی عبارت ہے۔ 'نظم اخبار' کی فائل تو نہیں ملتی لیکن خبروں کے جو اقتباسات ہم تک پہنچے ہیں ان سے اس کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ قیاس اور جذباتیت وغیرہ صحافت کا عیب ہے اور شاعری جذبات، احساسات اور تخیل کے دھاروں پر ہی سفر کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے میں منظوم صحافت دو دھاری تلوار پر چلنے کا کام ہے۔ ذرا سی چوک ہوئی اور مفہوم غارت لیکن افق لکھنوی نے خبروں کو شعر کے سانچے میں اس کمال فن سے ڈھالا ہے کہ نہ صحافت پر حرف آیا ہے اور نہ ہی شعریت ہی مجروح ہوئی ہے۔

'نظم اخبار' میں خبر نگاری کے لئے یوں تو شاعری کے تمام سانچوں کا بخوبی استعمال کیا گیا ہے لیکن غزل اور مثنوی کی کثرت ہے۔ خبریں سنجیدہ بھی ہیں ظریفانہ بھی۔ جیسی خبر، پیرایہ اظہار بھی ویسا ہی۔ خبر تھی کہ لاہور میں بے وفائی سے ناراض عاشق نے ایک طوائف کی ناک کاٹ لی۔ اب

Scanned with CamScanner

دیکھیئے کہ راقی لکھنوی نے اس میں مزاح ہی نہیں، ہجو ملیح کے کیسے شوخ رنگ بھر دیئے۔ ملاحظہ ہو:

یہاں کی ہے طوائف ایک مشہور۔ پرستاں کی پری فردوس کی حور
زمانے میں ہے دارو نام اس کا۔ تھا یوسف بندۂ بے دام اس کا
ہے لب عشاق کو جاں بخش اس کا۔ تھا یار غار میراں بخش اس کا
محبت میں بہم شیر و شکر تھے۔ گل و بلبل پئے اہل نظر تھے
فلک نے تفرقہ کی رہ نکالی۔ گرہ دارو کے نازک دل میں ڈالی
سر عاشق پہ مارا خنجر جور۔ جو اپنے لئے ڈھونڈ لیا کوئی اور
نہ میراں بخش کی سمجھی قدامت۔ جفا سے بند کی صاحب سلامت
ہوا بے تاب میراں بخش کا دل۔ جگر سینے میں تڑپا مثل بسمل
رکھی دارو کے اٹھنے بیٹھنے کی تاک۔ کسی دن پا کے موقع کاٹ لی ناک
گئی جب بے رخی سے اس طرح ناک۔ نہ تاب آئی ہوئی دارو غضبناک
رخ مطالب پہ کی غازے کی مالش۔ عدالت چڑھ کے کی عاشق پہ نالش
جہاں کو اس خبر کی آگہی ہے۔ بس اب پیشی پہ پیشی ہو رہی ہے

یہ محض قافیہ پیمائی نہیں۔ اخبار نویسی کے ساتھ کیا خوب شاعری بھی ہو رہی ہے۔ یہ خبر اور اب ذرا کاٹھیاواڑ کے بے خوف ڈاکوؤں، جو پولس کو چھکائے ہوئے تھے، کی خبر کا یہ انداز ملاحظہ ہو:

عجب سرکش ہیں اس خطے کے ڈاکو۔ بجا ہے گر کہیں ان کو ہلاکو
ہیں ان کے شور و شر سے زیر شہزور۔ کسی کے رعب سے دبتی نہیں کور
کیا اہل پولس کو حال میں تنگ۔ دکھا کر جوہر شمشیری کی جنگ

'نظم اخبار' کی صحافت سپاٹ اور معروضی نہیں تھی۔ اس میں اہم سیاسی اور سماجی خبروں کو دلچسپ پیرائے میں بیان کیا جاتا اور جہاں ضروری ہوتا، خبر کا پس منظر اور اس پر ناقدانہ تبصرہ بھی کیا جاتا،

Scanned with CamScanner

کہیں بالواسطہ اور کہیں براہ راست۔ حکومت نے انکم ٹیکس لگانے کی سوچی تو بیشتر دیسی اخباروں نے اس پر سوال کھڑے کئے۔ 'نظم اخبار' نے بھی یہ اشو اٹھایا، لیکن اپنے انداز میں۔ مارچ ۱۸۹۰ کے شمارے میں شامل ٹیکس پر خبر دار کرتی 'نظم اخبار' کی یہ خبر ملاحظہ ہو:

ذرا اے ہند تو ہشیار ہو جا۔ ٹیکس کے واسطے تیار ہو جا
ٹیکس صاحب کے بانی آئیں گے گھر۔ خزانے دیسیوں کے جائیں گے پھر
نہ ہو افلاس و ناداری سے خائف۔ خزانے کھول دے بہر تحائف
مہیا ساز و سامان حشم کر۔ مسافر مہمانی کے بہم کر

'نظم اخبار' کے ساتھ چار صفحات کا ایک نثری ضمیمہ بھی ہوتا، جس میں بعض رپورٹ اور مضامین شامل ہوتے تھے۔ کچھ خاص خبروں پر آفق لکھنوی مختصر ادارتی نوٹ بھی لکھتے۔ یہ چند جملے بڑے کام کے ہیں۔ آفق لکھنوی کو صحافت کی ذمہ داریوں اور حرمت کا دھیان بھی تھا اور انہوں نے اس کی پاسداری بھی کی ہے۔ 'انبالہ گزٹ' کے اڈیٹر لالہ ہربنس رائے پر فحش نگاری اور کئی اور مدیروں پر مختلف غیر ذمہ داریوں کے سبب کیس ہوا، تو آفق لکھنوی نے ۲۰ ستمبر ۱۸۸۸ کے شمارے میں نہ صرف ان خبروں کو اپنے اخبار کا حصہ بنایا بلکہ اس پر تلخ تبصرہ بھی کیا:

'ہم افسوس کے ساتھ مندرجہ ذیل مقدمات کا ذکر کرتے ہیں جو ایڈیٹران اخبار پر قائم (ہوئے ہیں اور) ان (کی) حرمت اور ان کی آبرو پر دھبہ لگاتے ہیں۔ ایڈیٹران اخبار ملکی ریفارمر سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے واسطے ایسے مقدمات نہایت شرمناک ہیں۔'

یہ وہ زمانہ ہے جب شاعری زندگی کا حصہ تھی۔ خواص ہی نہیں عوام میں بھی شعر و سخن کے سلسلے تھے۔ ایسے میں 'نظم اخبار' نے قاری کو خبروں کا ایک نیا انداز، ایک نیا ذائقہ دیا۔ جس نے بھی پڑھا اس کا مرید ہو گیا۔ شعر و سخن کا مذاق رکھنے والوں کے لئے تو یہ دو آتشہ کی مانند تھا۔ ہم عصر اخبار و رسائل

Scanned with CamScanner

نے بھی اس کی دل کھول کر ستائش کی ہے۔ 'سلطان الاخبار' بنگلور نے ۵ فروری ۱۸۸۹ کے شمارے میں 'نظم اخبار' کے رنگ و آہنگ پر یوں تبصرہ کیا تھا:

'نظم میں فصاحت کے ساتھ شاعرانہ اسباب موجود۔ حشو نظم اخبار کے کلام سے مفقود۔ خبروں کو موتیوں کے مالا میں ایسا پرو دیا ہے گویا دریا کو کوزے میں بند کیا ہے۔ کہیں مسدس، کہیں رباعیات اور کہیں غزلیات کی دھوم ہے۔ ہر ایک شعر میں زمانہ کی حالت اور نیچرل مضامین کا ہجوم ہے۔ ایڈیٹر نے اپنی طبیعت کے ایسے جوہر دکھائے کہ سے ساختہ کہنا پڑتا ہے کہ شعر گوئی اس کا نام ہے۔ منشی دوارکا پرشاد افق نے ہندیوں پر ثابت کر دیا کہ ابھی ہندوستان کی خاک میں وہ ذرہ ہے کہ جس طرف متوجہ ہو وہ کام کر دکھائے کہ اہل یورپ سے نہ بن پڑے۔'

ایک اور ہم عصر 'آگرہ اخبار' آگرہ نے تو اس منظوم اخبار پر تبصرہ بھی منظوم ہی شائع کیا۔ یہاں بھی افق لکھنوی کی ندرت فکر اور قدرت کلام کا قصیدہ پڑھا گیا ہے۔ اس منظوم تبصرے کے دو بند ملاحظہ ہوں:

شکر صد شکر کہ پھولی چمنستاں میں بہار　　صفحہ کاغذ کا بنا تختہ خط بہار

مرحبا فرقہ تعالیٰ ارباب دیار۔ سیکیے گلشن سے ذرا زمزمۂ ہود ہزار

واہ کس رنگ سے گلزار سخن پھل لایا

نظم اخبار نہ تھا ہند میں وہ بھی آیا

پھول گل کھائے اگر دیکھ لے رنگ تحریر۔ خار کھائے جو سنے بلبل نالاں تقریر

ماہ کا داغ ہو دیکھے تو سخن کی تنویر۔ گھٹ کے خورشید جہاں تاب بنے ذرہ نظیر

شمع جل جائے اگر چرب زبانی دیکھے

Scanned with CamScanner

'نظم اخبار' میں خبر نویسی کے لئے میں افق لکھنوی کو اپنے بڑے بھائی منشی رام سہائے تمنا اور منشی ماتا پرشاد نیساں کا قلمی تعاون بھی حاصل تھا۔ تقریباً چار برس تک کامیابی سے نکلنے کے بعد 'نظم اخبار' ۱۸۹۲ میں ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔ لیکن اس مدت میں اس نے جو نقش بنائے وہ کہیں نہ کہیں آج بھی تازہ ہیں۔ افق لکھنوی نے اخبار کی ترتیب میں سماجی سروکار، صحافتی تہذیب، حقائق کی حرمت، اظہار میں توازن اور زبان کی معیار بندی کا بہر حال دھیان رکھا۔ یہ وہ دور ہے جب لکھنؤ سے 'طلسم لکھنؤ'، 'سحر سامری'، 'اودھ اخبار' اور 'اودھ پنچ' جیسے بڑے اور موقر پرچے نکل رہے تھے لیکن افق لکھنوی نے اپنی ندرت فکر اور فنکارانہ برتاؤ سے 'نظم اخبار' کو مقبولیت اور منفرد شناخت بخشی۔ اردو صحافت کی کوئی بھی تاریخ 'نظم اخبار' اور افق لکھنوی کے ذکر کے بغیر ہمیشہ ادھوری ہی رہے گی۔

☆☆☆☆

لئیق رضوی

laeeqrizwi@yahoo.co.in

Scanned with CamScanner

لکھنؤ کی تہذیب وثقافت کا عکاس ناول ''امراؤ جان ادا''

دوار کا پرساد افق، کا عہد انیسویں صدی کا آخری ربع اور بیسویں صدی کی پہلی اور دوسری دہائیاں ہیں۔ تقریباً 50/ برسوں کا یہ عہد نہ صرف لکھنؤ بلکہ پورے ہندوستان کے لیے کئی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب ہندوستانیوں کے عزم وحوصلوں کے دم پر شروع ہونے والی پہلی جنگ آزادی، ناکامی کا شکار ہوئی۔ انگریزوں نے نہ صرف اسے کچل ڈالا بلکہ اپنے مظالم میں حد درجہ اضافہ کر دیا تھا۔ سیاسی، سماجی، معاشی اور تعلیمی پسماندگی نے خصوصاً مسلمانوں اور عموماً ہندوستانیوں کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ پورے سماج میں مایوسی کی کثیف دھند چھائی ہوئی تھی۔ نامرادی، کم ہمتی، بے بسی، مجبوری نے سماج کے پسماندہ طبقات کو دانے دانے کو مجبور کر دیا تھا۔ جب کہ دوسرا طبقہ دولت وثروت کی فراوانی کے سبب عیاشی، تفریح، سستی اور کاہلی میں ملوث ہوتا جا رہا تھا۔

ادب کے منظر نامے میں میر امن اور غالبؔ کی نثر کو سہل بنانے کی کوششیں، انیس و دبیر کی مرثیہ نگاری اور میر حسن اور نسیم کی مثنوی کو اعتبار بخشنے کی کاوشوں نے پس منظر کے طور پر ایک صحت مند روایت قائم کی تھی۔ سر سید اور ان کے رفقا کی تحریک، نذیر اور سرشار کی اصلاحی کوششیں، حالی اور محمد حسین آزاد کی نئی روشنی، منشی سجاد حسین، اکبر الہ آبادی، ٹیگور، سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش، نیاز فتح پوری کی روایت شکنی نے ادب کا منظر نامہ ہی بدل کر رکھ دیا تھا۔ حقیقت کو پیش کرنے کے نئے نئے طریقے سامنے آ رہے تھے۔ اب مافوق فطرت عناصر کی جگہ انسانی زندگی کے شب و روز نے لے لی تھی۔

ملک کا یہ ادبی ماحول، لکھنو سے اچھوتا نہیں تھا۔ نوابین کا شہر لکھنؤ، محلوں اور حویلیوں کا لکھنؤ، طوائف زادیوں کے رکھ رکھاؤ اور ادب وتہذیب کا گہوارہ تھا۔ نظم، غزل، ناول، افسانہ ہر صنف میں لکھنؤ کی تہذیب پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر تھی۔ یہاں کے آداب، زبان کے

Scanned with CamScanner

چٹخارے، لباس کا خاص سلیقہ، خادموں کا ہجوم، ہر کام، ہر شئے میں نوابی ٹھاٹ باٹ۔ لکھنؤ کے اس ماحول کو ناول نے بڑی عمدگی سے کہانی کے قالب میں ڈھالنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں مرزا ہادی رسوا نے فنی مہارت سے اپنے ناولوں میں لکھنؤ کی تہذیب و ثقافت، طرز معاشرت اور سیاہ و سفید کو پیش کیا ہے۔

یوں تو مرزا ہادی رسوا نے کئی ناول تحریر کیے۔ متعدد کا ترجمہ بھی کیا۔ لیکن ان کو اصل شہرت ان کے ناول ''امراؤ جان ادا'' نے عطا کی۔ یہ ناول کئی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ ہمارے بعض ناقدین اسے اردو کا پہلا باضابطہ اور مکمل ناول قرار دیتے ہیں جب کہ وہ ڈپٹی نذیر احمد، سرشار اور شرر کے ناولوں کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کرتے۔ بعض اسے نفسیاتی ناول نگاری کی بھی شروعات مانتے ہیں۔ یہی نہیں لکھنوی تہذیب و تمدن کا اعلیٰ نمونہ بھی قرار دیا جاتا ہے۔ دوسری طرف عورتوں کی زندگی، ان کے حالات، ان کے مسائل، مرد سماج میں اس کا مقام وغیرہ کی سچی تصویر کے ساتھ ساتھ عورت کو اس حالت سے باہر آنے کی ہمت اور حوصلہ وغیرہ کے تعلق سے بھی یہ ناول اردو کا پہلا ناول ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں لکھنوی تہذیب اور تانیثیت کے عناصر کی بہترین نمائندگی امراؤ جان ادا میں موجود ہے۔ 'امراؤ جان ادا' میں لکھنوی تہذیب و ثقافت کے تعلق معروف فکشن ناقد ڈاکٹر یوسف سرمست لکھتے ہیں:

> ''امراؤں جان ادا' اپنی اس خصوصیت سے آغاز ہی سے نہ صرف قاری کی دلچسپی ہی کو اپنی طرف منعطف کر لیتا ہے بلکہ قاری خود بھی اپنے آپ کو اس ماحول میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ آغاز ہی سے لکھنؤ کی تہذیبی اور تمدنی زندگی اپنی خصوصیات سمیت آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتی ہے۔ ایک مشاعرہ میں قاری امراؤ جان ادا سے

متعارف ہوتا ہے۔ مشاعرے کے سلسلے میں لکھنؤ
کی مجلسی زندگی کے مختلف پہلو سامنے آنے لگتے
ہیں۔"

(بیسویں صدی میں اردو ناول، یوسف سرمست، ص 112-111، قومی اردو کونسل، نئی دہلی 1995ء)

اس ناول میں مرزا ہادی رسوا نے ۱۸۵۷ء سے قبل اور بعد کے لکھنؤ کی منظر کشی کی ہے۔ پورا ناول لکھنؤ کے ماحول، ادبی فضا، حسن و عشق کے معاملات، طوائفوں کی زندگی، بالا خانوں سے جھانکتی لکھنؤ کی زندگی، اعلیٰ طبقات کے شب و روز، بیگمات کے ناز نخرے، شہزادوں اور نواب زادوں کی آوارگیاں، مشاعرے، شعری نشستیں، دن کا ہنگامہ، رات کا شباب، جملے بازیاں، گالیوں کی سوغاتیں۔ الغرض پورے لکھنؤ کا سیاسی، سماجی، ادبی منظر نامہ نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ لکھنؤ سے ناواقف قاری کے ذہن میں بھی لکھنؤ کی تصویر واضح ہونے لگتی ہے۔ ایسی تصویر جس میں شوخ و سنگ رنگ، الہڑ حسیناؤں کا بانکپن، تہذیب و ثقافت کی جھلکیاں اور نوابی عہد کی پھولتی سانسوں کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ ناول کی شروعات ہی کچھ اس طرح ہوتی ہے:

"ناظرین! شانِ نزول اس قصے کی یہ ہے کہ دس
بارہ برس کا ذکر ہے میرے ایک دوست منشی احمد
حسین صاحب اطرافِ دہلی کے رہنے والے
بطریق سیر و سیاحت لکھنؤ میں تشریف لائے
تھے۔ انہوں نے چوک میں سید حسین کے پھا
ٹک کے پاس ایک کمرہ کرایہ کو لیا تھا۔ یہاں اکثر
احباب سرِ شام آ بیٹھتے تھے۔ بہت ہی لطف کی
صحبت ہوتی تھی۔ منشی صاحب کا مذاقِ شعر فہمی

Scanned with CamScanner

اعلیٰ درجہ کا تھا۔ خود بھی کبھی کبھی کچھ کہہ لیتے تھے
اور اچھا کہتے تھے۔ لیکن زیادہ تر ان کو سننے کا
شوق تھا۔ اس لیے اکثر شعر و سخن کا چرچا رہتا
تھا۔ اسی کمرے کے برابر ایک کمرہ اور تھا۔ اس
میں ایک طوائف رہتی تھی۔"

(ناول امراؤ جان ادا، مرزا ہادی رسوا، ص 15، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی)

ناول کی ابتدا ہی لکھنؤ کے جغرافیہ سے ہوتی ہے۔ چوک کا علاقہ، جہاں ناول نگار کے دوست منشی احمد حسین کرائے پر رہتے ہیں۔ وہ بغرض سیر و تفریح لکھنؤ آئے ہوئے ہیں۔ وہیں منشی احمد حسین کے کمرے سے ملحقہ کمرے میں ایک طوائف بھی رہتی ہے۔ مصنف یعنی مرزا ہادی رسوا لکھنؤ کے باسی ہیں۔ لکھنؤ ان کے ذہن و دل اور نس نس میں سمایا ہوا ہے۔ پروفیسر محمد حسن مرزا ہادی رسوا کے تعلق سے لکھتے ہیں:

"مرزا رسوا کا پورا نام مرزا محمد ہادی تھا، ۱۸۵۷ء
کے لگ بھگ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کے جدِ
اعلیٰ مرزا رشید بیگ مازندران (ایران) سے دہلی
آئے تھے اور وہاں فوج میں ملازم تھے۔ ان کے
بیٹے مرزا ذوالفقار بیگ اودھ آئے یہاں توپ
خانے میں افسر مقرر ہوئے۔ مرزا محمد ہادی کے وا
لد آغا محمد تقی، فنونِ جنگ سے واقف تھے مگر اسی
کے ساتھ ساتھ ریاضی، عربی، فارسی اور کسی قدر
انگریزی سے بھی واقف تھے۔ مرزا محمد ہادی
پندرہ سولہ برس کے تھے کہ والدین کا سایہ سر سے

Scanned with CamScanner

سے اٹھ گیا۔"

(ناول امراؤ جان ادا، مرزا ہادی رسوا، ص 5، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی)

اقتباسِ بالا سے واضح ہے کہ مرزا محمد ہادی رسوا کا لکھنؤ سے تعلق کئی پشتوں کا ہے۔ نہ صرف وہ بلکہ ان کے والد بھی اسی سرزمین لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے۔ یہی سبب ہے کہ رسوا کے دل و دماغ میں لکھنؤ نہ صرف منظر در منظر بسا ہوا ہے بلکہ ان کی نس نس میں خون بن کر دوڑ رہا ہے اور یہ کب ممکن تھا کی رسوا کی تحریروں میں اس کا اظہار نہ ہوتا۔ لکھنؤ ہی میں انہوں نے ابتدائی دور سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ کرسچن کالج میں عربی و فارسی کے مدرس مقرر ہوئے۔ شاعری سے بھی ذوق تھا۔ اوج کے شاگرد ہوئے۔ امراؤ جان ادا میں رسوا کی شاعری کے جوہر بھی جا بجا دکھائی دیتے ہیں۔ ناول کا ہر باب ایک شعر سے شروع ہوتا ہے اور اکثر شعری محفلوں اور مشاعروں میں بھی نہ صرف اشعار بلکہ پوری پوری غزلوں کا استعمال ہے۔ پورا ناول لکھنؤ کے ماحول اور تہذیب کو پیش کرتا ہے۔ یہی نہیں ناول میں سیاسی منظر نامہ اور اس کے اثرات کو بھی بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

> "سرشار کے فسانۂ آزاد کے طرز پر مرزا محمد ہادی رسوا، امراؤ جان ادا کی کہانی کو لکھنوی تہذیب تہذیب کے پس منظر میں سجاتے ہیں۔ پھر لکھنوی تہذیب کا بھی وہ دور جو اقدار کی تبدیلیوں سے دوچار تھا۔ امراؤ جان ادا اس پس منظر کا ایک لازمی جزو ہے، ڈاکوؤں کی شورہ پشتی، پرانے نوابوں کی طوائف نوازیاں، عشق و عاشقی کے چرچے اور سب سے بڑھ کر اس دور کی معاشرت کی جیتی جاگتی تصویریں امراؤ جان ادا

Scanned with CamScanner

میں ہر صفحے پر بکھری ہوئی ہیں۔ یہ جادو ایسا موثر
ہے کہ سرشار کے فسانۂ آزاد کے بعد امراؤ جان کو
لکھنوی تہذیبی زندگی کا سب سے کامیاب مرقع
کہا جاسکتا ہے۔''

(ناول امراؤ جان ادا، مرزا ہادی رسوا، ص 7، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی)

محمد حسن کی رائے مبنی بر حقیقت ہے۔ امراؤ جان ادا کے واقعات، مناظر، مکالمہ، کردار۔ سب پر لکھنوی تہذیب وتمدن کا گہرا اثر ہے۔ مرزا ہادی رسوا نے ناول میں غدر سے قبل کا لکھنؤ اور بعد کے لکھنؤ کو بھی پیش کیا ہے۔ مرزا نے ۱۸۵۷ء میں آنکھ کھولی تھی۔ غدر اور بعد کے واقعات خصوصاً نواب واجد علی شاہ عروج وزوال کے قصے سن چکے تھے۔ تہذیبی شکست و ریخت کا بغور جائزہ لیا تھا۔ انیسویں صدی کی آخری دہائی تک آتے آتے لکھنؤ کے تہذیب وتمدن میں جو زوال آیا تھا، رسوا اس سے نہ صرف واقف تھے بلکہ دل برداشتہ بھی تھے، دراصل تہذیب کا یہی زوال اس ناول کا موضوع بھی ہے۔ اکثر ناقدین 'امراؤ جان ادا' کے موضوع کے تعلق سے الگ الگ رائے رکھتے ہیں۔ کسی کی نظر میں ناول کا موضوع طوائف ہے تو کسی کا ماننا ہے کہ ناول کا موضوع غدر کے بعد کے حالات ہیں۔ کوئی اسے لکھنؤ کی تہذیب پر لکھا گیا ناول قرار دیتا ہے۔ ناول کے موضوع کی بحث میں حصہ لیتے ہوئے معروف ناقد، بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مرزا محمد ہادی کو 'رسوا' کرنے والے یعنی امراؤ جان ادا پر پہلی بار مفصل تبصرہ کرنے والے پروفیسر خورشید الاسلام لکھتے ہیں:

''امراؤ جان کا موضوع زوال ہے۔ یہ زوال
ایک خاص معاشرت کا ہے جو اودھ کے چند
شہروں میں محدود تھی۔ رسوا اس معاشرت کی
تصویر دکھانا چاہتے تھے، ان کے ذہن میں اس کا

Scanned with CamScanner

ایک تصور بھی تھا۔ان کے چاروں طرف اس کا
مواد بکھرا ہوا تھا اور یہ مواد آسانی سے گرفت میں
لانا محال تھا۔"

(مرزا رسوا کی ناولیں، خورشید الاسلام، ص 62، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 2009ء)

یہ صحیح ہے کہ ناول میں امراؤ جان ادا کا کردار مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔لیکن ناول کا بغور مطالعہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ لکھنوی تہذیب ناول میں ایک کردار کی حیثیت رکھتی ہے اور یہی تہذیب ہے جو وقت کے دھارے کے ساتھ مل کر ناول کو بہا لے جاتی ہے۔ابتدا سے درمیان، پھر عروج اور اختتام پر تہذیب کا ایک پیکر ہمارے سامنے آتا ہے۔یہ ایک ایسا پیکر ہے جو اپنے رنگ اور حلیے بدلتا رہتا ہے۔امراؤ جان ادا، خانم، رسوا، مرزا گوہر، نواب سلطان، راشد علی، فیض علی ڈاکو، اکبر علی، اسی پیکر کے مختلف رنگ اور ہیولے ہیں۔لکھنؤ جس میں ایک وقت میں تہذیب وتمدن کا حال یہ تھا کہ طوائف کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔اس کا کام جنسی تسکین کی فراہمی نہیں تھا بلکہ وہ ادب وتہذیب کی دلدادہ، فنون لطیفہ کی ماہر، سلیقہ وطریقہ کا نمونہ اور رکھ رکھاؤ کی مثال ہوا کرتی تھی۔سماج میں اس کی موجودگی باعث افتخار تھی۔ پروفیسر عظیم الشان صدیقی ناول کے اس پہلو پر اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں:

"طوائف جسے ایک زمانہ میں لکھنوی سماج میں
قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔اس سے
قریبی تعلق پیدا کرنا اس کے پاس جانا، اسے
اپنے یہاں بلانا امارت کی نشانی سمجھا جاتا
تھا۔اسے بزم کی زینت اور امراؤں کے در
باروں میں مصاحب کی حیثیت حاصل تھی اور وہ

Scanned with CamScanner

سفر و حضر میں مسرت و انبساط کا سامان بھی فراہم
کرتی تھی اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کے بالا
خانے تہذیب و ادب کا معیار سمجھے جاتے
تھے۔ امرا اور روسا اپنے بچوں کو تعلیم و تربیت کے
لیے وہاں بھیجتے تھے۔ یہ جنسی آسودگی کا بھی ایک
ذریعہ تھا۔ سماج کی ضرورت کے اعتبار سے اس
کے مختلف معیار و مدارج بھی مقرر تھے اور ان
معیار و مدارج کے مطابق ان سے ذہنی سطح
تہذیب و شائستگی، وابستگی و شیفتگی دل سوزی
وفاداری کا مطالبہ بھی کیا جاتا تھا اور یہ اس میزان
پر پورا اترتی تھیں۔''

(اردو ناول آغاز و ارتقا، عظیم الشان صدیقی، ص 417-4160، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2004ء)

پروفیسر عظیم الشان صدیقی کی بات دل کو لگتی ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب 'اردو ناول آغاز و ارتقا'' میں اس پر خاصی توجہ مبذول فرمائی ہے اور ناول کے اسباب و علل کا پتہ لگانے کی کوشش کی ہے۔ وہ آگے کہتے ہیں:

انیسویں صدی کے آخر میں طوائف کا وہ منصب
اور درجہ باقی نہیں رہتا، وہ تغیر زمانہ کے باعث
اپنے معیار سے گر جاتی ہے، لوگ اسے نا
پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھنے لگتے ہیں اور سماج
اسے قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتا''

Scanned with CamScanner

(اردو ناول آغاز وارتقا، عظیم الشان صدیقی، ص 417، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2004ء)

پروفیسر عظیم الشان صدیقی آخر کار اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ سماج میں آنے والے اس زوال اور شکست خوردہ تہذیبی عناصر ہی اس ناول کے وجود میں آنے کا سبب بنے ہیں۔ امراؤ جان ادا اپنے عہد میں وقوع پذیر انہیں واقعات و حادثات کا آنکھوں دیکھا حال ہے جن سے تہذیبی نشیب و فراز ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ مرزا نے اپنے قلم کے جادو سے لکھنؤ کی تہذیب کو نہ صرف ناول میں عمدگی سے پیش کیا ہے بلکہ ناول میں اس تہذیب کا تحفظ بھی کیا ہے۔ انہوں نے لکھنؤ کو طوائف کے دریچے سے دیکھنے اور بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔ سفید پوش، عزت داروں کے اندر کی سیاہ فطرت کو سامنے لانے کا کام کیا ہے۔ لکھنؤ کی تہذیب کیسی تھی اور کس طرح نو واردوں پر حملہ کرتی تھی، اس کی عکاسی مرزا نے ناول میں راشد علی کے کردار سے کی ہے۔ راشد علی کے ناول میں انٹری موثر ڈھنگ سے ہوتی ہے۔ راشد علی صدر الصدور کے صاحب زادے ہیں۔ دولت و حشمت کا کیا ٹھکانہ۔ مرحوم والد کی بے شمار دولت، نوکر چاکر، لکھنؤ آمد کے بعد، لکھنؤ کی ہوا کچھ یوں لگی۔ ملاحظہ کریں:

> ''وطن سے ملازم ہمراہ آئے تھے وہ سب رکھن میاں کہتے تھے۔ لکھنؤ والوں نے ان کو راجہ کا لقب دیا تھا مگر اس نام اور القاب میں کس قدر دیہاتیت تھی۔ لکھنؤ کی وضع قطع پر مرتے تھے۔ اس لیے تھوڑے ہی دنوں میں نواب صاحب بن گئے۔ جب گھر سے آئے تھے تو خاصی ڈاڑھی منہ پر تھی۔ لکھنؤ کی ہوا لگتے ہی

Scanned with CamScanner

کتر واں ہوئی پھر خشخاش اور تھوڑے دنوں بعد تو
بالکل صفایا ہو گیا''

(امراؤ جان ادا، ص 83)

ناول کے مکالموں سے بھی لکھنوی تہذیب و ثقافت کی بھر پور عکاسی ہوتی ہے۔ لکھنو کی گلیوں، محلوں میں بولی جانے والی زبان، محاورے، فقرے اور کہاوتیں، ایک الگ قسم کا مزہ دیتی ہیں۔ الغرض 'امراؤ جان ادا' اپنے پلاٹ، کردار، تہذیب، مکالمہ اور اپنے منفرد انداز بیان اور حقیقی پیشکش کے باعث انیسویں صدی کے اہم ترین ادبی سرمائے کی حیثیت رکھتی ہے۔ جو ادب کے ساتھ ساتھ اس وقت کے تہذیبی اور تاریخی مطالعہ کا ایک اہم ذریعہ بھی ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر اسلم جمشید پوری
صدر شعبۂ اردو
چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ

Scanned with CamScanner

ہندوستان صدیوں سے قوموں، تہذیبوں کا آماجگاہ رہا ہے۔ یہاں ہزاروں تہذیبیں، مذاہب اور زبانیں اپنے پورے جمال وکمال کے ساتھ موجود ہیں۔ اس ملک کا یہی وصف ہے جو اس کو ساری دنیا کے ممالک سے ممتاز کرتا ہے۔ ایسا ہزاروں رنگ کا گلدستہ پورے عالم میں کہیں موجود نہیں ہے، اس کا علم، تہذیب وثقافت رواداری آپسی میل جول دوسروں کو اپنانے کی صلاحیت اس کا طرۂ امتیاز ہے۔ بقول فراقؔ۔

سر زمین ہند پر اقوام عالم کے فراق
قافلے بستے گئے ہندوستان بنتا گیا

مسلمان ہندوستان میں تین زبانیں عربی، فارسی، ترکی کے ساتھ آئے تھے۔ فارسی زبان کو حکومت کے انصرام وانتظام کے لیے استعمال کیا، فارسی زبان کو ایک خوبصورت تہذیب و ثقافت بھی تھی اور اس پر اسلام کی ضیابار کرنوں نے چار چاند لگا دیے تھے۔ مسلمانوں کی آمد کے بعد تھوڑے دنوں میں فارسی زبان امتیازی شان کی علامت بن گئی جیسے انگریزی زبان آج ہے، دو قوموں وتہذیبوں کے خوبصورت ملن کے نتیجے میں ایک زبان معارض وجود میں آئی۔ جس کو آج ہم اردو زبان کہتے ہیں، اردو ایک زبان کے ساتھ ساتھ ایک تہذیب بھی ہے یہ زبان مسلمانوں کے دور عروج میں درباروں اور قلعہ معلیٰ میں جگہ نہ پا سکی۔ لیکن بازاروں، گلیوں، کوچوں میں عروج وارتقا کے منازل طے کرتی رہی۔ اس کے مختلف مراحل ومنازل ہیں۔ لیکن جب مسلمانوں کا عروج زوال کی راہ پر گامزن ہوا تو اردو قلعہ معلیٰ اور محلوں میں داخل ہوگئی اور مسجع، مرصع عبارت نے زبان کو مشکل بنا دیا اور زبان حقیقت سے دور ہوگئی۔ جس کو آسان عام فہم بنانے کے لئے باقاعدہ تحریک چلی، تب جا کر عام فہم زبان بنی اور جنگ آزادی میں اہم کردار ادا کیا، جب یوروپ میں صنعتی دور کا آغاز ہوا، دنیا نے نئی راہ اختیار کیا، علم وقلم یوروپ کے ہاتھ میں چلا گیا، مسلمان

Scanned with CamScanner

مایوسی کا شکار ہو گئے اور وہ اس بات کو سمجھنے سے قاصر رہے کہ یوروپ کے علم وقلم کا راز انھیں کے آباواجداد کی علمی وتحقیقی فتوحات کا مرہون منت ہے۔ اس شکست خوردہ قوم نے علمی، ادبی، تحقیقی میدان میں مقابلہ کرنے کے بجائے راہ فرار اختیار کیا اور اسی کو اپنا مقصد سمجھ لیا نتیجۃً وہ جس کے عروج وارتقا و بلندی کا یوروپ خوشہ چیں ہے، حاشیے پر چلی گئی، انگریزوں نے فارسی زبان کو حکومت کا انتظام وانصرام سے بے دخل کر کے اردو زبان بنادیا، شاید ان کے ذہن میں یہ بات تھی کہ فارسی زبان ہندوستان میں حکمرانی کرنے والے مسلمانوں کی شان وشوکت کی علامت بھی ہے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے بہت سی شاندار عمارتوں اور عبادت گاہوں کو بھی زمیں دوز کردیا تھا۔ یہیں سے اس زبان کا جس کو ہم اردو کہتے ہیں کا عروج شروع ہوتا ہے۔ اس کے کئی دبستان معارض وجود میں آگئے۔ اس کی غزلیہ شاعری کا آغاز ہوا، جس کی آج دنیا دیوانی ہے۔

تاریکیاں چمک گئیں آواز درد سے
میری غزل سے رات کی زلفیں سنور گئی

انھیں دبستانوں میں ایک دبستان لکھنؤ ہے۔ یہ دبستان اودھ کی سرزمین پر پروان چڑھا اودھ کہ معنی سرزمین امن وامان کے ہیں جہاں محبت کے پھول کھلتے ہیں۔ دیا، کرونا، ممتا کی کلیاں مسکراتی ہیں۔ دبستان لکھنؤ کی بنیاد اس وقت پڑی جب آصف الدولہ نے اودھ کی راجدھانی فیض آباد سے منتقل کر کے لکھنؤ بنادیا۔ آصف الدولہ نے لکھنؤ کو شہر نگاراں میں تبدیل کر دیا۔ اہل علم وادب چاروں طرف سے کشاں کشاں چلے آئے اور اردو ادب وشعر کا ایک شاندار دبستان آراستہ ہوگیا جس کی اپنی ایک شان ہے ایک آن ہے رثائی ادب اور مثنوی کے حوالے سے دبستان لکھنؤ کو جو شان وامتیاز حاصل ہے وہ دوسرے دبستانوں کو میسر نہیں ہے۔ ناسخ وآتش دو اسکول مساوی متوازی چلتے رہے۔ جس سے جہاں ایک طرف زبان سجی، سنوری، تو دوسری طرف خوبصورت شاعری معارض وجود میں آئی۔ آتش وناسخ کی خارجیت وداخلیت سے بحث مقصود نہیں ہے آتش کے مزاج اور انداز میں جو تضاد ملتا ہے وہ ان کی شاعری کی بھی اساس بن جاتا ہے

Scanned with CamScanner

وہ صوفی مشرب ہیں لیکن حسن پرست بھی ہیں۔ لکھنؤ کے انحطاط پذیر معاشرہ نے ان کے وقت تک گدلے پانی سی صورت اختیار کر لی تھی لیکن آتش اس میں کنول کی طرح عفت جذبات کی علامت بن جاتے ہیں۔

اپنے ہر شعر میں ہے معنی تہ دار آتش
وہ سمجھتے ہیں جو کچھ فہم وذکاء رکھتے ہیں

کھینچ دیتا ہے شبیہہ شعر کا خاکہ خیال
فکر رنگیں کام اس پر کرتی ہے پرواز کا

دبستان لکھنؤ میں ناسخ کی اہمیت زبان میں صفائی پیدا کرنے اور متروکات کے خلاف باقاعدہ مہم چلانے کی وجہ سے ہے انھوں نے زبان و بیان کے قوانین کی خود پیروی ہی نہ کی بلکہ اپنے شاگردوں سے بھی سختی سے ان کی پابندی کرائی زبان کی درستگی کے لیے انھوں نے فارمولا بنا دیا تھا (ا) بندش چست ہو (ب) حشو زواید پرہیز ہوا ور (ج) ذم اور ابتذال سے احتراز کرنا چاہیئے۔

ہوگئے دفن ہزاروں ہی گل اندام اس میں
اس لیے خاک سے ہوتے ہین گلستاں پیدا

دبستان لکھنؤ کے ادبی پس منظر میں میں جو صحافت معارض وجود میں آئی اس پر زبان و بیان کے نمایاں اثرات مرتب ہوئے۔ صحافت کے انداز بیان میں ادب نے اہم کردار ادا کیا اور صحافت کا ایک دل نواز روپ سامنے آیا۔

طلسم لکھنؤ۔ واجد علی شاہ کی معزولی اور اودھ کی سلطنت پر قبضے کے ساڑھے پانچ مہینے بعد منظر عام پر آیا اس کی زندگی صرف گیارہ مہینے رہی۔ اپنی بے باکی ہمت و جرأت اور انگریزی حکومت پر تنقید و احتساب کے نقطہ نظر سے اپنے عہد کے اخبارات میں اعلیٰ مقام رکھتا ہے۔

طلسم لکھنؤ کو مولانہ محمد یعقوب فرنگی نے ۲۵ر جولائی ۱۸۵۶ء کو عملی جامہ پہنایا تھا مولانہ

Scanned with CamScanner

خانوادے فرنگی محل کے چشم و چراغ تھے اور مشہور زمانہ فسانہ عجائب کے مصنف رجب علی بیگ سرور کے جگری دوست تھے۔ اس سلسلے میں سرور رقم طراز ہیں۔

"مطبع اس شہر میں اکثر سنگ کے نمونے نیرنگ کے ہیں مگر ہمارے شفیق و مہربان یک رنگ حاضر و غائب یکساں، جناب مولوی محمد یعقوب صاحب مدظلہ عزیز دل ہا، بہمہ صفت موصوف ہیں، دور دور مشہور ہیں، سابق ازیں فرنگی محل میں چھاپا خانہ تھا، رشک ابنائے زمانہ تھا، اخبار کا پرچہ چھپتا تھا ان کا پتانہ چھپتا تھا شہروں میں اس چھاپے خانے کی دھوم تھی، گردش تقدیر کے معلوم تھی۔ دفعتاً فلک نے یہ چکر لگایا، حرف غلط کی طرح رگڑ کے شہر کو مٹایا (بحوالہ اردو صحافت انیسویں صدی میں ص۔۳۰۴) ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں چھاپا خانہ اور اخبار دونوں کو انگریز حکومت نے ختم کر دیا۔

جب حالات معمول پر آئے تو مولانا محمد یعقوب فرنگی محلی نے ۱۸۶۵ء میں "کارنامہ" نام سے ایک اخبار جاری کیا جو ۱۹۰۵ء تک جاری رہا۔ طلسم لکھنؤ موجودہ دور کے ہفتہ روزہ اخباروں کے سائز میں ۸ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ تین صفحات لکھنؤ کی خبروں کے لئے ہوتے تھے۔ اس کے بعد ملکی غیر ملکی خبریں چھپتی تھیں انگریزی حکومت کے ظلم و استبداد کا ذکر ہوتا تھا۔ "طلسم لکھنؤ" اپنی ظاہری اور معنوی خوبیوں کے اعتبار سے لکھنو طرز فکر، تہذیب اور پر تکلف اسلوب نگارش کا مرقع تھا۔ اس کے صفحات پر اودھ کے باشندوں کے ان شدید احساسات و جذبات کی بھرپور ترجمانی ملتی ہے جو انگریزوں کی غاصبانہ کارروائی کے رد عمل میں پیدا ہوئے تھے"

(صفحہ ۳۰۶)

Scanned with CamScanner

اخبار رقمطراز ہے

طلسم لکھنؤ، ۲۱ر اکتوبر ۱۸۵۶ء

''جدھر دیکھیے نیا فتنہ اُٹھا ہے، خدا آبرو رکھے اندھیرا مچا ہے زمانہ شور ہے، اوباشوں کا زور ہے، عز تا تارنے کی فکر دن رات ہے۔ جھوٹی تہمت لگا دینی ایک بات ہے بھلے آدمیوں کی خوف ورجا میں بسر ہوتی ہے۔ سکھوں کی شام اس اندیشے میں بسر ہوتی ہے۔ خدا آبرو بچائے۔ شرفا پر آنچ نہ آئے۔ شہر میں سڑکوں کی تیاری ہے، بالفعل ہر طرف مرمت جاری ہے جھنڈیاں گاڑی جاتی ہے، ڈوریاں بندھتی آتی ہیں، راہوں کے نشیب وفراز ہموار ہوتی ہیں کشادہ گلی کوچے بازار ہوتے ہیں''

سحر سامری لکھنؤ طلسم لکھنؤ کے منظر عام پر آنے کے پانچ ماہ بعد ۷ر نومبر ۱۸۵۶ء کو سحر سامری نام کے ہفتہ روزہ اخبارات آسمان صحافت پر نمودار ہوا اور خوب تھا سحر سامری تھا۔ اس کے پہلے ایڈیٹر معروف شاعر امیر مینائی تھے اور مالک وانتظام کار پنڈت بیچ ناتھ اخبار کے چار شماروں کے منظر عام پر آنے کے بعد امیر مینائی الگ ہو گئے تھے ان کے بعد رگھوبیر نارائن عیاش مدیر بنے کچھ وقت کے بعد عیاش بھی سبکدوش ہو گئے ان کے بعد خود پنڈت بیچ ناتھ مدیر ہوئے لیکن ادارت کی ذمہ داری ان کے بس کی بات نہیں تھی اور انھوں نے منشی شنکر دیا فرحت کو سحر سامری کا مدیر مقرر کر دیا۔ فرحت صاحب نے اپنے حسن ادارت سے اخبار کی کامیابی میں چار چاند لگا دیے۔

''سحر سامری'' ظاہری وضع وقطع میں ''طلسم لکھنؤ'' سے بڑا مشابہ اخبار تھا۔ سرورق کے بالائی حصے کو اسی طرح بیل بوٹوں سے مزین کیا جاتا تھا اور لوح کے چاروں طرف اشعار بھی اسی طرح درج کیے جاتے تھے جیسے طلسم لکھنؤ کو

Scanned with CamScanner

سامنے رکھ کر ''سحر سامری'' کی ترئین کی گئی ہو۔ آٹھ صفحات کے اخبار میں پہلا صفحہ اخبار کے منظوم اشتہار سے پر ہوتا تھا یہ اشتہار کیا تھا اخبار کا مکمل تعارف نامہ تھا چونکہ یہ اشتہار اردو صفحات کے ابتدائی دور کی بے حد دل چسپ تصویر پیش کرتا ہے۔''

اے خامہ لکھ اشتہار اخبار　　عالم کو ہے انتظار اخبار

اشاعت کا دن:

لکھ دے چھپے گا پیر کے روز　　منگل کو یہ ہوگا جلوہ افروز

اخبار کی پالیسی یہ تھی عوام کو بیدار کیا جائے، فرنگی ریشہ دوانیوں سے آگاہ کیا جائے اخبار میں لکھنؤ کی سماجی، تہذیبی و ثقافتی اور سیاسی و اقتصادی جھلکیاں بھی شائع ہوتی تھیں اس طرح سحر سامری اپنے ارادے اور مشن میں کامیاب اخبار ثابت ہوا اور بھارت کی جنگ آزادی میں اہم کردار ادا کیا۔

اودھ پنچ کا پہلا شمارا سالار جنگ لائبریری اور کتب خانہ دار العلوم دیوبندی میں موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اخبار ۱۶ر جنوری ۱۸۷۷ء کو منظر عام پر آیا تھا اس اخبار کے آسمان صحافت پر چمکنے سے قبل اردو صحافت کا سفر تو تقریباً نصف صدی طے کر چکی تھی۔ اس کے باوجود اودھ پنچ کا اجراء تاریخ کے صحافت کا اہم واقعہ ہے۔ اردو زبان میں طنز و مزاح صحافت کا ایک پورا دور وابستہ ہے اس نے نہ صرف ایک نئی قسم کی صحافت کی بنیاد رکھی بلکہ نیا انداز، نیا اسلوب اور نیا لب و لہجہ عطا کیا، اس کے بعد ہندوستان کے طول و عرض اس جیسے اخبار بڑی تعداد میں نکلے اور بعض اخبار تو اپنے نام کے ساتھ پنچ لاحقہ لگا لیا۔

Scanned with CamScanner

اودھ اخبار سرزمین لکھنؤ کا پہلا روزنامہ اخبار تھا ہفت روزہ اخبار کی اشاعت کے اٹھارہ سال بعد منشی نول کشور نے اودھ اخبار کو روزنامہ بنانے کا فیصلہ کیا، روز شائع ہونے لگا روزنامہ کے ساتھ ہفتہ وار ایک ایڈیشن بھی شائع ہوتا تھا یہ اخبار انگریز حکمرانوں سے ہمدردی رکھتا، یہ ہمدردی مصلحتاً تھی یا حقیقت میں ہمدردی تھی اخبار کا سب سے مقبول سلسلہ فسانہ آزاد کی قسط وار اشاعت تھی رتن ناتھ سرشار جس سال اخبار سے وابستہ ہوئے اسی سال اپنا ناول فسانہ آزاد قسط وار شائع کرنا شروع کر دیا مذکورہ بالا سبھی اخبارات میں صحافت کا فن جدید اخبار نگاری کے تناظر میں بالکل نامکمل ہے جدید اخبار نویسی یوروپ کے مرہون منت ہے۔ آج بھی ہندی، اردو اخبارات جدید صحافتی معیار سے بہت پسماندہ ہیں ہاں انگریزی صحافت کا ہندوستان میں جو تناظر ہے وہ کسی حد تک یوروپ کے صحافتی معیار کا چربہ اتارنے میں کامیاب نظر آتا ہے۔

لکھنؤ کی سرزمین جہاں مختلف صحافتی انداز بعد کا جنم ہوا ایک صحافتی انداز نظمیہ صحافت کا ہے جس کے بانی مبانی ملک الشہر اء دوار کا پرشاد افق لکھنوی تھے حالانکہ یہ انداز بعض کے ادوار میں کہیں نظر نہیں آتا ہے، افق لکھنوی کئی اخباروں سے وابستہ رہے اور اپنے فن کا جوہر دکھایا ہے لیکن ان کی صحافت ایک نیا انداز جس کو اردو صحافت کی تاریخ میں نظم اخبار کے نام سے جانا جاتا ہے یہ اخبار ۵/اگست ۱۸۸۸ء کو منظر عام پر آیا ۱۲ صفحات پر مشتمل اخبار جس کے ۴ صفحات نثر کے ہوتے تھے اور آٹھ صفحات میں ساری خبریں نظم میں ہوا کرتی تھیں، نظم اخبار کے صفحہ اول پر جو مثنوی شائع ہوتی تھی اس سے اخبار کی غرض وغایت کی وضاحت ہو جاتی۔

ہے شکر اس خالق عالی صفت کا
مصنف ہے جو بندش جہت کا
اشاعت نظم کی فرمائی جس نے
ردیف مہر و ماہ چمکائی جس نے

دوار کا پرشاد افق لکھنوی نے لکھنؤ کے شعری ذوق کی تسکین کے لیے نظم میں اخبار نکالا

Scanned with CamScanner

تھا جس کی خوب پذیرائی ہوئی مزید تفصیلات ڈاکٹر کومل بھٹناگر کی کتاب ''دبستان لکھنؤ'' کے عظیم ادیب ملک الشعراء دوارکا پرشاد افق لکھنوی'' ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ چونکہ اخبار کی فائلیں دستیاب نہیں تھی اس لئے مزید خامہ فرسائی ممکن نہیں ہے۔ اگر قومی کونسل برائے فروغ اردو حکومت ہند تحقیق اس کی فائلیں مرتب کروادیں تو بڑا کارنامہ ہوگا ساتھ ہی ملک الشعراء دوارکا پرشاد افق لکھنوی کے پورے ادبی سرمایہ کا کلیات شائع کردیں تو دبستان لکھنؤ کے حوالے سے بڑا کام ہوگا۔

سرزمین علم وادب پر جدید اردو صحافت کا آغاز روزنامہ قومی آواز سے ہوتا ہے جو ۱۹۴۴ میں ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو نے قومی آواز کو جاری کیا اس کے بانی ایڈیٹر تھے حیات اللہ انصاری، انھوں نے اپنی کاوش سے معیاری اخبار بنا دیا۔ سوئے نصیب آزادی کے بعد یہ آزادی مجاہد اخبار بند ہوگیا اخبار نے لکھنوی ادب وتہذیب کی ترجمانی کرتا رہا کسی حد تک جدید صحافتی معیار کو اپنانے کی کوشش بھی کرتا رہا۔ قومی آواز کے بعد کئی اخبار منظر عام پر آئے جو آج بھی جاری وساری ہیں لیکن دبستان لکھنؤ کے ادبی وتہذیبی تقاضوں کو پورا کرنے میں بری طرح ناکام ہیں جدید اخبار نگاری کے معیار پر کہیں دور دور تک نظر نہیں آتیں ہیں، زبان و بیان کی غلطیوں کا انبار ہوتا ہے بعض اخبارات کے اداریہ تک میں زبان و بیان کی فاش غلطیاں ہوتی ہیں، بڑے افسوس کی بات ہے جب اردو صحافت کا دوسو سالہ جشن منایا جارہا ہے تو اردو صحافت جدید اخبار نگاری کے معیار پر کہیں بھی ٹھہر نہیں رہی ہے۔ اردو اخبار نویس اپنا محاسبہ کریں کہ وہ کہاں کھڑے ہیں انھیں بہت منازل طے کرنے کے بعد اردو صحافت کا کوہ قاف ملے گا۔ یوروپ کے جدید صحافتی معیار کا مطالعہ کیا جائے اور اردو صحافت میں برتنے کی کوشش کی جائے، منزلیں مل سکتی ہیں کامیابیاں قدم چوم سکتی ہیں۔ سفر شرط ہے۔

☆☆☆

نسیم الدین ندوی

Scanned with CamScanner

انیسویں صدی کے لکھنؤ کا تاریخی پس منظر اور ادب و صحافت پر اس کے اثرات

تمہید:

انسان، ذاتی لاشعور سے کہیں زیادہ اجتماعی لاشعور سے مربوط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا ہر معاملہ معاشرہ سے متعلق ہوتا ہے۔ معاشرتی نقطہ نظر اور سماجی پس منظر کا انسان کے تمام افعال و کردار میں خاصا عمل دخل ہے۔ اس لیے اجتماعی لاشعور کا اہم مسئلہ حالات کے نشیب و فراز سے ہی جڑا نظر آتا ہے۔ کیوں کہ زمانے کے بدلتے تیور اور گردش ایام سے انسانی زندگی کا ہر شعبہ متاثر ہوتا ہے۔ صحافت ہو کہ ادب، اپنے معاشرہ کا عکاس ہے اور عصری تقاضوں کا آئینہ دار بھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے اس عہد کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے، جس میں وہ ادب تخلیقی مراحل سے گزرتا ہے۔ عہد ماضی کے حالات و کردار، رسم و رواج، سیاسی نشیب و فراز، ارباب سیاست کے عادات و اطوار، مذہبی لیڈران کی ذہنیت، عمومی نشست و برخاست، غرض کہ تمام تر عوامی مذاق سے بخوبی واقفیت ہو جاتی ہے۔ ادب کا مطالعہ یہ بھی آگاہ کر دیتا ہے کہ ادب کی سرپرستی کیسے ہاتھوں میں ہوئی، کن افکار و خیالات اور تحریکات کے زیر اثر ادبا سماجی مسائل کو فن کا جامہ پہناتے رہے ہیں۔ اگر ہندوستانی تناظر میں دیکھیں تو انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول کے ادب میں جدوجہد آزادی کا رنگ گہرا نظر آئے گا۔ وجہ یہی ہے کہ اس زمانہ میں ہندوستانیوں کے پیش نظر ملک کی آزادی ہی سب سے اہم مسئلہ تھا۔ رہی بات اس مقالہ کی کہ انیسویں صدی کی لکھنوی فضا، ادب اور صحافت پر کس قدر اثر انداز ہوئی، اس کے لیے ضروری ہے عموماً ہندوستان کا تاریخی پس منظر اور خصوصاً لکھنوی تاریخ و تہذیب کی جھلک دکھادی جائے۔

ہندوستانی تاریخ میں انیسویں صدی کا عرصہ کئی لحاظ سے قابل التفات ہے۔ کیوں کہ اس عہد میں جہاں انگریز ہندوستان کے سیاہ سفید کے مالک بنے بیٹھے تھے، وہیں نئے تصورات اور کھلتے ہوئے ترقیات کے نئے نئے دروازوں کی وجہ سے ہندوستانی ذہن بدلنے لگا تھا۔ بالخصوص

Scanned with CamScanner

1857 کے بعد تو باشعور ہندوستانیوں کے اندر بے چینی کی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ جمیل جالبی لکھتے ہیں:

''انیسویں صدی انگریزی سلطنت کی توسیع واستحکام کی صدی ہے۔ اس میں ہمیں چاروں طرف تبدیلی کا احساس ہوتا ہے۔ پرانے ادارے بیٹھ رہے تھے اور نئے ادارے ان کی جگہ لے رہے ہیں۔..... چاروں طرف حرکت اور تبدیلی کا احساس ہوتا ہے۔ ہر طرف نئے خیالات سر اٹھا رہے ہیں اور ہمارا روایتی معاشرہ ٹوٹ کر نئی صورتوں کا خوگر ہو رہا ہے۔ ایک طرف مذہبی تحریکیں سر اٹھا رہی ہیں اور اسی کے ساتھ اصلاح احوال اور اصلاح رسوم کی تحریکیں بھی تیزی سے مقبول ہو رہی ہیں۔''(1)

انیسویں صدی میں نوابین اودھ اور ادب:

انیسویں صدی کی لکھنوی (اودھ) سیاست کی بات کی جائے تو اس وقت بحیثیت چھٹے نواب، سعادت خان (1797-1814) کی حکمرانی شروع ہو چکی تھی۔ ان کے بعد علی الترتیب غازی الدین حیدر (1814-1827)، نصیر الدین حیدر (1827-1837)، محمد علی شاہ (1837-1842)، امجد علی شاہ (1842-1847)، واجد علی شاہ (1847-1856) کا زمانہ اقتدار رہا تھا۔(2) یہاں تک کہ انگریزوں نے واجد علی شاہ کو معزول کر کے انھیں مٹیا برج (کلکتہ) بھیج دیا۔(3)

یہاں لکھنوی تاریخ لکھنا مقصود نہیں ہے۔ اس لیے اس تاریخی جھلک کے بعد ادب وصحافت کے مطالعہ میں جو باتیں اہم ہو سکتی ہیں۔ وہ یہ ہیں کہ نوابین اودھ ادب سے کتنے قریب تھے اور کتنے، ادب سے براہ راست تعلق رکھتے تھے اور کتنے دیگر انتظامی امور کے ساتھ شعرا وادبا کی قدردانی بھی لازمی تصور کرتے تھے۔

بانی سلطنت اودھ برہان الملک سعادت خان سے شجاع الدولہ تک اس خاندان میں شاعری کا کچھ پتا نہیں چلتا ہے۔ البتہ شجاع الدولہ کے زمانے میں اردو شعرا کی سرپرستی کی روایت

Scanned with CamScanner

جڑی ہوئی ہے۔ اسی زمانہ سے لکھنو میں دہلوی شعرا کی آمد کا پتا چلتا ہے۔ آصف الدولہ کے عہد میں سودا، میر، سوز، انشاء، جرأت، مصحفی وغیرہ سب موجود تھے۔ آصف الدولہ نے خود شاعری کی۔ ان کے جانشیں نواب سعادت علی خان ہوئے۔ ان کے دربار سے شعرا کے معرکے کی تاریخ وابستہ ہے۔ غازی الدین حیدر مرثیہ اور منقبت پر طبع آزمائی کرتے تھے۔ نصیر الدین حیدر کی غزلیں مشہور ہیں۔ رہی بات واجد علی شاہ کی تو انھوں نے ادبی میدان میں زبردست طبع آزمائی کی۔ مستزاد یہ کہ ان کا دربار بقول عبدالحلیم شرر 'مشرقی تمدن کا آخری نمونہ تھا'۔ نوابین اودھ کی تاریخ سے متعلق بہت سی کتابیں موجود ہیں، وہاں سے پورے حکومتی منظرنامے کے تئیں استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

حالات کے اثرات:

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے لکھنوی ادب کے تجزیہ کے بعد جو باتیں لکھیں، ان سے دبستان لکھنؤ کی انفرادی خصوصیتیں کھل کر سامنے آجاتی ہیں۔ لکھنؤ کی ابتدائی معاشرت کا تعلق مذہب اثنا عشری سے تھا (برہان الملک کے خاندانی حالت کی بنیاد پر وہاں کی معاشرت پر ایسی فضا کا طاری ہونا لازمی ہی تھا) انھوں نے لکھا کہ مذہب اثنا عشری کی زور کی وجہ سے شاعری سے عارفانہ مضمون کا خاتمہ ہوا۔ جس کا لازمی نتیجہ کچھ یوں سامنے آیا کہ عشق، ہوس ناکی کی سرحدوں سے جا ملا۔ فارغ البالی اور خوشگوار ماحول میں عشقیہ مضامین کو پر لگ گئے۔ عارفانہ مضمون میں عشق حقیقی کا عنصر غالب ہوتا ہے، لیکن یہاں تو عشق حقیقی کا معاملہ سرد تھا تو عشق مجازی کی فضا چھا گئی اور آہستہ آہستہ کثرت عشقیہ مضامین کی بنیاد پر سوقیانہ پن، تصنع اور بے جا لفاظی کی روایت مضبوط ہوتی چلی گئی۔

'مذہب کے علاوہ شاعری پر معاشرت کی دوسری چیزوں کا بھی اثر پڑتا ہے چنانچہ لکھنؤ میں مذہب کے بعد سب سے اہم عنصر معاشی فارغ البالی تھا جس نے تعیش کا رنگ اختیار کر لیا تھا.... تکلف اور تصنع کو لکھنوی تہذیب کا مترادف سمجھا جاتا ہے۔ لکھنو کے شعر و ادب سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ شعرائے لکھنو نے اپنی تمام تر توجہ شعر کی ظاہری صورت یعنی بیان کی اصلاح میں صرف کی ہے۔ (4)'

Scanned with CamScanner

انیسویں اور اٹھارہویں صدی کا جائزہ لیں تو لکھنو کا دبستان کم وبیش یکساں طور پر ہمارے سامنے آتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ انیسویں صدی میں جدوجہد آزادی کا رنگ ملک کے ہر شعبے پر چڑھنے لگا تھا۔ ادب وصحافت متاثر ہو رہی تھی۔ موضوعات بدل رہے تھے، لیکن لکھنوی ادب ان اثرات کے باوجود اپنا انفرادی رنگ رکھتا تھا۔ گرچہ مقفیٰ مسجع عبارتیں گم ہو رہی تھیں، تاہم زبان کی رنگینی ابھی بھی باقی تھی۔ اس زمانہ کے مشہور شاعروں میں انشاء، سعادت یار خان، مصحفی، جرأت، آتش، نواب سید محمد خان، پنڈت دیا شنکر نسیم، میر انیس، میر خلیق، مونس، انس، رشید اور عارف وغیرہ کے کلام سے اس زمانہ کی معاشرت کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ ابواللیث صدیقی نے عارفانہ کلام سے نظریں چرانے اور عشق وہوس ناکی کا جو نظریہ پیش کیا ہے، اس سے بھی وہاں کی صورتحال کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے۔ اگر افسانوی نثر کی بات کی جائے تو انیسویں صدی کے مشہور نثر نگاروں میں پنڈت رتن ناتھ سرشار اور مولانا عبدالحلیم شرر کا نام نمایاں ہے۔ سرشار نے فسانہ آزاد جیسی معرکۃ الاراء کتاب لکھی۔ جس میں لکھنوی تہذیب کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ جام سرشار، سیر کوہسار، کامنی، بچھڑی دلہن، پی کہاں جیسے ناولوں سے اردو کی افسانوی روایت کو مضبوطی بخشی۔ شرر نے فردوس بریں، ایام عرب، حسن کا ڈاکو، منصور موہنا اور زوال بغداد جیسے ناول دئے۔ اسی طرح اودھ پنچ کے مدیر سجاد حسین اور مرزا ہادی رسوا نے اپنے اپنے ناقابل فراموش کارناموں سے لکھنوی تہذیب اور اردو ادب کو مضبوط کیا۔ (5)

لکھنؤ کی صحافت:

مقالہ کا دوسرا گوشہ صحافت کی سمت ورفتار سے متعلق ہے۔ بیسویں صدی سے قبل اگر اردو صحافت وادب کا معاملہ جب کہیں بھی ایک ساتھ آتا تو دو طرح سے ان کا مطالعہ کیا جانا ممکن ہے۔ اولاً، ادبی صحافت۔ دوم، ادب اور صحافت۔ حقیقت یہ ہے کہ ادب اور صحافت کے انفرادی مطالعہ کے لیے ایک موضوع میں گنجائش نہیں نکلتی اور نہ ہی ایک موضوع کے تحت دونوں موضوعات (ادب اور صحافت) کے ساتھ مکمل طور پر انصاف کیا جا سکتا ہے۔ پھر اردو ادب کا ایک بڑا سرمایہ

Scanned with CamScanner

افسانوی ادب ہے جو کہ بیسویں صدی میں ابھر کر سامنے آیا ہے۔ اگر انیسویں صدی میں ادبی یا اخباری صحافت کی بات کی جائے تو دونوں کی سمت ورفتار میں بنیادی فرق سامنے آتا۔ کیوں کہ انیسویں صدی میں باضابطہ طور پر دونوں قسم کی صحافت میں تمیز نہیں کی جاتی تھی۔

بہر کیف! لکھنو میں 1847 تک کسی اخبار کا وجود نہیں ملتا ہے۔

''لکھنو کا پہلا اخبار جس کے وجود کا ہم کو لکھا پڑھا اور باضابطہ ثبوت ملتا ہے وہ 'لکھنو اخبار' ہے جس کے اجرا کی صحیح تاریخ معلوم کرنے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے لیکن یہ یقین ہے کہ 1847 کے اوائل میں ایک بزرگ جن کا نام لال جی تھا 'لکھنو اخبار' شائع کرتے تھے''۔(6)

لکھنو میں واجد شاہ کی برطرفی کے بعد ہی اردو اخبار کا اصل دور شروع ہوتا ہے۔ یعنی انیسویں صدی کے نصف اول میں لکھنو سے معتد بہ تعداد میں اخبارات جاری نہیں ہوئے۔ 25 جولائی 1856 کو 'طلسم لکھنؤ' جاری کیا گیا جو غالباً لکھنو کا دوسرا اخبار ہے۔ اس کے مالک و مہتمم رجب علی بیگ سرور کے گہرے دوست مولوی محمد یعقوب انصاری تھے۔ ڈاکٹر عفت زریں نے اس اخبار کی سن اشاعت 1877 لکھی، جو کہ غلط ہے۔ اس سن اشاعت کی وجہ سے صحیح تاریخ کے درمیان بیس برس کا فاصلہ لازمی ہے۔ یہ اخبار اپنی ظاہری اور باطنی خوبیوں کے اعتبار سے لکھنوی طرز فکر، تہذیب وتمدن اور پر تکلف اسلوب نگارش کا لاجواب مرقع ہے۔

اس کے بعد 17 نومبر 1865 میں 'سحر سامری' کا اجرا ہوا۔ احسن مارہروی نے اس کے ایڈیٹر کا نام گھیر نرائن عیاش لکھا ہے۔ 'اس کی زبان و بیان پر قدامت کا گہرا اثر ہے جب کہ طلسم لکھنو میں شہری زبان اور اس کے لب ولہجہ کی پرچھائیاں تو ملتی ہیں لیکن رجب علی بیگ سرور یا اس زمانے کے پر تکلف نثری اسلوب کی چھاپ اس کی تحریروں پر نہیں ہے۔'(7)

اخبار 'سحر سامری' کے اشتہارات کے حوالے سے نادر علی خان کی کتاب 'اردو صحافت کی تاریخ' میں 'اخبار اعجاز' کا پتا چلتا ہے جو 1856 کے اواخر میں شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ اس کے ایڈیٹر کا نام بنی پرشاد تھا۔ اسی زمانہ میں 'مخزن الاخبار' اور 'اشرف الاخبار' مارچ 1857 میں جاری ہوا۔

Scanned with CamScanner

'معدن الاخبار' 16 مارچ 1857 کو شائع ہوا، جس کے ایڈیٹر کے متعلق معلومات حاصل نہیں ہوتی۔ مورخین نے 'سحر سامری' میں شائع اشتہار کی بنیاد پر اس اخبار کا پتا لگایا ہے۔ جب کہ 'عیار الاخبار' 25 مارچ 1857 میں منظر عام پر آیا ہے۔ جس کے مالک و مہتمم سید آفتاب علی کے کوئی بزرگ تھے۔

'انتزاع سلطنت اودھ کے بعد کم از کم 7 اخبارات لکھنو میں 1857 کی شورش سے قبل جاری ہو چکے تھے جو کثرت اور مقبولیت کے پیش نظر اس حقیقت کے مظہر ہیں کہ لکھنؤ میں غالباً اس سے قبل اردو اخبارات کا وجود نہ تھا اور انتزاع سلطنت کے بعد جب آزادی رائے کا موقع ملا تو یہ شوق اظہار کو وہ آتش فشاں کی طرف پھوٹ پڑا اور یکے بعد دیگرے کئی اخبارات نکلنا شروع ہو گئے (8)۔'

اس کے بعد مولانا ہادی کی ادارت میں 'اودھ اخبار' 1859 میں منصۂ شہود پر آیا۔ یہ منشی نول کشور کا اخبار تھا۔ (9) اردو کے نامور ادیب اس میں ادب، تاریخ، جغرافیہ، سائنس وغیرہ پر مسلسل مضامین کثرت سے لکھتے تھے۔ اس طرح اس میں نہ صرف سیاسی، سماجی اور تاریخی حالات ملتے ہیں، بلکہ ادبی تاریخ کے متعلق بھی بعض اہم اطلاعات اور خبریں اس سے ملی ہیں۔ بحیثیت مجموعی اس سے لکھنوی نثر کے ارتقا کی کہانی اس اخبار سے جڑی ہے۔

پھر 'اودھ پنچ' (1877) کا زمانہ آتا ہے، جسے اردو صحافت کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ جس کے مدیر سجاد حسین متعدد فنون میں مہارت رکھتے تھے۔ اس اخبار کا انداز ظریفانہ تھا تاہم کبھی ذاتیات کے مسائل سے بوجھل ہو کر پھکڑ پن سے قریب ہو جاتا تھا۔ اس کے موضوعات متنوع تھے۔ اس میں لکھنوی معاشرت یعنی محرم، چہلم، عید بقرعید، دیوالی، بسنت، مرغ بازی، لکھنو کے میلے ٹھیلے پر بھی کثرت سے مضامین شائع ہوتے تھے۔

1888 میں مولانا عبدالحلیم شرر کا اخبار 'دلگداز' منظر عام پر آیا۔ ان کے متعدد ناول اسی اخبار میں شائع ہوئے۔ یہ اخبار پہلے لکھنو، پھر حیدر آباد، اس کے بعد مولانا جب حیدر آباد سے واپس لکھنو آئے تو یہاں سے نکالنا شروع کیا۔

Scanned with CamScanner

ان اخباروں کے بعد لکھنوی گلدستوں کا تذکرہ بھی انتہائی اہم ہے۔ کیوں کہ انیسویں صدی کی لکھنوی صحافت کا یہ ایک اہم حصہ رہا ہے۔ 'گلدستہ شعر 1875 لکھنؤ'، 'گلدستہ 1875' (؟)، بہار لکھنو 1887، پیام عشاق لکھنو 1883۔ قابل ذکر گلدستے ہیں۔ اسی ضمن میں اودھ انجمن ہند' (1882) اور انجمن تہذیب لکھنو 1873 میں منظر عام پر آیا۔

انیسویں صدی کا صحافتی سفر کچھ اس طرح منزل مقصود تک پہنچتا ہے۔ اگر لکھنوی تہذیب اور اس کے اثرات کے پس منظر میں ان اخبارات ورسائل کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ جس طرح وہاں کی شاعری پر یہاں کی رنگین زبان حاوی تھی، بالکل اسی طرح یہاں کی صحافت بھی لسانی اعتبار سے رنگین ہی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ ان اخباروں سے شمالی ہند میں نثری ارتقاء کی داستان بھی متعلق ہے۔ لکھنوی معاشرت اور تہذیب وتمدن کے اثرات کے تناظر میں 'طلسم لکھنو'، 'اودھ اخبار'، 'اودھ پنچ'، 'اودھ اخبار' کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ وہاں کی تہذیب اور لسانی روایت، ان اخبارات ورسائل پر بکھری ہوئی نظر آتی ہے۔ ان کے موضوعات مکمل طور پر نہ سیاسی تھے اور نہ سراسر ادبی، بلکہ نیم سیاسی مسائل ادبی رنگ میں منظر عام پر آتے تھے، یہ وقت کا تقاضا بھی تھا۔ انیسویں صدی میں ہندوستانیوں کے سامنے جدوجہد آزادی اصل مسئلہ تھا۔ ملک کے مختلف گوشوں سے شائع ہونے والے اخبارات ورسائل پر اس کے گہرے اثرات نظر آتے ہیں۔ ایسے میں ممکن نہیں تھا کہ لکھنو یا اودھ سے نکلنے والے اخبارات ورسائل عمومی فضا سے مستثنیٰ رہ جائیں۔ لہذا وہاں کے اخبارات پر بھی یہ سب رنگ بکھرے نظر آتے ہیں۔

حواشی:

(1) جمیل جالبی، تاریخ اردو ادب (جلد سوم)، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی 2014 (طبع ثانی)، ص 25۔

(2) ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی، لکھنو کا دبستان شاعری، اردو پبلشرز 8 تلگ مارگ لکھنؤ 1973، ص 20۔

Scanned with CamScanner

(3) سید احتشام حسین، اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی 2014 (طبع نہم)، ص84۔

(4) لکھنو کا دبستان شاعری، ص35-33۔

(5) اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، ص210۔

(6) نادر علی خان، اردو صحافت کی تاریخ، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ 1987، ص349۔

(7) ڈاکٹر عفت زریں، لکھنو کا دبستان نثر، 543 گلی حکیم جی والی چوڑی والان دہلی 2000 ص494۔

(8) اردو صحافت کی تاریخ، ص414۔

(9) نیا دور، اردو صحافت نمبر، جون۔جولائی 2011۔ص150۔

ڈاکٹر ندیم اشرف

پروفیسر، شعبہ دینیات (سنی)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (یوپی)

Scanned with CamScanner

از افق تا افق ہے نام افق　　کیا بتاؤں تمہیں مقام افق
وقت کی قید سے بلند بہت　　ہے دوام افق دوام افق

منشی دوارکا پرساد افق اپنے عہد کے اُن معززین میں نمایاں مقام رکھتے ہیں جن کی معاشرتی ولسانی تہذیب اردو تھی۔ اردو سے ان کی والہانہ محبت اور فروغ اردو کے لئے بے لوث خدمات رہتی دنیا تک فراموش نہیں کی جاسکتی۔ انھوں نے اردو کی مختلف اصناف ڈراما، ناول، شاعری وغیرہ میں اپنی تخلیقی صلاحیت کا مظاہرہ تو کیا ہی ساتھ ہی ایک فاضل ادیب اور صحافی کی حیثیت سے بھی اعلیٰ درجہ پر نظر آتے ہیں۔ شعر گوئی کے ساتھ نثر نگاری میں بھی انھیں زبردست ملکہ حاصل رہا۔ مسجع مقفیٰ نثر سے لے کر آسان عام فہم زبان میں بہترین نثر نگاری کی۔ ان کا کمال یہ تھا کہ موقع ومحل کے لحاظ سے زبان بھی تبدیل کردیتے۔ بحیثیت مدیر وہ الگ طرح کی نثر لکھتے اور ناول، ڈرامے وغیرہ میں وہ مختلف زبان میں نظر آتے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں ہر میدان میں انفرادی مقام حاصل ہوا۔ شاعری میں ملک الشعراء کا لقب ملا اور صحافت کے میدان میں قدم رکھا تو وہاں بھی اپنی جدّتِ طبع کی بدولت منفرد حیثیت کے حامل قرار پائے۔

افق کا ''نظم'' اخبار جس میں تمام خبریں نظم میں شائع ہوتی تھیں اپنے انداز میں نرالا اخبار تھا جسے انھوں نے ۵/اگست ۱۸۸۸ء میں شروع کیا جس میں انھوں نے اس وقت کے حالات، روداد زمانہ، انگریزوں کی سازشیں، ناانصافیاں، مجاہدینِ آزادی کی انقلاب آمیز قربانیاں، ان کے عزم وحوصلوں سے عوام کو شعری انداز میں متعارف کرایا اور شاعری چونکہ اپنے آپ میں ایک کشش رکھتی ہے اور عوام کے دلوں میں جلد اتر جاتی ہے۔ اس اخبار کے ذریعہ قارئین کو خبریں بھی فراہم ہوتی تھیں اور نظمیہ انداز کی وجہ سے شعری ذوق رکھنے والے دلوں کو تسکین بھی حاصل ہوتی تھی۔ شاید اسی سبب سے افق اور ان کا یہ اخبار بہت کم وقت میں خاص

Scanned with CamScanner

وعام میں ہر دلعزیز بن گیا۔

ہے کہتے ہیں نظم اخبار ایسا کارنامہ تھا

خبر بھی نظم میں ہوتی تھی ایسا زور خامہ تھا

افق نے نظم اخبار کے ذریعہ ایک کہنہ روایت کو بھی توڑا کیونکہ وہ عہد جو غزل کے عروج کا تھا اس میں افق نے صنف نظم کو عوام تک پہنچایا۔ لیکن ہوشیار ایڈیٹر کی طرح غزل کے انداز کو بھی برقرار رکھا۔ کیونکہ ایک اچھا مدیر زمانے کا نبض شناس بھی ہوتا ہے حالانکہ صحافت کے اعتبار سے افق کا دور کوئی ترقی یافتہ دور نہیں تھا لیکن نظم اخبار کے نثر کے جو اقتباسات دستیاب ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ حب الوطنی سے سرشار جو خبریں شائع ہوتی تھیں وہ بڑی غیر جانب دارانہ اور عام فہم ہوتی تھیں۔ اس وقت کا ہندوستان انگریزوں کے زیر اقتدار تھا جنگِ آزادی جاری تھی ایسے حالات میں قوم کو بیدار کرنے کے لئے نظم اخبار نے اہم رول ادا کیا۔ جو اس دور کا تقاضا تھا کیونکہ ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس قائم ہو چکی تھی۔ لالا لاجپت رائے، بال گنگا دھر تلک، بوین چند پال جیسے محب وطن آزادی کے لئے سرگرم عمل تھے۔ ملک کے تمام دانشور اور مصلح تہذیب کی چمک میں اپنی تہذیب وثقافت کو دھندلا ہوتا دیکھ پریشان تھے اور تمام ادباء و شعراء حب الوطنی کے جذبے سے سرشار اپنے ادب کے ذریعہ عوام کو اس طوفان سے بچانے کے لئے کوشاں تھے۔ افق نے بھی برطانوی حکومت سے حفاظت کے لئے اپنے مخصوص انداز میں عوام کو غفلت کی نیند سے بیدار کرنے کی ہر ممکن کوشش جاری رکھی۔

افق پنجاب سماچار، نظم اخبار، دھرم جیون کے مدیر بھی رہے اور بھارت پرتاپ، اودھ پنچ، زمانہ، شیو شمبھو جیسے اخبارات میں ان کی غزلوں اور مضامین کی اشاعت ہوتی تھی۔

پنجاب سماچار لاہور کی نظام ادارت جب افق کے ذمہ آئی تو رسالہ بھارت پرتاپ جھجھر نے لکھا۔

"رسالہ بھارت پرتاپ جھجھر کی مارچ ۱۹۰۲ء کی

اشاعت میں ایک نوٹ مدیر کے قلم سے درج ہے
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب سماچار ۱۱ اور
سے ہر منگل اور سنیچر کو شائع ہوتا تھا۔ اس زمانے
میں اس کو جاری ہوئے ۱۴ سال ہو چکے تھے۔
اس نوٹ کے مطابق چند ماہ سے اس اخبار کی کایا
پلٹ ہو گئی تھی کیونکہ اب یہ مشہور سخن سنج ملک
الشعراء منشی دوارکا پرساد افق لکھنوی کے زیر
ادارت شائع ہونے لگا تھا۔ بھارت پرتاپ نے
حضرت افق کے بارے میں اظہار رائے کرتے
ہوئے لکھا تھا کہ بھارت پرتاپ کے ناظرین منشی
صاحب کے علمی لیاقت اور ان کی شاعرانہ
فضیلت سے بخوبی واقف ہیں اسی لئے ہم کو
پنجاب سماچار کی بابت کچھ زیادہ ہی کہنا ہے کیونکہ
حضرت افق کی عالمانہ لیاقت سے آج اہل
پنجاب مستفید ہو رہے ہیں۔ پنجاب سماچار کو افق
صاحب کی بدولت جو عروج حاصل ہوا ہے اور
جس قدر ترقی کی امید کی جا رہی ہے وہ اس قابل
ضرور ہے کہ اہل نظر قدر کریں گے۔ شعر و سخن کا
پلہ جس قدر گراں ہے اسی قدر نثر کا بھاری ہے۔"

منشی سندر لال برق ایڈووکیٹ سیتاپور نے اپنے تذکرہ ہندو شعرا موسومہ بہار سخن میں
لکھا ہے۔

Scanned with CamScanner

''کلام میں رنگینی و جدت سے نظم و نثر دونوں پر
قادر تھے اور اخبار پنجاب سا چار کے ایڈیٹر
تھے۔''

افق کا ۱۵ روزہ 'نظم اخبار' ۱۲ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا جس میں ۸ صفحات میں منظوم خبریں اور ۴ صفحات میں نثر کی خبریں شائع ہوتی تھیں جس میں بحر و قافیہ کا خاص التزام کیا جاتا تھا۔ ڈاکٹر کوثر بھٹناگر لکھتی ہیں۔

''صفحات کی تاریخ کا پہلا اور شاید آخری تجربہ ہو
۔ دوسری خصوصیت یہ تھی کہ غزل کے دور میں
انھوں نے ''نظم'' اخبار کی خبروں کے لئے صنف
نظم کو اختیار کیا، یہ درست فیصلہ تھا کیونکہ شاید
صنفِ غزل اس کام کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔''

نظم اخبار کے پہلے ہی صفحہ پر افق کی ایک مثنوی شائع ہوا کرتی تھی جو اس اخبار کے مزاج و مقاصد کی وضاحت کرتی تھی جو افق اس اخبار کے ذریعہ کرنا چاہتے تھے۔ اس کا پہلا شعر حمد کا، اس کے بعد صنف نظم اور نظم اخبار پر مبنی ہوتا۔

ہے شکر اس خالقِ عالی صفت کا
مصنف ہے جو بند شش جہت کا
اشاعت نظم کی فرمائی جس نے
ردیف مہر و ماہ چمکائی جس نے
دکھائی خوبیاں فکر متیں کی
غزل تصنیف کی دنیا و دیں کی
نظیر اس کا نہیں فکر متیں میں

Scanned with CamScanner

کلام اس کا ہے ہر بحر و زمیں میں

مچا دے افتخار نظم کی دھوم

دکھا دے جلوۂ اخبار منظوم

مہینہ میں ہو جوش نظم دو بار

بنے ماہ دو ہفتہ جس میں اخبار

ہر اک انداز کے مضموں ہوں اس میں

مطالب نثر کے موضوع ہوں اس میں

ہو بہر مرگ مضموں فکر صیاد

رہے خامہ مثال سرو آزاد

خبر کے واسطے یہ تار ہو جائے

گلوئے علم و فن کا ہار ہو جائے

بنے یہ مخبر حالات عالم

دوائر اس کے سب ہوں ساغر و جم

رہے پہنے یہ فردوسی کا جامہ

بیانِ جنگ میں ہو شاہ نامہ

ہو خوش اس کی یورش سے کل زمانہ

نہ دکھنے دے یہ تسبیحوں کا دانہ

ظرافت کا نیا انداز دکھلائے

مذاقِ فکر کا اعجاز دکھلائے

ضمیمہ میں بہار نثر دکھلائے

جمال گل عذار نثر دکھلائے

Scanned with CamScanner

غرض اخبار کے جو جو ہیں منصب
وہ سب اس میں نظر طراز انصب
بڑھا تعریف سے توقیر اشعار
رقم کر بے بدل منظوم اخبار

مذکورہ بالا اشعار عہد افق کے دبستانِ لکھنؤ کی پوری ترجمانی کرتے ہیں اس مثنوی کا پہلا حصہ حمدیہ، دوسرا ثنائے دبستان لکھنؤ اور تیسرا حصہ اس دور کے اعتبار سے صحافت کے متعلق تقاضوں پر مبنی ہے۔ اس اخبار کی بہت سی خبریں نہ صرف معلومات فراہم کرتی تھیں بلکہ شعری ذوق کی تسکین کا بھی باعث تھیں۔ یہ اخبار ماہ میں دو بار شائع ہوتا تھا اور صفحۂ اوّل پر یہ شعر لکھا ہوتا ۔

از تمنائے تمنا و تمنائے افق
گشت نظم اخبار مہر عالم آرائے افق

اس اخبار میں سیاسی، سماجی، مذہبی اور جرائم وغیرہ کی خبریں عام فہم اور بڑے دلچسپ انداز میں ہوتی تھیں۔ کچھ نظم غزل کا انداز لئے ہوتی تھیں مثلاً لاہور کی ایک خبر کے دو شعر ملاحظہ فرمائیں ۔

یہاں کی ایک طوائف ہے مشہور
پرستاں کی پری فردوس کی حور
محبت میں بہم شیر و شکر تھے
گل و بلبل پہ اہلِ نظر تھے

اسی طرح شاہِ ایران کی ہندوستان آمد پر ۵/مارچ ۱۸۹۰ء کو یہ خبر اس طرح لکھتے ہیں۔

جو ایران کے شہر کشورستان ہیں
نظیر سنجر و نو شیرواں ہیں
حرم ہے ساتھ ان کے چشم بد دور

Scanned with CamScanner

جو خلد خط ایراں کے ہیں حور
ہیں ان سب سے چراغ خانداں سات
زمیں فارس پہ ہیں آسماں سات

یہ ساتوں ہفت جوش مملکت ہیں
یہ ساتوں ہفت کاہ شش جہت ہیں
یہ فرد سات چشم شاہ کے ہیں
یہ ہفت اختر سپہ جاہ کے ہیں
میان ہفت کشور فرد ہیں یہ
جوان و صفدر و پا مرد ہیں یہ
یہ شاہ کج کلاہ آنکھ کے نور
ہیں زینت بخش ایراں چشم بد دور

۱۸۹۰ء میں ہی ایک اور خبر ''نظم'' اخبار میں اس طرح شائع ہوتی ہے۔

خبر مشہور کرتے ہیں یہ اخبار
کہ یاں آئے گا پھر کابل کا سردار
جو ملنا لاٹ صاحب سے ہے منظور
تو ہو گا تخت گاہے خاص سے دور
ذرا اے ہند تو ہوشیار ہو جا
''ٹکس'' کے واسطے تیار ہو جا
ٹکس صاحب کے بانی آئیں گے پھر
خزانے دیشیوں کے جائیں گے پھر

Scanned with CamScanner

نہ ہو افلاس و ناداری سے خائف
خزانے کھول دے بحر تحائف
مہیا ساز و سامان حشم کر
مسافر مہمانی کے بہم کر
نہ کر پرواہ اگر ہو زیر باری
نہ گھبرا جو ہو حالت غم کی طاری
لگا دے گھر میں پھر صراف کے آگ
لنگوٹی میں ذرا پھر کھیل لے پھاگ
سباب آخرت ہے میزبانی
حج اکبر ہے صرف ایک مہمانی

کاٹھیاواڑ سے متعلق ایک خبر "نظم" میں اس طرح شائع ہوئی۔

عجب سرکش ہیں اس خطے کے ڈاکو
بجا ہیں گر کہیں ان کو ہلاکو
ہیں ان کے شور و شر سے زیر شہزور
کسی کے رعب سے دبتی نہیں کور
جفا کاری سے باز آتے نہیں ہیں
صدا محو دل آزاری یہ ہیں
کیا اہل پولیس کو حال میں تنگ
دکھا کر جوہر شمشیر ی کی جنگ

اسی طرح ایک بار ایک نواب صاحب جن کو سانپ پالنے کا شوق تھا نشہ کے عالم میں سانپ کے کاٹنے پر ان کی وفات ہوگئی اور افق نے یہ خبر تاریخ وفات کہتے ہوئے نظم اخبار میں

Scanned with CamScanner

شائع کرائی۔ مصرع یوں تھا کہ ؎

''لکھ دو میخواری ہے آخر کار مار آستیں''

مختصر یہ کہ افق کی تمام نظمیہ خبریں یہ ثابت کرتی ہیں کہ افق اپنے عہد کے حالات پر گہری نظر رکھتے تھے اور ہر واقعہ کو ایسا شعری پیکر عطا کرتے تھے جو شعری محاسن اور ان کی قادر الکلامی سے مقبول خاص و عام ہو جاتا۔ قارئین ایسے خوبصورت برمحل کلام پر عش عش کرتے شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ملک الشعراء ودوار کا پرساد افق لکھنوی کا نظم اخبار ایسا بیش بہا کارنامہ ہے جو انھیں تمام خصوصیات سے قطع نظر ایک بلند صحافی قرار دینے کے لئے کافی ہے۔ اس اخبار کے ذریعہ انھوں نے صحافت کی دنیا میں وہ مثال قائم کر دی جو مفقود ہے۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کے الفاظ اس ضمن میں کافی اہمیت کے حامل ہیں۔

> ''جناب افق ایک خانوادۂ علم و ادب کے ممتاز رکن تھے۔ انھوں نے شاعری وراثت میں، تربیت شعر و ادب کے ماحول میں پائی تھی اور جو صلاحیت بزرگوں سے ان کو ورثہ میں ملی تھی اس پر ان کی طبعی ذکاوت اور فطری شعریت نے جلا دی تھی۔۔۔۔۔ انھوں نے غزل سے زیادہ نظم کی طرف توجہ کی۔ وہ تمام اصناف سخن پر قادر تھے اور ان کی نظموں کا میدان بہت وسیع تھا۔ ان کا نظم اخبار جو تقریباً تمام و کمال نظم میں ہوتا تھا اُن کی پرگوئی کا شاہد ہے۔'' ؎

افق کی لیاقت کو نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہوئے کالی چرن اثر دہلوی کہتے ہیں ؎

نظم جس کی کیف گستر نثر جس کی بادہ بار

Scanned with CamScanner

جس کا نظم اخبار ہے دنیا میں واحد شاہکار

آفق کی صحافتی زبان اور انداز بیان میں سلاست و فصاحت اور عام فہم الفاظ کی برجستگی نے جو قدرت و جاذبیت پیدا کی وہ ان کی مقبولیت کا سبب بنتی گئی۔ آگرہ کے مشہور اخبار "آگرہ اخبار" کے مدیر نے ۱۸۹۰ء کے ماہ فروری کے شمارے میں انھیں تہنیت پیش کرتے ہوئے لکھا۔ ملاحظہ ہو۔

ہیں تمنا واقف زمزمہ پیرا اس کے
ایسا اخبار نہ دیکھا نہ سنے یہ نغمے
مشق اول کے ورق ہیں کہ سخن کے چربے
حق تعالیٰ نظر بد سے بچائے رکھے

کونپلیں پھوٹی ہیں نخل سخن اردو میں
پھول پھولے ہوئے دیکھو چمن اردو میں

نظم اخبار کس انداز سے نکلا دیکھو
اب تلک ہند میں جو تم نے نہ دیکھا دیکھو
اور اس باغ میں ایک طوفاں تماشا دیکھو
بلبل باغ کو یوں زمزمہ پیرا دیکھو

جس سے کانوں میں صدا لطف سخن کی آئے
جو ہوا آئے وہ تا تار و قطن کی آئے

اسی طرح بنگلور کے "سلطان الاخبار" کے مدیر نے بھی نظم اخبار کے پیش نظر آفق کی صحافتی توصیف پر اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا۔۔۔ "کچھ عرصہ سے ہندوستان کا اکلوتا اخبار دفتر مطبع میں آتا ہے۔ ہم نے اس اخبار کو غور کی نظر سے دیکھا اور اس کے منظومہ مضامین کو نکتہ چینی سے خیال کیا۔ ہمیں خوشی حاصل ہوئی کہ باوجود اس خیال کے ہم نے اس اخبار کو ہر طرح سے عمدہ پایا۔

Scanned with CamScanner

نظم میں فصاحت کے ساتھ شاعرانہ اسباب موجود، حشو نظم اخبار کے کلام سے مفقود، خبروں کو موتیوں کے ملک میں ایسا پرویا ہے گویا دریا کو کوزہ میں بند کیا ہے۔ کہیں مسدس، کہیں رباعیات اور کہیں غزلیات کی دھوم ہے۔ ہر ایک شعر میں زمانہ کی حالت اور نیچرل مضامین کا ہجوم ہے۔ ایڈیٹر نے اپنی طبیعت کے ایسے جوہر دکھائے کہ بے ساختہ کہنا پڑتا ہے کہ شعر گوئی اس کا نام ہے۔ منشی دوارکا پرساد افق نے ہندیوں پر ثابت کر دیا کہ ابھی ہندوستان کی خاک میں وہ زور ہے کہ جس طرف متوجہ ہو وہ کام کر دکھائے کہ اہل یورپ سے بن نہ پڑے۔"

منشی دوارکا پرساد افق لکھنوی کا ہندوستان کی مختلف دیہی ریاستوں کٹک، میسور، بلرام پور، الور، جھجھر، اودھ روہیلکھنڈ، بھوپال، کوٹا اور نظام حیدرآباد کے راجاؤں ونوابین سے بڑے خوشگوار تعلقات رہے حیدرآباد کے نظام میر محبوب علی خاں تو اتنے متاثر تھے کہ انھیں ملک الشعراء کے خطاب سے بھی سرفراز کیا اور اُن کے وزیر مہاراجہ گردھاری پرساد باقی نے افق کے اخبار کی اشاعت میں مالی تعاون بھی کیا۔

افق نے دہلی میں منعقدہ قدیم نیشنل کانگریس کمیٹی کے جلسہ میں بحیثیت مدیر شرکت کیا اور اس کی رپورٹ نثر میں اس طرح شائع کیا:

"۱۰ر ستمبر ۱۸۸۸ء کو دہلی میں ایک بہت بڑا جلسہ نیشنل کانگریس کا ٹاؤن ہال میں منعقد ہوا جس میں خواجہ علی محمد، بھیم جی رئیس بمبئی اور مرلی دھر صاحب وکیل انبالہ اور جناب امراؤ مرزا صاحب حیرت نے نہایت عمدہ اور مفید اسپیچ میں بیان فرمایا۔ حاضرین نہایت خوش ہوئے اور بڑی بڑی تعریفیں ہوئیں۔ خیالات مخالفانہ کی جڑ کٹی۔ جناب حیرت نے ایک درد انگیز نظم پڑھی

Scanned with CamScanner

جس پر نعرۂ تعریف بلند ہوتے تھے۔ اس جلسہ
میں تقریباً ۱۰۰۰ معزز ہندو، ۵۰۰ باعزت مسلمان
اور ۱۲ یورپین موجود تھے۔ جناب شیخ حفیظ اللہ خاں
صاحب میونسپل کمشنر اس جلسہ کے چیرمین تھے۔
ہمدردان ملک کو اس جلسہ کی کامیابی کے لئے
مبارک باد دیتے ہیں۔"

مذکورہ خبر بھی اس بات کی ضامن ہے کہ افق کے اخبار کی نثر بھی آسان، رواں عام فہم اور حسبِ ضرورت الفاظ سے لبریز ہوتی تھی اور افق بحیثیت ایڈیٹر اپنی اہم ذمہ داری بڑی خوبصورتی سے ادا کر رہے تھے کہ وقت کی ضرورت کے مطابق ملک کے حق میں غور و فکر کرنے والوں اور مختلف خیالوں کے امتزاج سے یکجہتی کی فضا قائم ہو تب ہی غلامی کی لعنت سے ملک آزاد ہو سکے گا۔ انھوں نے ہجو ملیح نثر نگاری سے کام لیا یعنی وہ نثر جس میں فنکار ایسا طنز کرے جس سے قاری زیرلب مسکرا کر حقیقت سے آگاہ بھی ہو جائے اور مخالف حقیقت تک پہونچ نہ پائے۔ یہ بھی فنِ صحافت کا ایک خاص وصف ہے جو افق کی صحافت میں نظر آتا ہے۔

افق نے اپنے عہد میں جس قسم کی صحافت کی بنیاد ڈالی اور اخبارات و رسائل کے ذریعہ خود کو ایک منفرد صحافی بنا کر پیش کیا وہ قابلِ رشک ہے۔ ان کی وابستگی اودھ اخبار سے بھی رہی اور وہاں بھی قابلِ قدر خدمات انجام دیتے ہوئے برائے طنزیات میں بھی اخلاص کا دامن مضبوطی سے پکڑے رکھا۔ آج صحافت کے معنی چاہے جتنے بدل گئے ہوں لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ افق کی صحافتی خدمات کو ہر دور میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ بقول کنور لال شرما کنول ؎

نمایاں ہیں لاکھوں نقوش جمیل
مٹے گا نہ ہرگز نشانِ افق

Scanned with CamScanner

حوالاجات:

۱۔ Centenary Souvenir in Memory of Ufuq, Compiled by Munawwar Lucknavi, Nov. 1964

۲۔ ملک الشعراء منشی دوارکا پرساد افق لکھنوی از ڈاکٹر کومل بھٹناگر

۳۔ ماہنامہ 'نیا دور'، منشی دوارکا پرساد افق نمبر، ستمبر ۲۰۱۴ء

☆☆☆

مسز زرینہ بیگم

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اردو

حمیدیہ گرلس ڈگری کالج، الہ آباد

Scanned with CamScanner

تہذیب الاخلاق کی ادبی وسماجی خدمات

تہذب الاخلاق نام سے ہی ظاہر ہے کہ اس رسالے کا مقصد معاشرے کی اصلاح تھا لیکن سرسید کی فکر کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے ادب کو ہی سماج کی اصلاح کا ذریعہ بنایا اور شاعری جو حسن وعشق، گل وبلبل تک ہی محدود تھی اسے اصلاحی مقصد کے تحت استعمال کیا۔ غیر ملکی زبانوں کے مضامین کے ترجمے کرائے اور اس پیغام کو لوگوں تک پہچانے کے لئے تہذب الاخلاق کو ذریعہ بنایا۔ اس لئے اس رسالے کو محض ادبی یا محض سماجی رسالہ کہنا مناسب نہ ہوگا کیونکہ جہاں ایک طرف تہذب الاخلاق نے سماج کی اصلاح کا کام انجام دیا تو دوسری طرف اردو ادب کو بھی اس رسالے سے مزید فروغ حاصل ہوا۔ سرسید نے ادب برائے ادب اور حسن برائے حسن سے قطع نظر کرتے ہوئے اس کو زندگی کے مقاصد سے وابستہ کیا۔ سرسید کا ماننا تھا کہ ادب افادی عمل کی حیثیت رکھتا ہے جو تکمیل حیات اور ترقی کا اہم وسیلہ بن سکتا ہے۔ اس بنا پر سرسید کو اردو ادب کا پہلا ترقی پسند ادیب اور نقاد کہا جاسکتا ہے۔

تہذب الاخلاق نے اردو صحافت نگاری میں ایماندارانہ صحافت کا معیار قائم کیا۔ سرسید جانتے تھے کہ صحافت حق گوئی اور راست بازی کا کام ہے جو کسی کے ماتحت نہ ہو۔ قوم کی اصلاح سرسید کی دلی خواہش تھی۔ اور بغیر عصری تعلیم کے قوم کو عصر حاضر کی ترقی یافتہ قوموں کے مدمقابل کھڑا کرنا ممکن نہ تھا۔ انھیں حالات کے پیش نظر سرسید نے اسپکٹیٹر اور ٹیٹلر کی طرز پر ہندوستان میں تہذب الاخلاق جاری کیا جس کے اثرات سے معاشرے میں مثبت فکر کو تقویت ملی اور قوم کی معاشرتی، ثقافتی، علمی، مذہبی، تہذیبی زندگی میں بدلاؤ آیا۔ سرسید ایک جگہ لکھتے ہیں:

''تہذب الاخلاق کے جاری کرنے سے ہماری قوم کی جہالت، معاشرت کی اصلاح مقصود و مطلوب ہے۔ آخر اسی واسطے سوشل ریفارمر یعنی تہذب الاخلاق اس کا نام رکھا۔'' [1]

اس پرچے کو نکالنے کا ارادہ انھوں نے انگلینڈ میں ہی کر لیا تھا کیونکہ تہذب الاخلاق

Scanned with CamScanner

میں جو نام اور بیل چھپتی تھی اس کا ٹیپ وہ لندن سے بنوا کر لائے تھے۔ سرسید ایک خط میں حالی کو لکھتے ہیں:

''ہندوستان پہنچ کر ایک اخبار خاص مسلمانوں کے فائدے کے لئے جاری کرنا میں نے تجویز کر لیا ہے اور تہذب الاخلاق اس کا نام فارسی میں اور انگریزی میں'' محمڈن سوشل ریفارمر'' رکھ لیا ہے اس کا سرنامہ بہت خوبصورت یہاں کھدوالیا ہے۔ کاغذ بھی ایک برس لائق یہاں خرید لیا ہے اور یہ سب چیزیں یہاں سے بذریعہ جہاز بادبانی روانہ کر دیں کہ میرے وہاں پہنچنے تک پہنچ جائیں۔ اس اخبار میں بجز اس کے کہ خاص مسلمانوں کی دینی اور دنیاوی بھلائی کے آرٹیکل ہوں گے اور کچھ نہیں ہوگا۔'' ۲

دراصل تہذب الاخلاق کی اشاعت کا مقصد معاشرے میں ایک انقلاب لانا تھا۔ اور اس کے پس پشت مقصد قوم کی ذہنی تعمیر و تربیت کرنا تھا۔ لہٰذا تہذب الاخلاق نے قوم کو ہر سطح پر متاثر کیا ہے خواہ وہ تعلیمی ہو، سیاسی ہو، معاشی ہو یا پھر مذہبی ہی کیوں نہ ہو کیونکہ یہ تہذب الاخلاق کے مضامین کا ہی اثر تھا کہ نئے طرز کے مدارس قائم کئے گئے اور ادب میں انفرادیت کے بجائے اجتماعیت، داخلیت کے بجائے سماجی شعور کا احساس دلایا۔ یہاں تک کہ تہذب الاخلاق نے مضامین کے ذریعہ معاشرے میں پھیلی بے جا رسوم اور فرسودہ روایات کے خلاف بھی آواز اٹھائی۔ اس رسالے نے معاشرے کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات بھی اٹھائے اور بین الاقوامی سطح کے موضوعات بھی مضمون نگاری کی ابتدا کا سہرا بھی سرسید کے ہی سر جاتا ہے۔ خود اس معاملے میں تحریر کرتے ہیں:

''نئی اردو نے درحقیقت ہماری ملکی زبان میں جان ڈال دی ہے مضمون نگاری دوسری چیز ہے جو آج تک اردو زبان میں نہ تھی۔ یہ اسی زمانہ میں پیدا ہوئی اور ابھی بچپن کی حالت میں ہے۔'' ۳

تہذب الاخلاق کی ادبی خدمات میں سب سے زیادہ مفید و کارآمد اور اثر انگیز مقالات و

Scanned with CamScanner

مضامین ہی ثابت ہوئے جہاں انھوں نے فطری لب ولہجہ سے آشنا کیا وہیں نئے نئے موضوعات اور خیالات سے بھی اردو نثر کو مزید سنوارا۔ تہذب الاخلاق کے مضامین میں مذہب۔ تاریخ تصوف اخلاق و معاشرت تہذیب و تمدن سب پر بحث ملتی ہے۔ سرسید کے مضامین بھی شائع ہوتے رہے انھوں نے انگریزی ادب سے استفادہ کر کے اپنے مضامین کو اور بہتر ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ سرسید لکھتے ہیں:

'' ہم نے نامی یورپ کے عالموں ایڈیسن ایسٹن کے مضامین کو بھی اپنے طرز میں اور اپنی زبان میں لکھا ہے جہاں ہم نے اپنے نام کے ساتھ اے ڈی اور ایس ڈی کا اشارہ کیا ہے اور اپنی قوم کو دکھایا ہے کہ مضمون لکھنے کا طرز کیا ہے اور ہماری اردو زبان میں ان خیالات کے ادا کرنے کی کیا کچھ طاقت ہے اور اگر ہماری قوم اس پر سوچتی ہو تو کس قدر اور زیادہ خوبی اور صفائی اور سادگی اس میں پیدا کر سکتی ہے۔'' [۴]

سرسید کی صحافت نے مسلمانوں کے تہذیب و تمدن کو سنوارنے اور معاشرے کی اصلاح کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اردو زبان و ادب کو بھی اس سے کافی فائدہ پہنچا۔ اردو زبان سے سرسید کو خاص لگاؤ تھا اور وہ نثر کو آسان بنانا چاہتے تھے۔ وہ نثر میں پیچیدہ تراکیب اور لفاظی کے خلاف تھے اور اگر بات صحافت کی کی جائے تو صحافت کے اصولوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اخبار عام فہم زبان میں ہوتا کہ اس سے سماج کا ہر طبقہ استفادہ حاصل کر سکے اور سرسید کا مقصد قوم کی اصلاح تھا اسی لئے تہذب الاخلاق میں اس اصول کو مدنظر رکھا گیا۔ اس کے مضامین عام فہم ہوتے لہٰذا اس صحافتی انداز سے اردو صحافت میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا ہے۔ جہاں ادب اور صحافت ایک دوسرے سے مشترک ہو گئے۔

تہذب الاخلاق کے مضامین میں جا بجا انشائیے کے عناصر بھی مل جاتے ہیں۔ بحث و تکرار، امید کی خوشی، سراب حیات میں انشائیہ کا رنگ پایا جاتا ہے۔ ان کو ہم انشائیہ نگاری کی ابتدائی صورت کہہ سکتے ہیں۔ اس طرح سرسید کے مضمون 'امید' میں بھی جا بجا انشائیہ کے عناصر

Scanned with CamScanner

ملتے ہیں۔ سرسید نے نثر ہی نہیں بلکہ اپنے مضامین کے ذریعہ شاعری پر بھی ناقدانہ نظر ڈالی ہے اگر چہ اردو شاعری میں میر، سودا، غالب اور ان جیسے بڑے شعرا کے نام موجود ہیں لیکن ان کی شاعری نے تفریح وطبع کا سامان زیادہ مہیا کیا لیکن سرسید نے پہلی بار یہ باور کرایا کہ شاعری مبالغہ آرائی سے اوپر اٹھ کر سماج کی فلاح و بہبود اور اصلاح کا ذریعہ بھی بن سکتی ہے۔ شاعری کو عاشقانہ مضامین تک محدود نہ رہ کر زندگی کے مسائل اور تقاضوں کا آئینہ دار بھی ہونا چاہیے۔ تہذب الاخلاق کے ذریعہ سرسید نے اردو زبان کو نکھارنے اور سنوارنے کی حتی الامکان کوشش کی۔ اس سلسلے میں سرسید خود لکھتے ہیں:

''جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اردو زبان کے علم وادب کی ترقی میں اپنے ان ناچیز پرچوں کے ذریعہ کوشش کی۔ مضمون کے ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا جہاں تک ہماری کج مج زبان نے یاری دی۔ الفاظ کی درستی، بول چال کی صفائی پر کشش کی، رنگیں عبارت، جو تشبیہات اور استعارات خیالی سے بھری ہوئی ہے اور جس کی شرکت صرف لفظوں میں ہی رہتی ہے اور دل پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا، پرہیز کیا تک بندی سے جو زمانے میں مقفیٰ عبارت کہلاتی تھی، ہاتھ اٹھایا جہاں تک ہو سکا سادگی عبارت پر توجہ کی اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو وہ صرف مضمون کی ادا میں ہو جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے تا کہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔'' ۵

ہندوستان میں خانقاہوں اور مسجدوں کو تعلیمی درس گاہ کی حیثیت حاصل تھی لیکن یہ تعلیم مذہبی یا مشرقی علم تک ہی محدود تھی اور یہ قدیم نظام تعلیم وقت کی ضرورت کو پورا کرنے سے قاصر تھا۔ لہٰذا تہذب الاخلاق نے جدید علم کے لئے ذہنوں کو تیار کیا اور لوگوں کو سائنسی اور ٹکنالوجی کے فوائد سے روشناس کرایا۔ تہذب الاخلاق نے جدید علوم فلسفہ سائنس، ریاضی ٹکنالوجی وغیرہ جسے حاصل کرنا مسلمان شریعت کی رو سے غلط سمجھتے تھے انھیں دلیلوں کے ساتھ واضح کیا کہ ان کو حاصل

Scanned with CamScanner

کرنے سے کوئی کرسٹان نہیں ہوتا اور نہ ہی ان علوم کا حاصل کرنا ناجائز ہے کیونکہ مسلمان نے ان علوم میں بڑا نام پیدا کیا ہے۔ علم ہندی اور طب کیمیاء کا علم عربوں کی بدولت ہی اسپین سے فرانس اور پھر پورے یورپ میں پھیلا لہٰذا اگر یہ ممنوع ہوتا تو عہد اسلام میں یہ علم اتنی ترقی نہ کرتے۔ تہذب الاخلاق نے مسلمانوں کو جدید علوم کی طرف راغب کرنے کے لئے ہر وہ طریقہ اپنایا جس سے ان علوم کی ترویج مسلمانوں میں ہو سکے۔ تہذیب الاخلاق نے ایک مکمل نظام تعلیم کا تصور پیش کیا۔

سماجی اور معاشرتی زندگی میں مذہب کو نمایاں مقام حاصل ہے اور سماج کی ذہنی نشو و نما میں مذہب ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ کسی بھی ملک کی معاشرتی زندگی کو مذہبی عقائد سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ تہذیب الاخلاق نے سماج کی بہتر نشو و نما کرنے کے لئے مذہبی اصلاح کرنا ضروری سمجھا اور اسلام میں پھیلی ہوئی غلط رسوم کی نشاندہی کی۔ تعصب و تنگ نظری پر بھی مضامین لکھوائے۔ خود سرسید کے مضامین کا ایک بڑا حصہ مذہبی، علمی اور فلسفیانہ موضوعات پر مشتمل ہے۔ اس میں مذہبی مسائل کو زیر بحث لانے کا مقصد صرف معاشرے کی اصلاح کرنا اور جدید علوم کو فروغ دینا تھا جبکہ تہذیب الاخلاق کا اصل موضوع مذہب ہرگز نہیں تھا لیکن سماج کی اصلاح کے لئے مذہبی معاملات پر گفتگو کرنا اشد ضروری تھا کیونکہ ان برائیوں کو نظر انداز کر کے اخلاقی اور تعلیمی اصلاح ممکن نہ تھی۔

اس کے علاوہ تہذیب الاخلاق نے ہندوستانیوں کی معاشی صورت حال کو بہتر بنانے کے لئے بھی متعدد مضامین لکھوائے جس میں انھیں تجارت کی افادیت بتاتے ہوئے اسے کرنے کا طریقے بھی بتائے تا کہ ملک کی صنعت و حرفت میں ترقی ہو اور ہندوستان کی تجارت کا بڑا حصہ جو غیر ملکیوں کے ہاتھوں میں ہے وہ ہندوستانیوں کے ہاتھ آئے اور اس مفلوح الحال قوم کی معاشی ترقی ہو سکے اس سلسلے میں محمد حکمت کا مضمون ''ہماری قوم اگر چاہے تو کس درجے تک ترقی کر سکتی

Scanned with CamScanner

ہے" خاص اہمیت رکھتا ہے۔

☆☆☆

رضوانہ شمسی

اسسٹنٹ پروفیسر

شعبۂ اردو، الٰہ آباد یونیورسٹی، الٰہ آباد

Scanned with CamScanner

سرزمینِ دکن میں اردو صحافت

انیسویں صدی میں ہندوستان میں اردو صحافت کی تاریخ دراصل قومی وسیاسی بیداری کی تاریخ ہے۔ جو ملک کی تحریک آزادی کے شانہ بہ شانہ ترقی پذیر ہوتی ہے۔ اس دور کے اردو اخبارات نے قومی تحریکات خصوصاً ۱۸۵۷ء میں ہونے والی پہلی جنگ آزادی میں اہم کردار ادا کیا۔ جسکی وجہ سے حکومت برطانیہ نے ہندوستانی پریس کو اپنا صریح دشمن مانتے ہوئے اس کی روز افزوں ترقی کو روکنے کے لئے کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا۔ کیوں کہ اس وقت کے زیادہ تر اخبار بلاواسطہ یا بالواسطہ آزادی کے خواہاں تھے اور جد و جہد آزادی کی تحریک کو تقویت پہنچا رہے تھے۔ ان اخبارات میں حب الوطنی کے جذبے سے لبریز ایسے مضامین اور ترانے شائع ہوئے تھے جو عوام کے دلوں میں دبے ہوئے بغاوت کے شعلوں کو ہوا دیتے تھے، چنانچہ ان اخبارات اور ان کے صحافیوں کو انگریزوں کے قہر و غضب کا نشانہ بننا پڑا۔ لیکن انگریز حکام کی تمام تر چیرہ دستیوں اور ریشہ دوانیوں کے باوجود ۲۸/ مارچ ۱۸۲۲ء میں کلکتہ سے جاری ہونے والے اخبار ''جامِ جہاں نما'' سے اردو اخبارات کی اشاعت کا جو سلسلہ شروع ہوا اس میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ اور ملک گیر سطح پر چھوٹے بڑے اخبارات و رسائل کی اشاعت کا ایک لامتناہی سلسلہ قائم ہو گیا۔

اس دور میں ہندوستان کی تاریخ کا اردو زبان و ادب اور صحافت کے حوالے سے جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ سرزمین دکن اردو زبان و ادب کے آغاز و ارتقاء میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن اس وقت پورے جنوبی ہند میں جو اردو بول چال یا ادب میں رائج تھی اسے دکنی کہا جاتا تھا۔ اس زمانے میں لسانی سطح پر جب شمال و جنوب میں باہمی ربط ضبط قائم ہوا اور فورٹ ولیم کالج کی لسانی و ادبی گرمیوں نے اردو نثر کے حسن و سادگی کو فروغ بخشا تو دکنی زبان کو بھی سنورنے اور نکھرنے کا موقع ملا اس کے نتیجے میں دکنیت پر اردوئیت غالب آ گئی اور دکن میں اس کا رواج عام ہو گیا۔ ایسے میں کلکتہ سے شائع ہونے والے اخبارات و رسائل کی ملک گیر شہرت و مقبولیت نے دکن کی اردو صحافت کو بھی متا

Scanned with CamScanner

ئر کیا۔

جہاں تک دکن میں اردو صحافت کی ابتداء کی بات ہے تو اس ضمن میں ٹیپو سلطان کے دورِ حکومت میں شائع ہونے والے ''فوجی اخبار'' کو اولیت کا شرف حاصل ہے جس کا اجراء ۱۷۹۴ء میں ہوا۔ امداد صابری کے مطابق اردو کا یہ پہلا اخبار ٹیپو سلطان کے حکم سے ان کی فوج کے لئے سری رنگا پٹنم سے جاری کیا گیا تھا۔ بعض محققین نے دکن کی صحافی تاریخ میں ''سفیر کرناٹک'' اخبار کا بھی ذکر کیا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ نہ تو ''فوجی اخبار'' اور نہ ''سفیر کرناٹک'' کا کوئی شمارہ اب تک دریافت ہو پایا ہے۔ اس سلسلے میں ہونے والی تحقیقات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کوئی بھی بات قطعیت سے نہیں کہی جا سکتی۔ مگر یہ بات حقیقت ہے کہ مدراس میں لیتھوگرافی کے پریس کا قیام کلکتہ میں پریس کے قیام کے بعد وقوع پذیر ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ شمالی ہند مثلاً دہلی اور لکھنؤ وغیرہ میں پریس کا قیام دکن کے بعد ہوتا ہے۔ اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے ''جنوبی ہند میں اردو صحافت'' کے مصنف ڈاکٹر افضل الدین اقبال کا یہ خیال درست معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی دکن میں کئی ایک مطابع قائم ہو چکے تھے۔ دکن میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام اور اس کے نتیجے میں پیدا شدہ حالات کا بغور مطالعہ کریں تو یہ بات واضح ہو جاتی کہ اردو اخبار کی اشاعت کے پہلے ناگزیر فضا ۱۸۴۱ء سے بہت پہلے قائم ہو چکی تھی۔

دکن کی اردو صحافت کا بغور جائزہ لینے پر یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ سرزمینِ دکن میں اردو صحافت کی تاریخ بہت تابناک رہی ہے۔ دکن میں اردو صحافت کا باقاعدہ آغاز ۱۸۴۱ء میں ''جامع الاخبار'' کی اشاعت سے ہوتا ہے۔ یہ ایک ہفت روزہ اخبار تھا جس کے مدیر سید رحمۃ اللہ تھے۔ لیکن ''دکن میں اردو'' کے مصنف مولوی نصیر الدین ہاشمی کے مطابق دکن کا پہلا اردو اخبار غالباً ''عمدۃ الاخبار'' ہوگا۔ جس کی اشاعت ۱۷۹۶ء اور ۱۸۰۲ء کے مابین ہوئی ہوگی۔ جب کہ ڈاکٹر عبد الحق سابق صدر شعبۂ اردو مدراس یونیورسٹی اپنے تحقیقی مقالے میں ۱۸۴۸ء میں شائع ہونے والے ''اعظم الاخبار'' کو دکن کا پہلا اردو اخبار بتاتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

مذکورہ بالا اخبارات کے علاوہ جن اخباروں کا شمار جنوبی ہند کے اولین اخبارات میں ہوتا ہے ان میں ہفت روزہ ''مخزن الاخبار'' ۱۸۵۰ء ''تعلیم الاخبار'' ۱۸۵۱ء ''شمس الاخبار'' ۱۸۵۱ء ''صبح صادق'' ۱۸۵۴ء ''طلسم حیرت'' ۱۸۵۶ء خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور قومی یکجہتی کو فروغ دینے والے یہ اخبارات اپنی شستہ وصاف ستھری زبان اور دیگر گونا گوں خصوصیات کے باعث دکن کے علاوہ ملک کے دوسرے حصوں مثلاً دہلی، رامپور اور آگرہ وغیرہ میں بھی بہت مقبول تھے خاص طور پر ''جامع الاخبار'' جس نے سماجی اصلاح کا بیڑہ اٹھاتے ہوئے معاشرتی قباحتوں پر نہایت بے باکانہ تبصرے شائع کیے۔ اس اخبار کی دلیرانہ جرأت مندی کا یہ عالم تھا کہ اس میں برٹش حکومت کی متعصبانہ پالیسیوں، معاشی استحصال، مکر وفریب اور جبر و استبداد کے کریہہ چہرے کو بے نقاب کیا گیا تھا۔

اگر ہم ریاست کرناٹک میں اردو صحافت کی بات کریں تو یہاں سے شائع ہونے والے ہفت روزہ ''قاسم الاخبار'' کو کرناٹک کا پہلا اخبار قرار دیا جاتا ہے۔ جو ۱۸۶۰ء میں بنگلور سے جاری ہوا تھا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ کرناٹک میں اردو صحافت کا باضابطہ آغاز ''قاسم الاخبار'' سے ہوتا ہے۔ جو اپنے دور کا مقبول ترین اخبار تھا لیکن اس کی زبان پر دکنی کے اثرات زیادہ تھے اس ضمن میں اخبار ''انجمنِ پنجاب'' لاہور کے ۵ر فروری ۱۸۷۶ء کے شمارے میں شائع شدہ تبصرے کا یہ اقتباس قابل ذکر ہے۔

''بنگلور میں بڑے چار ورق پر چھپتا ہے۔ کاغذ و خط اس کا نہایت عمدہ ہے۔ ایڈٹر صاحب اس کے ہر ہفتہ میں ایک دو مضامین لکھتے ہیں اس کے علاوہ بہت سے معاونین ہیں جو ہر قسم کے مضامین لکھا کرتے ہیں۔ یہ اخبار مدراس کی طرف خوب بکتا ہے۔ ایک خرابی بڑی یہ ہے کہ اردو وہاں کی محض خراب ہے عبارت اخبار کے ایڈٹر کی لکھی ہوئی بہ اعتبار اردو اہلِ دہلی کے غیر فصیح ہوتی ہے۔ مالک ایڈٹر اس کے منشی محمد قاسم غم ممدوح لائق اور بیدار مغز آدمی اور شاعر ہیں۔ اخبار پندرہ سال سے چھپتا ہے اور سب مدراسی اخباروں سے بہتر ہے''۔

Scanned with CamScanner

تقریباً پچاس سالوں تک ''قاسم الاخبار'' کا صحافتی سفر جاری رہا اور شاید آگے بھی جاری رہتا اگر انگریزوں کی بے جا پابندیاں نہ ہوتیں، بہر حال اس اخبار نے کرناٹک میں اخبار بینی کے ماحول کو عام کیا۔ لوگوں کو خبروں کی اہمیت سے روشناس کرایا۔ اس اخبار نے کرناٹک میں اردو صحافت کے لئے راہ ہموار کی اور وہاں یکے بعد دیگرے اخبارات کی اشاعت کا سلسلہ قائم ہوا۔ جن میں ''طلسمِ کرتان'' و ''منشورِ محمدی'' 'میسور اخبار' 'بادصبا' 'احسن الاخبار' وغیرہ کے نام تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ خاص کر 'طلسمِ کرتان' جو اگست ۱۸۶۵ء میں منظر عام پر آیا اور بہت جلد اس نے کامیابی اور شہرت حاصل کر لی اس اخبار کے متعلق مولوی عبدالحق نے اپنے مضمون 'انیسویں صدی میں اردو اخبار' مطبوعہ ماہنامہ اورنگ آباد میں لکھا ہے کہ اختر شہنشاہی میں اس اخبار کا ذکر ہے اور اسے بنگلور ہی کا ہفتہ وار بتایا گیا ہے۔

اگر چہ حکومت کی بے اعتنائی اور مالی وسائل کی کمی کے باعث ان اخبارات کی عمریں قلیل رہی ہیں لیکن ان سے تحریک پا کر ریاست کرناٹک کے بیشتر اضلاع مثلاً گلبرگہ، بیدر، بیجاپور، رائچور، بنگلور، میسور، ٹمکور، ہبلی اور شیموگہ وغیرہ سے بھی اردو اخباروں کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہوا۔ اس مختصر سے مقالہ میں ان تمام اخباروں کا ذکر کرنا ممکن نہیں ہے۔

حیدرآباد میں اردو صحافت کا آغاز سہ ماہی رسالہ سے ہوتا ہے جو ایک طبی رسالہ تھا۔ جس کے سنہ اشاعت اور مدت اشاعت کے متعلق محققین میں اختلاف رائے ہے۔ اس سہ ماہی کی اشاعت کے بعد ہفت روزہ اور پھر روزناموں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ حیدرآباد سے جاری ہونے والے اردو کے پہلے ہفت روزہ کے سلسلے میں بھی محققین میں اختلاف ملتا ہے۔ ''اردو صحافت انیسویں صدی میں'' کے مصنف ڈاکٹر طاہر مسعود ''آصف الاخبار'' کو حیدرآباد کا پہلا اخبار قرار دیتے ہیں۔ یہ ایک ہفت روزہ اخبار تھا۔ اس کے مالک و مدیر نارائن راؤ تھے۔ جن کے متعلق نصیرالدین ہاشمی کا قول ہے۔

''یہ امر خصوصیت سے قابل تذکرہ ہے کہ حیدرآباد کا پہلا ہفتہ وار اردو اخبار جاری

Scanned with CamScanner

کرنے والے ایک ہندو بزرگ تھے جن کی مادری زبان اردو نہیں تھی، بلکہ یہ صرف حیدرآباد کے ماحول کا اثر اور عوام کی ضروریات کے باعث ہے کیوں کہ عام بول چال کے علاوہ اردو کو ادبی حیثیت بھی حاصل ہوگئی تھی۔ اسی وجہ سے ہفتہ وار اخبار کی اجرائی ہوئی تو وہ تلنگی یا مرہٹی کے بجائے اردو میں ہوئی"۔

"آصف الاخبار" میں خبروں کے علاوہ ادبی مضامین کی شمولیت بھی ہوتی تھی"۔ ۱

بدر شکیب ۱۸۷۷ء میں شائع ہونے والے "خورشید دکن" کو حیدرآباد کا پہلا اخبار تسلیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"حیدرآباد کا سب سے پہلا اخبار "خورشید دکن" ہے جو پہلے ۱۸۷۷ء میں بہ ادارت مرزا کاظم غازی ہوا اور ۱۸۷۸ء میں بند ہوگیا"۔ ۲

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید بھی "خورشیدِ دکن" کو ہی حیدرآباد کی اردو صحافت کا پہلا اخبار مانتے ہیں"۔ ۳

اگرچہ "خورشید دکن" "آصف الاخبار" کی اشاعت سے ایک برس قبل شائع ہوا تھا لیکن اس کی میعاد اشاعت کا ذکر کہیں کسی کتاب میں نہیں ہے لہٰذا اسے حیدرآباد سے جاری ہونے والا اردو کا پہلا اخبار نہیں کہا جاسکتا۔ "خورشید دکن" کی مانند ۱۸۸۰ء سے ۱۸۸۳ء کے مابین صحافتِ حیدرآباد میں 'مفیدِ عام' 'رحمانی' 'دارالطبع' اور 'متین کرتان' وغیرہ ایسے اخبارات ہیں جن کا ذکر "تاریخی اختر شہنشاہی" میں ملتا ہے۔

حیدرآباد میں روزناموں کی ابتداء ۱۸۸۳ء میں 'ہزار داستان' کے اجراء کے ساتھ ہوتی ہے۔ پہلی مرتبہ سید حسن بلگرامی کی ادارت میں نکلنے والے اس روزنامہ کو جناب اختر حسن نے حیدرآباد کا پہلا اردو روزنامہ قرار دیا ہے۔ ۴

اختر حسن کی طرح بدر شکیب بھی 'ہزار داستان' کو حیدرآباد سے شائع ہونے والا پہلا روزنامہ تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے مطابق۔

Scanned with CamScanner

''حیدرآباد کا پہلا اردو روزنامہ'' ہزار داستان'' ہے جو ۱۸۸۴ء میں محمد سلطان عاقل دہلوی کی ادارت میں جاری ہوا اور پانچ سال تک نکلتا رہا''۔ ۵

یہ حقیقت ہے کہ 'ہزار داستان' ۱۸۸۴ء میں شائع ہوا اور یہ بھی سچ ہے کہ محمد سلطان عاقل دہلوی اسی زمانہ میں 'ہزار داستان' سے منسلک ہوئے لیکن اس سنہ میں یہ اخبار روزنامہ نہ ہو کر ہفت روزہ تھا جو دو برس کے بعد روزنامہ کی صورت میں شائع ہونے لگا۔ اس سلسلے میں نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں۔

''اس دور کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ روزانہ اخبار بھی شائع ہونے لگے اور یہ اخبار ''ہزار داستان'' ہے۔ پہلے ہفتہ وار شائع ہوتا تھا مگر ۱۸۸۵ء سے روزانہ شائع ہونے لگا۔ اس کے ایڈیٹر غالب کے شاگرد محمد سلطان عاقل تھے''۔ ۶

بعض محققین ''پیک آصفی'' کو حیدرآباد کا پہلا روزنامہ قرار دیتے ہیں جو یکم جنوری ۱۸۸۴ء میں جاری ہوا تھا۔ سنہ اشاعت کے پیش نظر ''پیک آصفی'' کو حیدرآباد کا پہلا روزنامہ قبول کیا جا سکتا ہے کیوں کہ یہ ''ہزار داستان'' کے روزنامہ قرار پانے کے ایک برس قبل بطور روزنامہ جاری کیا گیا تھا۔

انیسویں صدی کی آخری دہائی میں حیدرآباد سے شائع ہونے والے روزناموں میں ''پیک آصفی'' اور ''ہزار داستان'' کے علاوہ ''سفیر دکن'' ''مشیر دکن اور ''صحیفہ'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں جنھوں نے حیدرآباد کی اردو صحافت کو بلندی عطا کی اس سلسلے میں جناب اختر حسن جنھوں نے اپنے مضمون ''حیدرآباد کی اردو صحافت کے سو سال سیاسی اور سماجی آئینہ میں'' میں حیدرآباد کی اردو صحافت کی ایک صدی کو پانچ ادوار میں منقسم کیا ہے، لکھتے ہیں۔

''انیسویں صدی کے آخری سال یا بیسویں صدی کے آغاز سے حیدرآباد کی اردو صحافت کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے۔ مولوی امجد علی اشہری نے ۱۸۹۹ء میں روزنامہ ''سفیر دکن'' جاری کیا۔ اسی سال مشیر دکن بھی وجود میں آیا جو آج بھی جاری ہے۔ انیسویں صدی کے ابتدائی

Scanned with CamScanner

برسوں میں متعدد روزنامے نکلے جن کا لب ولہجہ اٹھارہویں صدی کے اخبارات وجرائد کے لب و لہجے سے مختلف تھا"۔ ۷

مذکورہ بالا روزناموں اور ہفتہ وار اخبارات کے علاوہ جن اخباروں نے اردو صحافت کی بنیادوں کو مستحکم کیا ان میں 'شوکت اسلام' مدیر حاجی فرقان ۱۸۸۴ء 'معلم شفیق' مدیر محب حسین ۱۸۸۴ء 'اخبار آصفی' مدیر محمد سلطان عاقل ۱۸۸۵ء 'دکن پنچ' مدیر کشن راؤ ۱۸۸۷ء 'خیال محبوب' مدیر عبدالسلام عرش ۱۸۸۷ء 'محبوب القلوب' مدیر عبدالسلام ۱۸۸۹ء 'ملک وملت' مدیر سید احمد ناطق ۱۸۹۵ء 'نظارۂ عالم' مدیر قدرت اللہ مضطر ۱۸۹۶ء 'جام جمشید' مدیر محمد ابراہیم ۱۹۰۱ء وغیرہ خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔

حیدرآباد کے اردو اخبارات کے تعمیری کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر طبیب انصاری لکھتے ہیں۔

"حیدرآباد کے اردو اخباروں کا کام صرف یہی نہیں تھا کہ جگہ جگہ کی مختلف قسم کی خبریں شائع کر کے عوام کی دلچسپی اور ان کے معلومات میں اضافہ کیا جائے بلکہ ان میں اصلاح حال کا شعور پیدا کیا جائے اور ان کے فکر ورائے کی صحیح سمت میں رہنمائی کی جائے تاکہ ملک وقوم کے مسائل حل کرنے میں رائے عامہ کی تعمیر وتشکیل میں مدد ملے۔ ان ہی اخباروں کی بدولت گھر گھر علم ودانش کے چراغ روشن ہوئے، شعر وادب کی محفلیں آراستہ کی گئیں اور جب ابتلا ومصائب کے طوفان آئے تو ڈگمگائے قدموں کے لئے نئی زمین ہموار کی گئیں۔ اس زمانے کے جرائد واخبار کہنے کو تو خبرنامے تھے لیکن خبروں کی فراہمی اور اشاعت کچھ اس طرح ہوتی کہ حکومت بھی چونک پڑتی۔ ۸

سرزمین دکن نے اردو زبان وادب کی ترقی وترویج کے سلسلے میں ہر دور میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ یہاں کی علمی وادبی، ثقافتی، سیاسی، مذہبی، معاشی ومعاشرتی سرگرمیوں کا ٹھیک ٹھیک اندازہ یہاں سے شائع شدہ اخبارات ورسائل سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ دکن کی

Scanned with CamScanner

صحافت نے ادب اور سماج کے مختلف شعبوں میں جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں وہ ناقابلِ فراموش ہیں۔

حوالے

۱۔ نصیرالدین ہاشمی ''دکن میں اردو'' ص ۵۴۱

۲۔ بدر شکیب ''اردو صحافت'' ص ۱۷۴

۳۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ''صحافت پاکستان و ہند میں'' ص ۷۵

۴۔ اختر حسن ''بحوالہ حیدرآباد کے اردو روزناموں کی ادبی خدمات'' ص ۳۸

۵۔ بدر شکیب ''اردو صحافت'' ص ۱۷۴

۶۔ نصیرالدین ہاشمی ''دکن میں اردو'' ص ۶۵۸

۷۔ اختر حسن ''حیدرآباد کی اردو صحافت کے سو سال سیاسی اور سماجی آئینہ میں'' مضمون مطبوعہ روزنامہ سیاست' مورخہ ۱۵/اگست ۱۹۵۹ء

۸۔ ڈاکٹر طبیب انصاری ''حیدرآباد میں اردو صحافت'' ص ۱۱

ڈاکٹر جوہی بیگم

59C/67C ساؤتھ ملاکا، الہ آباد

موبائل:9369130175

Scanned with CamScanner

انیسویں صدی میں ادب وصحافت ایک تعرف

ہندوستان میں اردو صحافت نے جہاں ایک طرف تحریر وتقریر کی آزادی کے لئے بلا خوف وخطر آواز بلند کی تو دوسری طرف وطن کو غلامی کی لعنت سے نجات دلانے کے لئے بھی محبان وطن کی خوابدیدہ ذہن کی حریت پسندی، حب الوطنی اور قومی یکجہتی کا جذبہ بیدار کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ مجاہدین آزادی اور انقلابی صحافیوں نے قیود وبند کی روح فرسا صعوبتوں کو انتہائی جرأت وہمت سے برداشت کیا اور کبھی اپنے پایۂ ثبات میں لغزش پیدا نہ ہونے دی اور پھر انہوں نے غیر ملکی اقتدار ہی کو مٹا کر رکھ دیا۔

انیسویں صدی، سیاسی اور تہذیبی اعتبار سے برعظیم کی تاریخ میں ایک موڑ کی حیثیت رکھتی ہے، نیا سیاسی واقتصادی ڈھانچہ، تہذب وتمدن کے لئے نئے مظاہرہ، نئی زبان، نیا نظام تعلیم، نئے ذرائع مواصلات، نئی سائنسی کرامات، اجتماعی زندگی میں مغربیت کا عمل دخل اور پھر اس سے پیدا ہونے والی کشمکش اور تصادم یہ سب اس صدی کا تحفہ ہیں۔

خوشی قسمتی سے اردو صحافت کا آغاز بھی اسی صدی کے اوائل کا واقعہ ہے، انیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستان میں چھاپے کے مشینری اور یتھوگرافی کی آمد سے شمالی ہند میں مطبوعہ اردو صحافت شروع ہوگئی اردو کا اول اخبار ''جام جہاں نما'' کو شائع کرنے کا شرف کلکتہ کو حاصل ہوا۔ یہ اخبار ۲۷/مارچ ۱۸۲۲ء کو ایڈیٹر عزت مآب منشی سدا سکھ مرزا پوری کے زیر سرپرستی تشہیر ہوا۔ منشی سدا سکھ مرزا پوری نے یہ اخبار شروع ہی سے انگریز پریسیڈنسی راجاؤں، مہاراجوں کے ساتھ ہی انگریزوں کی بھی وقتاً فوقتاً گرفت کرتے ہوئے انہیں انصاف کی برابر تلقین کرتا رہا۔ اس اخبار کے اگست ۱۸۲۲ء کے شمارہ میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے خلاف ایک سخت مضمون کی اشاعت پر چیف سکریٹری ولیم بی بیلی نے کلکتہ کونسل میں ۱۰/اکتوبر ۱۸۲۲ء کو پیش کردہ اپنی رپورٹ میں ''جام جہاں نما'' کی پالیسی اور لب ولہجہ کا ذکر کرتے ہوئے یہ شکایت کی کہ اس مضمون میں

Scanned with CamScanner

مہاراجہ کے بارے میں ایسے اقدام واحوال کا حوالہ دیا گیا ہے۔ جو یقیناً حکومت برطانیہ کے سراسر خلاف ہے اور مہاراجہ کی ناراضگی کا سبب بن سکتے ہیں اس اخبار نے صوبہ سرحد میں بالاکوٹ کے مقام پر سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کی انگریزوں کے خلاف معرکہ آرائی کے بارے میں برابر خبریں شائع کی تھیں۔ 'جام جہاں نما' کے ابتدائی سات شمارے صرف اردو میں شائع ہوئے جبکہ آٹھویں شمارے سے یہ اخبار کچھ زبان اردو اور کچھ زبان فارسی میں شائع ہونے لگا۔ لیکن ۱۹ر جون ۱۸۲۲ء تک چھ مشترکہ شماروں کی اشاعت کے بعد اردو ''جام جہاں نما'' کو بند کر دیا گیا۔ البتہ ایک سال بعد ''یورپین تاجروں'' اور ''علم دوست'' حضرات کے لئے ۱۸ر جون ۱۸۲۳ء اردو جام جہاں نما کو دوبارہ جاری کیا گیا۔ جو ۲۳ جنوری ۱۸۲۸ء کو ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔ یہ واضح ہو کہ چند اسباب کی بنیاد پر مذکورہ اخبار کو اردو کا سب سے پہلا اخبار تسلیم نہیں کیا جاتا ہے۔ ان میں بنیادی وجہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شائع ہونا ہے۔ چنانچہ تسلیم یہ کیا جاتا ہے کہ سب سے پہلا خالص اردو کا اخبار ''اخبار دہلی'' تھا۔

اخبار دہلی ۱۸۳۷ء میں شائع ہوا تھا۔ جس کے ایڈیٹر مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولانا محمد باقر تھے۔ اسی اخبار کی بنیادی خصوصیت تعلیم کی زبردست حمایت تھی۔ معاشرتی و بے لاگ سیاسی خبروں کے علاوہ غالب، مومن، ذوق اور بہادر شاہ ظفر کے کلام کی اشاعت ہوتی اور کبھی کبھی زبان ومحاورات کی بحث بھی چھڑ جاتی تھی۔ یہ اخبار ابتدائی ۲۰ برسوں تک اگرچہ اعتدال پسند رہا لیکن مولوی محمد باقر نے انقلاب ۱۸۵۷ء کو رونما ہونے کے فوراً بعد اپنے اخبار کی ۱۷ر مئی ۱۸۵۷ء کے شمارہ میں میرٹھ چھاؤنی میں دیسی فوجیوں کی بغاوت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''اسی اثنا میں سنا گیا کہ ترک سوار میرٹھ چھاونی سے
> دہلی پہنچ کر اب زیر قلعہ مبارک پیش جھروکہ جمع ہوئے ہیں
> اور تھوڑی دیر میں سنا کہ قلعہ دار و بڑے صاحب وڈاکٹر ولیم
> لوگ وغیرہ دروازہ میں مارے گئے اور سوار قلعہ میں چلے

Scanned with CamScanner

آئے حضور اقدس بھی دستار مبارک زیب سر اور شمشیر ولایتی
زیب کمر فرما کر تشریف فرمائے، دربار ہوئے شہر میں اول
چند سوار آئے اور دریا گنج کے انگریزوں کو مارتے ہوئے دو
بنگلہ جلاتے ہوئے پیش اسپتال زیر قلعہ آئے اور چمن لعل
ڈاکٹر کو بیت دارالشفائے اصلی میں پہنچا دیا اور شہر میں غل
ہو گیا کہ فلاں فلاں انگریز وہاں مارا گیا اور فلاں فلاں
انگریز وہاں پڑا ہے"

انقلاب کی ناکامی کے بعد مولوی محمد باقر کو "دہلی کالج" کے انگریزی پرنسپل مسٹر ٹیلر کے دوران انقلاب اپنے گھر اور امام باڑے میں پہلے پناہ دینے اور پھر انقلابیوں کا دباؤں بڑھنے پر اسے گھر سے نکال دینے پر اس کے قتل ہو جانے کے الزام میں ستمبر ۱۸۵۷ء میں ایک انگریز حاکم نے انہیں گولی مار کر شہید کر دیا۔ اس کے علاوہ مولانا محمد حسین آزاد کے نام گرفتاری کا وارنٹ بھی جاری ہوا۔ اور یہ اعلان ہوا کہ جو اسے گرفتار کرائے گا اسے پانچ سو روپے کا انعام ملے گا۔

اس کے بعد ۱۸۳۷ء ہی میں سرسید احمد خان کے بڑے بھائی سید محمد نے دہلی ہی سے "سید الاخبار" جاری کیا اس اخبار سے بقول سرسید عبدلقادر سرسید کی اخبار نویسی کی بنیاد مستحکم ہوئی مولانا الطاف حسین حالی کے بموجب اس اخبار کے بیشتر مضامین سرسید خود لکھا کرتے تھے جس سے ان کی اخبار نویسی سے دلچسپی دن بدن بڑھتی گئی سرسید نے اس کے بعد خود اپنا اخبار ۳۰ مارچ ۱۸۶۶ء کو "سائنٹفک سوسائٹی دی علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" کے نام سے جاری کیا۔

اس اخبار میں سرسید اور ان کے رفقا کے اعلیٰ معیار کے شعری ادبی اور علمی مضامین کے اشاعت کے سبب اسے زبردست مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس سلسلے میں مولانا الطاف حسین حالی نے اپنی تصنیف حیات جاوید میں لکھا ہے۔ اس اخبار کی آواز ہمارے عام دیسی اخباروں کی طرح کوئی معمولی آواز نہ تھی۔ بلکہ جن معاملات میں وہ بحث کرتا تھا اور دخل دیتا تھا اور ہمیشہ اس کی آواز

Scanned with CamScanner

پر کان لگائے جاتے تھے اس کے علاوہ سرسید ۱۸۷۰ء میں انگلستان سے واپس آئے تب انہوں نے ۲۴ر دسمبر ۱۸۷۰ء کو ایک انتہائی بلند پایہ علمی و ادبی رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا جس کے پہلے شمارہ میں سیر سید نے 'تہذیب الاخلاق' کی اشاعت کا مقصد یہ بتایا کہ ''مسلمان ہند کو کامل درجہ کی تہذیب اختیار کرنے پر راغ کیا جائے گا تا کہ ان کا شمار دنیا کی معزز اور مہذب قوموں میں ہو''

مولانا الطاف حسین حالی نے خود ایک سہ ماہی رسالہ ''خادم الطلباء'' یکم جنوری ۱۸۸۷ء کو جاری کیا تھا جس کے ایڈیٹر ذکا اللہ خان تھے۔ اس کے بعد مولوی کریم الدین نے ۱۸۴۴ء میں کریم الاخبار اور ۱۸۴۵ء میں ہندوستان کا سب سے پہلا شعری گلدستہ ''گل رعنا'' شائع کیا۔

اسی سلسلہ میں مولوی عبدالرزاق رقم طراز ہیں کہ ''مولوی عبدالکریم نے اپنے کمان پر ایک مشاعرہ کا اعلان کیا تھا۔ ہر مہینے یا دو ہفتے بعد مشاعرہ منعقد ہوتا تھا۔ اور ان ہی مشاعروں کا کلام ''گل رعنا'' میں چھپتا تھا۔

دہلی کالج کے ماسٹر رام چندر نے ۱۸۴۵ء میں دہلی سے ''فوائد الناظرین'' کے اشاعت کے بعد نومبر ۱۸۴۷ء میں خالص ادبی جریدہ ''محبت ہند'' بھی دہلی سے جاری کیا جس کے ایک شمارہ میں قدیم ''مشاعرہ کی ایک قلمی تصویر بھی شائع ہوتی تھی۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اپنے تحقیقی مقالہ میں ماسٹر رام چندر کی شعری و ادبی خدمات بالخصوص خطوط کے بارے میں ان کے مضمون سے تحریر حاصل کر کے غالب کے خطوط نویسی کی جانب متوجہ ہونے سے متعلق حقائق پر نہ صرف روشنی ڈالی ہے بلکہ اپنی تحقیق کی تائید میں ممتاز و مصروف ادیب و محقق پنڈت کیفی کے ایک مضمون کا یہ اقتباس بھی درج کیا ہے۔

غالب نے اپنا پہلا اردو خط ۱۸۵۲ء میں لکھا ہوگا اس سے قبل رام چندر کا خطوط کے بارے میں مضمون ''محبت وطن'' دسمبر ۱۸۴۵ء اور جنوری ۱۸۵۰ء کے شمارہ میں شائع ہو چکا تھا۔ اس

Scanned with CamScanner

لئے فن غالب یہ ہے کہ ماسٹر رام چندر کا یہ مضمون مرزا غالب کی نظر سے ضرور گزرا ہوگا اور ان کے طبع وقار نے ضرور اثر لیا ہوگا۔

لکھنو سے ۱۸۴۷ء یا اس سے قبل ''لکھنؤ اخبار'' جاری ہوا تھا لیکن اس اخبار کا کوئی شمارہ اب تک دستیاب نہ ہو سکا البتہ آگرہ سے ۱۸۴۸ء میں ایک شعری گلدستہ ''معیار الشعراء'' جاری ہوا جس کے اجراء سے متعلق اشتہار 'فوائد الناظرین' دہلی نے نومبر ۱۹۴۸ء کے شمارہ میں شائع کیا تھا۔ وارانسی سے ۱۸۴۷ء میں بنارس اخبار کے بعد ۱۸۴۸ء میں بنارس گزٹ بھی جاری ہوا۔ مشہور صحافی منشی ہرسکھ رائے نے ۱۸۵۰ء میں لاہور سے ایک اہم اخبار ''کوہ نور'' جاری کیا جس سے منشی نول کشور بھی وابستہ رہے لکھنو سے ایک حریت پسند اخبار ''طلسم لکھنؤ'' ۲۵ جولائی ۱۸۵۶ء کو مفتی محمد یعقوب فرنگی محلی کی ادارت میں لکھنو سے 'سحر السامری' جاری ہوا۔

۲۶ نومبر ۱۸۵۸ء کو منشی نول کشور نے ''اودھ اخبار'' کی اشاعت شروع کی یہ اخبار شروع میں ہفت روزہ تھا لیکن اس کی شہرت اور مقبولیت میں جب روز بروز اضافہ ہوتا گیا تو اسے ۱۸۷۱ء میں پہلے سہ روزہ اور ۱۸۷۴ء میں روزنامہ کر دیا گیا اس اخبار کی مجلس ادارت میں اس عہد کے مشہور ادباء اور دانشور شامل تھے۔

منشی سراج الدین احمد خان کی ادارت میں الہ آباد سے جنوری ۱۸۷۷ء میں ''قیصر الاخبار الہند'' جاری ہوا۔ جو آزادیٔ ہند کو اپنا بنیادی حق سمجھتے ہوئے حصول آزادی کے لئے بر سر پیکار رہا اور انگریز حکمرانوں پر کبھی کبھی طنزیہ انداز میں تبصرہ بھی کر دیتا تھا۔ محمد کبیر الدین نے الہ آباد سے ۶ جنوری ۱۸۷۸ء کو ایک معیاری ہفتہ وار ''احسن الاخبار'' جاری کیا۔

حضرت ریاض خیر آبادی نے خیر آباد سے ''ریاض الاخبار'' جاری کیا جس میں شعرا کے کلام کے علاوہ علمی و ادبی و سیاسی و فلاحی مضامین برابر شائع ہوتے رہتے تھے۔ انہوں نے اس اخبار کو بعد میں لکھنو سے نکالنا شروع کیا اس اخبار کے علاوہ انہوں نے تار برقی، ماہ نامہ گلکدۂ ریاض ۱۸۷۹ء کے بعد ۸ جولائی ۱۸۸۲ء کو گورکھپور سے ماہنامہ ''فتنہ اور ''عطر فتنہ'' جاری کر کے

Scanned with CamScanner

فضائے ادب کو معطر کر دیا۔

ہندوستان میں انقلاب کے بعد جس اخبار نے محبان وطن کے دل و دماغ میں انقلاب برپا کیا اس کا نام 'اودھ پنچ' ہے۔ منشی سجاد حسین کاکوری کی ادارت میں یہ ظریف اور انقلابی اخبار لکھنو سے ۱۶ جنوری ۱۸۷۷ء کو ظہور پزیر ہوا۔

مشہور بے باک صحافی مولوی بشیر الدین احمد کی ادارت میں اٹاوہ سے ۱۸۸۲ء میں ایک اہم اخبار 'نجم الاخبار' جاری ہوا۔ گوجرانوالہ سے ۱۸۸۷ء میں منشی محبوب عالم کی ادارت میں ہفتہ وار ''پیسہ'' اخبار جاری ہوا۔ جس نے غیر ملکی کپڑوں اور دیگر اشیا کے استعمال پر سخت الفاظ میں مخالفت کرتے ہوئے اہل وطن میں بیداری پیدا کرنے کی غرض سے لکھا۔

> ''انگریز کپڑے کو نہ استعمال میں لائیں نہ خریدیں نہ اس کی تجارت کریں، ہندوستانیوں کے حقوق کی فروگزاشت کا ہر نیا معاملہ اہل ہندوستان کو اتنا فائدہ دیتا ہے کہ ان میں ایک تبادل پیدا کر دیتا ہے جس سے انہیں یقین ہو جاتا ہے کہ بغیر ''ایجی ٹیشن'' کے کچھ نہیں ملے گا''

۱۸۸۷ء کو لکھنو سے مشہور معروف ماہنامہ 'دلگداز'' جاری ہوا جس کے مدیر و مالک مولانا عبدالحلیم شرر تھے۔ یہ وہ ماہنامہ تھا جسے مولانا شرر نے خود اپنے لئے ہی مخصوص رکھا اور اس میں صرف اپنے تحریر کردہ مضامین اور متعدد ناولیں قسطوں میں شائع کیں۔ مولانا شرر ''دلگداز'' کے علاوہ ماہنامہ پنچ سخن، محشر، مورخ اور ہفتہ وار مہذب بھی جاری کئے۔

حسن بن عبداللہ عماد نواز جگن کی ادارت میں اگست ۱۸۸۵ء میں ماہنامہ ''حسن'' جاری ہوا۔ اس کی خوبی یہ تھی کہ اس میں شائع ہونے والے معیار مضامین پر ہر مضمون نگار کو ایک اشرفی تفویض کی جاتی تھی۔ لکھنؤ سے ۱۸۸۹ء میں ''انتخاب کی اشاعت کے بعد شعری گلدستہ،، گل چیں، جاری ہوا۔ جس میں اس زمانہ کے نامور شعراء کا کلام شائع ہوتا رہتا تھا۔ گورکھپور سے

Scanned with CamScanner

۱۸۹۲ء میں 'الوقت' کے بعد علی گڑھ سے ماہنامہ ''محمڈن انگلو اورینٹل کالج میگزین'' شائع ہوا جس کے مدیر مولانا محمد شبلی نعمانی تھے۔ لکھنؤ سے ۱۸۹۴ء میں مرزا عبدالتقی قزلباش کی ادارت میں ماہنامہ 'روشنی' جاری ہوا۔ جس نے نو واردان شعر و ادب کی بھرپور رہنمائی کی۔ امرتسر سے ۱۸۸۵ء میں ادبی و علمی ہفت روزہ اخبار 'وکیل' جاری ہوا جس کے مدیر مرزا حیرت تھے۔ اس اخبار کے مدیروں میں مرزا جالب، مولانا انشاء اللہ خان، فیروز الدین فیروز کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد بھی شامل رہے۔ اس اخبار میں مولانا آزاد کو ہر قسم کی مضمون نگاری کا موقع ملا۔

مدھیہ پردیش سے جاری ہونے والا سب سے پہلا اخبار ''عمدۃ الاخبار'' ۱۸۷۱ء میں بھوپال سے جاری ہوا۔ جس کے مدیر حکیم اصغر حسین افکر فرخ آبادی تھے یہ اخبار چند سال تک بڑی شان و شوکت سے نکلتا رہا۔ لکھنو سے ۱۸۹۶ء میں نوبت رائے نظر کی ادارت میں ایک ادبی جریدہ ''خدنگ نظر'' شائع ہوا۔ اس رسالہ میں لکھنؤ کے مشہور و معروف شاعر عزیز، صفی، ثاقب، محشر، چکبست، بش نرائن، دردو غیرہ کا کلام برابر شائع ہوتا رہتا تھا۔ اس رسالہ کا ہر شمارہ تین حصوں میں منقسم رہتا تھا۔ پہلا نظموں، دوسرا غزلوں، اور تیسرا ناول نگاروں رینالڈ کے ایک ناول کے اردو ترجمے پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس رسالہ کے نثری حصہ کی ادارت سے مولانا آزاد بھی وابستہ رہے، اکبر علی اکبر آبادی کی ادارت میں جنوری ۱۸۹۹ء میں فیروز آباد سے ایک رسالہ 'ادیب' جاری ہوا۔ جس میں زیادہ تر ادبی و شعری تخلیقات ہی شائع ہوتی تھیں۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انیسویں صدی میں شائع لاتعداد اخبارات و جرائد نے شعر و ادب اور صحافت کے ساتھ ہی تحریک آزادی میں عزم مصمم اور بے پایاں حوصلہ کے ساتھ ایسا سرگرم حصہ لیا کہ وہ تاریخ صحافت میں سنہرے حروف میں ہمیشہ درخشاں رہے گا۔

ماخذ و مصادر

۱۔ کاروان صحافت: ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

Scanned with CamScanner

۲۔اردو صحافت انیسویں صدی میں: ڈاکٹر طاہر مسعود
۳۔ہندوستانی اخبار نویسی: (کمپنی کے عہد میں) محمد عتیق صدیقی
۴۔ Calcutta Jaurnal Calcutta, May 8/1822
۵۔The Indian Press Margarita Barns (1940)
۶۔اردو صحافت: انور علی دہلی۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد شاہد خان

Scanned with CamScanner

انیسویں صدی کے صحافتی سفر پر ایک نظر

صحافت کا نام سنتے ہی لفظ اخبار ذہن میں دستک دینے لگتا ہے۔ صحافت عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی اخبار نویسی کے ہیں، اخبار خبروں کی جمع کو کہتے ہیں۔ صحافت ہر لمحہ پیش آنے والے واقعات کی عکاسی پھر ان کے پس منظر سے ابھرنے والے نظریات کی ترویج واشاعت کا نام ہے۔ بقول عبدالسلام خورشید:

> ''صحافت ایک عظیم مشن ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو تازہ ترین خبروں سے آگاہ کیا جائے۔ عصر حاضر کے واقعات کی تشریح کی جائے تا کہ رائے عامہ کی ترجمانی بھی ہوتی رہے اور رائے عامہ کی رہنمائی کے فرائض بھی سرانجام دیتی رہے۔ عوام کی خدمت اس کا مقدس فرض ہے۔ اس لئے صحافت معاشرے کے ایک اہم ادارہ کی حیثیت رکھتی ہے۔''

اردو صحافت نے انیسویں صدی میں آنکھیں کھولی اور نشو نما پائی۔ اس کی ہیئت، مزاج، زبان واسلوب اس دور میں منتقل ہوئے۔ اردو صحافت کو ہم اسکے تدریجی ارتقاء کے مطالعہ وتجزیہ کے اعتبار سے دو ادوار میں منقسم کر سکتے ہیں۔ دور اول جو ۱۸۲۲ء سے ۱۸۵۷ء پر مشتمل ہے، دور دوم ۱۸۵۷ء سے ۱۹۰۰ء پر محیط ہے۔ اردو صحافت نے بھی کئی نشیب وفراز دیکھے ہیں۔ ۱۸۵۷ کا غدر، ہندوستانیوں پر انگریزوں کا جور و استبداد، مغلیہ سلطنت کا زوال غرض کہ لسانی، معاشرتی، تہذیبی تبدیلی کے واقعات کی چشم دید گواہ رہی ہے۔ اردو صحافت کی تاریخ انتہائی پرانی ہے۔ اس کی شروعات چھاپہ خانہ کے رواج سے ہوئی۔ اس دوران اس نے روشن اور تابناک منزلیں طے کیں۔ اردو اخبار نویسی کا آغاز اردو کے تہذیبی مراکز سے دور کولکاتا میں ہوا۔ جس کی وجہ شمالی ہند کی نثر میں وہ توانائی نہیں پیدا ہوئی تھی کہ اخبار نویسی کے تقاضوں کو پورا کر سکے، ساتھ ہی فارسی زبان جو کہ

Scanned with CamScanner

سرکاری و علمی زبان تھی اس کے آگے اردو کو احساس کمتری کا شکار ہونا بھی تھا، ایک اور سب سے اہم وجہ پریس ایکٹ کا وجود میں آنا جس کے تحت اخبار کے اجرا کے لئے لائیسنس کا حصول ضروری تھا اور حکومت اس کو کسی بھی وقت ضبط کر سکتی تھی۔ ویسے تو اردو صحافت کی ابتدا ۱۸۲۲ سے ہوئی لیکن اس کی راہیں ۱۸۳۰ سے ہموار ہونا شروع ہوئی۔

اردو صحافت کے میدان میں بلا تفریق ہندو مسلمان دونوں نے کافی طبع آزمائی کی اور اس فروغ میں یکساں حصہ لیا۔ آزادی سے قبل اردو ملک کے ہر گوشہ گوشہ میں تھی۔ ہر طبقہ اپنے خیالات و نظریات کی تبلیغ و اشاعت کے لئے اردو کا انتخاب کیا، جس کی وجہ سے اردو صحافت کو منفرد مقام اور ملک گیر حیثیت حاصل ہوئی۔ اگر یہ کہا جائے کہ اردو صحافت نہ ہوتی تو ہندوستان کو آزادی کا سورج دیکھنا نصیب نہ ہوتا غلط نہ ہوگا۔ آزادی اور جذبۂ انقلاب کو بیدار کرنے میں سب سے اہم رول اردو صحافت کا رہا ہے۔

اردو کا پہلا اخبار 'جام جہاں نما' ہے جو کہ ہفتہ وار تھا اور ۲۷ مارچ ۱۸۲۲ء میں کولکاتا سے شائع ہوا۔ اس کے بانی ہری ہردت رائے اور ایڈیٹر لالہ سدا سکھ لال تھے پھر بھی ہم اسکو اردو کا پہلا اخبار تسلیم نہیں کر سکتے کیونکہ یہ کبھی اردو، کبھی فارسی اور کبھی دونوں زبانوں میں نکلتا تھا۔ سب سے پہلا خالص اردو اخبار 'دہلی اردو اخبار' جس کے بانی مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے دہلی سے جاری کیا تھا۔

اس اخبار نے ۱۸۵۷ء کی آزادی میں اہم کردار نبھایا۔ مولوی محمد باقر کا سیاسی شعور کافی پختہ تھا یہ اخبار اس عہد کے سیاسی داؤ پیچ کی عکاسی، خبروں کے ساتھ ساتھ فکر انگیز اور حوصلہ افزا نظمیں چھاپ کر آزادی کے پروانوں کو جوش سے بھر دیتا تھا۔ ادبی صحافت کو بھی فروغ دیا جاتا تھا جس میں اس عصر کے شعرا کی تخلیقات بھی شائع ہوتیں۔ اس اخبار کا ایک اور اہم مقصد عصر حاضر کے مسائل جن سے عوام الناس دوچار تھے روشناس کرانا اور اس کے علاوہ لوگوں کے میعار اور کردار کو بلند کرنا تھا۔ مولوی محمد باقر نے صحافت کی اعلیٰ قدریں قائم کرتے ہوئے بڑی بے باکی

Scanned with CamScanner

سے بدعنوانیوں اور برائیوں کا پردہ فاش کیا۔ لیکن افسوس ان کو اس حق گوئی، حق پرستی اور حب الوطنی کی قیمت جان دیکر چکانی پڑی اور ان کو توپ سے اڑا دیا گیا۔ یہ افتخار بھی اردو صحافت کو ہی ملا کہ صحافت کا پہلا شہید ایک اردو صحافی ہے۔ ۱۸۵۷ء سے قبل بہت سارے اخبارات ہندوستان میں شائع ہونے لگے تھے۔ مرزا پور، اتر پردیش سے 'خیر خواہ ہند' شائع ہوا لیکن اس کا مقصد عیسائیت کو فروغ دینا تھا کیونکہ یہ ایک پادری کا شائع کردہ مذہبی اخبار تھا۔ پنڈت دھرم نرائن بھاسکر نے 'قرآن السعدین' نام سے ہفتہ وار دلی کالج سے شائع کیا، جو کہ اہم اخبار تھا۔ علم وادب کا گہوارہ لکھنؤ سے بھی پہلا اخبار ۱۸۴۷ء میں 'لکھنؤ اخبار' اور میرٹھ سے 'جام جمشید' اور بنارس سے 'سدھا کر' دو ماہنامہ رسالے مرات العلوم اور 'باغ و بہار' کا ذکر ملتا ہے۔

صحافت کی راہیں آسان نہ تھیں یہ بڑی کڑی آزمائشوں سے گزری ہے۔ پیشاور میں 'مرتضائی' کے ایڈیٹر کو باغیانہ مضامین لکھنے کے جرم میں قید کر دیا گیا، ملتان کے 'دیسی' اخبار کی اشاعت بھی روک دی گئی، 'چشمہ فیض' کے ایڈیٹر منشی دیوان چند کو سیالکوٹ سے لاہور منتقل کرنے کا حکم دیا اور کڑا سنسر لگا دیا گیا۔ دہلی کے سب سے قابل ذکر اخبار کے ایڈیٹر جمیل الدین کو تین سال کی قید کی سزا سنائی گئی۔ مولانا حسین آزاد کی گرفتاری کا وارنٹ جاری ہوا اور وہ کچھ وقت کے لئے روپوش ہو گئے۔ اخبارات پر جنگ آزادی کے پیش نظر لارڈ کیننگ نے قانون مطابع نافذ کر دیا تھا اور اخبارات کو ان کا پابند ہونا پڑا، جن اخبارات نے ان پابندیوں کو قبول نہ کیا، وہ بند ہو گئے۔ ان سب باتوں نے چھ سات سالوں کے لئے اردو صحافت کو منجمد کر دیا۔ جب امن وامان قائم ہوا تب کہیں جا کر اردو صحافت کے مردہ قالب میں جان آئی۔ صحافت کا دوسرا دور جو کہ بیالیس سالوں پر مشتمل ہے، کو ہم ارتقائی دور شمار کرتے ہیں اس اخبارات نے اپنا رویہ میں بدلاؤ کیا، سیاسی مسائل پر بحث کرنے میں احتیاط سے کام لیا۔ عوام الناس کے مسائل پر غور و فکر کے ساتھ ساتھ حکومت سے وفاداری کا بھی پاس رکھا، نئے رجحانات کو وسعت ملی چونکہ مغربی تعلیم اور مغربی تہذیب ملک میں دستک دے چکے تھے، لوگوں کے اندر سائنسی معلومات اور تاریخی مسائل

Scanned with CamScanner

سرسید احمد خاں، مولانا ابوالکلام آزاد، حسرت موہانی، مولانا محمد علی جوہر، راشد الخیری، عبدالحمید سالک اور منشی نول کشور وغیرہ ایسے ہی نام ہیں جنہوں نے اردو صحافت کی گرانقدر خدمات انجام دیں، لیکن سرسید اور نول کشور کو چھوڑ دیں تو باقی سب کا اہم رول بیسویں صدی کی صحافت میں ہے۔

سرسید کو صحافت کا امام قرار دیا جاتا ہے۔ ان کی تعلیمی تحریکات نے جس میں سائینٹفک سوسایٹی میگزین ''تہذیب الاخلاق'' اور اردو اخبار نے اخبار پڑھنے والوں کے ذوق میں ایک بڑا بدلاؤ کیا۔ سیاست، تاریخ، تعلیم، زبان اور زبان و تہذیب کے مسائل پر اخبارات میں بحث ہونے لگی جب کہ اس سے پہلے اخبار بینی کو لیکر کوئی ذوق نہ تھا، تعلیم کی کمی تو دوسری بات جو پڑھا لکھا طبقہ تھا اس کو بھی اخبارات سے کوئی دلچسپی نہ تھی کیونکہ ان کو ملک کے سیاسی اور سماجی معاملات سے کوئی رغبت نہ تھی۔ ان کے لئے اخبار ایک بیکار کی چیز تھی۔

مسلم قوم کی زبوں حالی پر سرسید کا دل خون کے آنسو روتا تھا، لہٰذا انہوں نے مسلمانوں کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لئے صحافت کو چنا۔ اپنے سائنٹفک گزٹ میں اردو اور انگریزی میں ایسے مضامین چھاپتے تا کہ بیک وقت مسلمان اور انگریز ان مسائل سے آگاہ ہوسکیں جو اس وقت درپیش تھے۔ رسالہ 'تہذیب الاخلاق' اس لئے شائع کیا تا کہ مسلمانوں میں جدید تعلیم کا رجحان قائم ہو، دنیا میں ہو رہے بدلاؤ سے واقفیت ہو، اور ساتھ ہی ساتھ تعلیم کے لئے رغبت پیدا کرنا تھا۔ یہ سرسید ہی کی کوششیں تھیں جن سے اردو صحافت دوبارہ ترقی کی راہ پر دوڑنے لگی، ساتھ ہی ایک بڑا احسان سرسید کا مسلم قوم پر یہ کہ آپ نے اخبارات کے ذریعہ بے قصور مسلمانوں کو سزا سے بچایا اور ان کی طرف سے جو بدگمانیاں انگریزوں کو تھیں دور کیا۔

اس دور کی صحافت میں منشی نول کشور کا نام قابل ذکر ہے۔ اردو، عربی اور فارسی کتابوں کی طباعت میں بیش بہا خدمات انجام دیں۔ انہوں نے ۱۸۵۸ء میں لکھنؤ سے 'اودھ اخبار' جاری کیا، پہلے یہ ہفتہ وار، پھر سہ روزہ، پھر روزنامہ ہوگیا۔ یہ اردو کا پہلا بڑا اور مایہ ناز

Scanned with CamScanner

اخبار تھا۔ یہ پہلا اخبار تھا جس کے رپورٹر تمام صوبوں میں مامور تھے۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر، شوکت تھانوی جیسی ہستیاں اس اخبار سے جڑی تھیں۔

بالآخر ہم کہہ سکتے ہیں کے صحافت ایک سماجی قوت ہے اور اخبار ایک سماجی ادارہ، سماج کو آئینہ دکھانے کا کام صحافت کا ہے۔ عوام میں سماجی اور سیاسی بیداری شعور پیدا کرنا، صحت مند ذہن اور نیک رجحانات کو پروان چڑھانا، صالح معاشرے کی تشکیل، حریت اور آزادی کے جذبہ کو فروغ دینا، الفت و محبت کا پیغام پھیلانا، ہمدردی، رواداری کو قائم کرنا صحافت کا کام ہے ساتھ ہی ساتھ قارئین کو بہترین تفریح مہیا کرانا ہے جن سے ان کی ذہنی تربیت ہو۔ صحافت کی قوت عوام کی قوت ہے۔ اگر اردو صحافت ماضی کی راہ اختیار کرتی ہے تو اس کا حال اور مستقبل دونوں روشن ہوگا۔

☆☆☆

ڈاکٹر زینت رضا
گیسٹ لکچرر
شعبۂ عربی و فارسی
الہ آباد یونیورسٹی

Scanned with CamScanner

انیسویں صدی کی صحافت میں 'تاریخ بغاوت ہند' کا حصہ

انیسویں صدی میں اردو صحافت کی تاریخ میں رسالہ 'تاریخ بغاوت ہند' بہت اہمیت کا حامل ہے جو مطبع مفید خلائق میں چھپتا تھا۔ پہلے یہ رسالہ منشی شیونرائن آرام کی زیرادارت نکلتا تھا۔ منشی شیونرائن ۱۸۱۴ء میں پیدا ہوئے، اردو و فارسی کے علاوہ انگریزی بھی جانتے تھے انھوں نے انگریزی مشہور لغت نویس ڈاکٹر فیلن سے پڑھی۔ دہلی کالج میں بھی آپ نے تعلیم پائی اور دہلی کالج میں غدر سے قبل پروفیسر بھی رہے۔ ۱۸۵۶ء میں مفید خلائق پریس جاری کیا تھا، اور نومبر ۱۸۵۶ء میں 'مفید خلائق' نکالا تھا۔ ۱

یہ ہی وہ شیونرائن ہیں جنھوں نے حضرت غالبؔ سے ان کے دیوان چھاپنے کی خواہش کی اس کے باوجود کہ مرزا غالبؔ نے ضیاء الدین کے اقرار پر ان کو دیوان رام پور سے منگوا کر چھاپنے کے لئے دے دیا تھا۔ منشی جی کے مفید خلائق پریس میں مرزا غالبؔ کی تصنیف دستنبو چھپی اور ان ہی کے ہاتھوں فروخت ہوئی۔ ۲

منشی جی میونسپل بورڈ آگرہ کے سیکریٹری تھے اور حکومت برطانیہ کی طرف سے ان کو رائے بہادری کا خطاب ملا تھا۔ آپ اردو اور ہندی کے بہترین ادیب تھے۔ ۳ منشی شیونرائن کو رفاہِ عام کے کاموں میں بھی دلچسپی تھی۔ وہ بہترین نقشہ نویس اور فوٹوگرافر بھی تھے، زائچہ بنانے کے فن میں بھی وہ ماہر تھے۔ ۴

رسالہ 'بغاوت ہند' ۱۸۶۱ء میں مفید خلائق پریس آگرہ سے نکلنا شروع ہوا، اب اس کے مدیر سرجن مکند لال تھے۔ ۵ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے واقعات ہفتہ وار اس رسالہ میں چھپتے تھے۔ حالانکہ یہ رسالہ انگریز نواز رسالہ تھا لیکن اس میں جو واقعات اور حالات تاریخ، دن، میدان جنگ کے نقشے اور انگریز افسران کی تصاویر وغیرہ بہت کم کتب میں ملتی ہیں یا ملتی ہی نہیں۔ غور طلب بات ہے کہ اس میں دشمن لفظ کا استعمال باغیوں کے لئے کیا گیا ہے۔ کچھ ایسے واقعات

Scanned with CamScanner

ہیں جنھیں تاریخی کتب میں معلومات حاصل نہ ہونے کی وجہ سے اہمیت نہ دی گئی وہ سب اس رسالہ میں موجود ہے جیسے 'جنگ پٹھٹ' جس پر سرسری طور سے لکھا گیا ہے اس کا مفصل بیان اس رسالہ میں ہے۔ اس رسالہ کے خریداروں کی فہرست مع رقم اور رسید زر واصلات بھی آخری صفحے پر ہوتی تھی۔

۱۸۵۷ء کے واقعات کے متعلق معلومات انھوں نے بعض انگریزی کتب سے حاصل کی جس کتابوں سے انھوں نے استفادہ کیا اس کے بارے میں جانکاری انھوں نے دسمبر ۱۸۵۹ء کے شمارے میں دی۔ کچھ علاقوں کے متعلق معلومات انھوں نے مختلف لوگوں سے فراہم کر کے رسالہ میں شائع کیں۔ فرخ آباد کے بارے میں خبریں انھیں مولوی اصغر حسین نے تحریر کر کے بھیجی تھیں، جن کا شکریہ انھوں نے دسمبر ۱۸۵۹ء کے شمارے میں ادا کیا۔ اور یہ اشتہار بھی دیا کہ جن لوگوں نے ۱۸۵۷ء کے واقعات کا مشاہدہ کیا ہے، وہ اس کی تفصیل انھیں لکھ کر بھیج دی تا کہ وہ شکریہ کے ساتھ اسے اپنے رسالہ میں شائع کریں۔ ملاحظہ ہو دسمبر ۱۸۵۹ء کے شمارے میں شائع اشتہار کا یہ اقتباس:

> ''وہ بعض ہمارے عنایت فرما جنھوں نے خاص خاص جگہوں کا احوال بغاوت قلم بند فرمایا ہے ہمیں لکھا ہے کہ ان کا تالیف کیا ہوا احوال درج رسالہ بغاوت ہند ہو جاوے ہم عموماً اپنے محبوب کی خدمات بابرکات میں التماس رکھتے ہیں کہ جن صاحب نے کسی خاص جگہ کا دقایع سرکشی خصوصاً اس زمانہ کا صحیح اور چشم دیدہ احوال جب کہ اس جگہ کوئی باغی حکمراں تھا لکھا ہو تو وہ بلا شک ہمارے پاس بھیج دیں موقع پر بمشکوری تمام درج ہوگا جناب مولوی اصغر حسین صاحب ڈپٹی انسپکٹر فرخ آباد نے جو وقایع فرخ آباد لطف فرما ہے۔ ہمارے پاس پہنچا اور بہت مشکور اور ممنون فرمایا۔'' [۶]

چربی لگے کارتوسوں اور ملاوٹی آٹا بھجوانے کی خبر سے بغاوت کے شعلے بلند ہوئے تھے،

جیسا کہ 'بغاوت ہند' میں تحریر اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے:

''دوسری تاریخ جون کو چند چھکڑے بھرے ہوئے آٹے کے جو کوتوال شہر نے دسویں پلٹن اودھ کے واسطے بھیجے تھے آئے تو ان لوگوں نے ان کے لینے سے اس وجہ سے انکار کیا کہ اس آٹے میں ملاوٹ ہے جس سے ان کی ذات جاتی رہے گی اور انھوں نے بضد کہا کہ اس تمام آٹے کو دریا میں پھینکوا دو چنانچہ ویسا ہی کیا گیا۔'' ۷

''اس جگہ نویں اور دسویں اودھ کی بے آئین پلٹن اور اکتالیسویں پیادگان بنگال معین تھیں۔ ۲۷ تاریخ مئی ۱۸۵۷ء کو دوپہر کے قریب دسویں پلٹن کی لین میں، جو خالی پڑی تھی، مفسدین نے آگ لگا دی اس وقت بخوف سرکشی اس پلٹن کے آدمیوں اور پلٹنوں کو تیار کیا لیکن لیکن جلد امن ہو گیا۔۔۔۔دسویں پلٹن پر بڑا اختیار تھا تین یا چار بے نام چھٹیاں ہندی زبان میں لکھی ہوئی اس پلٹن کے سپاہیوں نے پکڑیں اور اپنے افسروں کے سامنے لاکر رکھیں۔ ان چھٹیوں کا مضمون یہ تھا کہ اکتالیسویں پلٹن پیادگان بنگال اور نویں پلٹن اودھ متفق ہو کر سرکشی کیا چاہتی ہے لیکن ان چھٹیوں میں تاریخ یا دن نہیں لکھا تھا۔'' ۸

جب خیرآباد ڈویژن کے ہیڈ کوارٹر سیتاپور میں بغاوت کے شعلے بلند ہوئے تو وہ ہر طرف جس طرح کا ماحول تھا۔ اور انگریزوں کے خلاف جو کاروائی کی جاتی تھی اس کا ذکر ''تاریخ بغاوت'' ہند میں اس طرح کیا گیا ہے:

تاریخ گواہ ہے کہ جہاں ایک جانب ملک وقوم پر جاں نثار کرنے والے جانباز ہوتے ہیں وہاں دوسری جانب مفاد پرست غداروں کی کمی بھی نہیں ہوتی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بھی ایسی بے شمار مثالیں ملتی ہیں جنھوں نے ملک وقوم کو داغدار کیا۔ ان ضمیر فروشوں

Scanned with CamScanner

نے انقلابیوں کے خلاف مخبری کی اور انگریزوں نے انھیں طرح طرح انعامات اور مراعات سے نوازا۔ اس بات کی تصدیق 'تاریخ بغاوت ہند' سے ہوتی ہے۔ مکندلال تحریر کرتے ہیں:

''ایک شخص رامادین پرانا اور سیر سڑک تھا جس نے ضلع آگرہ میں جناب گنبس صاحب کے ماتحت بھی خدمات گزاری کی تھی۔ اب صاحب ممدوح کے پاس آیا اور اپنے چھ بھائی بندوں کو اپنے ساتھ لایا۔ ان چھ آدمیوں نے اس قدر جانفشانی سے خدمت کی کہ ان سے اور کوئی نہ کر سکے گا۔ زمانہ محاصرہ میں جناب گنبس صاحب فرماتے رہتے ہیں کہ رات کو تو یہ لوگ مورچہ بنانے میں مشغول رہتے تھے اور دن کو دشمن سے لڑتے رہتے تھے۔ رامادین اور اس کے دو آدمی مارے گئے باقی زندہ رہے اور سرکار نے ان کی پنشن مقرر کر دی۔۔۔۔ایک شخص کاریگر جس کا نام پران تھا اور جناب گنبس صاحب کے آگرہ سے کیا گیا تھا۔ اس شخص نے بھی زمانہ محاصرہ میں اچھی اچھی خدمتیں کیں۔ مورچہ بنانے میں پران نے بڑا کام کیا دشمن کی توپوں کے سامنے اپنا کام کئے جاتا تھا۔۔۔یہ شخص بھی محاصرہ میں زندہ رہا اور سرکار سے اس کو قرار واقعی انعام ملا۔''[9]

'تاریخ بغاوت ہند حصہ اوّل جلد دوم میں لکھنؤ میں 'چھٹ کی حزیمت اور محاصرہ کا آغاز' عنوان سے مکندلال نے جتنی تفصیل سے لکھا ہے اور کسی کتاب میں اتنی تفصیل نہیں ملتی بلکہ چھٹ کی لڑائی جو کہ بہت اہمیت کی حامل ہے اس پر مورخین نے بہت کم لکھا ہے۔ اس فوج باغی کی تفصیل یہ ہے:

نمبر پلٹن	مقام
چند سپاہی پلٹن نمبر اول	از سالون

Scanned with CamScanner

پلٹن نمبر دوم	از سکرورا
پلٹن نمبر سوم	از گونڈا
پلٹن نمبر پنجم	از دریاباد
پلٹن نمبر ششم	از فیض آباد
پلٹن نمبر ہشتم	از سلطان پور
پلٹن نمبر ہنم	از سیتاپور

فوج پولس اودھ

اوّل رجمنٹ پولیس	از سلطان پور
اوّل رجمنٹ پولیس	از سیتاپور

ان پلٹنوں میں بہت سے آدمی البتہ لوٹ گھسوٹ کر کے اپنے اپنے گھر چلے گئے تھے مگر تاہم اگر ہم فی پلٹن چھ سو آدمی رکھیں تو کل فوج پیادہ پانچ ہزار پانچ سو پچاس ہوتی ہے ان کے ہمراہ آٹھ سو سوار تھے اور ایک سو ساٹھ گولہ انداز اس فوج کثیر سے قلیل فوج انگریزی سے 'چنہٹ' پر مقابلہ ہوا تھا۔۔۔''[۱۰]

جنگ 'چنہٹ' کے موقع پر ۲/اگست کی ۱۸۵۷ء کی روداد مکند لال کی زبانی اس طرح ہے:

''دوم اگست توپیں اور بندوقیں دشمنوں کی ہم پر برابر چل رہے تھیں اور بڑا غل وشور برپا کر رکھا ہے علاوہ اس کے خبر ہے کہ دشمنوں نے چاروں طرف سرنگیں کھودی ہیں کپتان فلٹن صاحب انجینیر نے ایک جماعت سفر مینا (سپر زیند ماٹنر) کی تیار کی ہے اوس میں چند تو ولایتی آدمی ہیں اور چند ہندوستانی صاحب ممدوح جہاں مناسب سمجھتے ہیں اور جس جگہ دشمن کی سرنگ کا گمان ہے اوس کے خلاف وہ بھی سرنگ کھودتے ہیں ہم سب کو تاکید ہے کہ پہرہ پر سب

Scanned with CamScanner

آدمی کان لگا کر سرنگ وغیرہ کھودنے کی آواز سنتے رہیں۔ مسٹر ہالی صاحب گھوڑوں کے ڈاکٹر متعلقہ ہفتم رسالہ ترکسواران آج زخمی ہوئے ان کا ایک بازو تراشا گیا مگر بعد اوس عمل کے وہ مر گئے۔ ۱۱

'تاریخ بغاوت ہند' میں کانپور کا احوال اور تاریخی کتب میں دیئے گئے احوال سے مختلف ہے جو نانا صاحب کی شخصیت کی تصویر کے دوسرے رخ پر روشنی ڈالتا ہے۔ مکندلال تحریر کرتے ہیں:

''بعد نکل جانے اِن دو کشتیوں کے قتل عام گھاٹ پر جاری رہا۔۔۔۔۔ آخر کو بالا راو یا راو صاحب نے قتل بند کرنے کا حکم دیا جو مرد وزن کے قتل سے بچے ان کو اکٹھا اور فراہم کر کے اس بڑے مکان کی طرف لے گئے صوبیدار کی کوٹھی کے نام سے مشہور ہے اور جو میدان پریڈ کے جنوب مشرقی گوشے میں واقع ہے اس جگہ پہنچ کر باقی مرد وزن کو عورات اور بچوں سے علیحدہ کر کے قتل کیا اور عورتوں اور بچوں کو ایک چھوٹے سے مکان میں اکٹھا بند کر دیا۔۔۔ مگر ۷ر جولائی کو معلوم ہوتا ہے کہ ان بے چاریوں کو شہر کی جانب لے جا کر اس چھوٹے سے مکان میں رکھا جو 'بی بی گھر' کے نام سے مشہور ہے اور جس مکان کو کسی افسر انگریزی نے ایک اپنی ہندوستانی بیوی کے واسطے بنوایا تھا۔۔ بعد ازاں قتل عام عورات اور بچوں کے شروع ہوئی۔۔۔۔ نانا صاحب کی فرودگاہ مکان اس قتل گاہ سے صرف پچاس گز کے فاصلے پر تھا وہاں انھوں نے ناچ گانے کا حکم دیا اور شب بھر خوب ناچ رنگ اور گانا بجانا رہا۔ علی الصبح حکم ہوا کہ بی بی گھر کو صاف کیا جاوے اس میں دو سو لاشوں کم نہ تھیں اتنی لاشیں ممکن نہیں کہ اس چاہ (کنویں) میں جو مکان کے نزدیک ہے ڈال دی گئی ہوں غالب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لاشوں کو گھسیٹ کر گنگا میں بہا دیا اور باقیوں کو کنوئیں میں ڈال دیا فقط۔'' ۱۲

Scanned with CamScanner

تاریخ بغاوت ہند کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ اس میں ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کے بارے میں ان لوگوں کے بیانات درج ہیں جو جنگ میں شامل تھے اور جنھوں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس میں دہلی، میرٹھ، بدایوں، بریلی، مرادآباد، فرخ آباد، بجنور، شاہجہاں پور، بنارس، اعظم گڑھ، الہ آباد اور کانپور کے واقعات درج ہیں جو ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کے بہت اہم واقعات ہیں۔

حواشی:

۱۔ خطبات دتاسی، ص ۱۱۳

۲۔ دہلی کی یادگار ہستیاں، امداد صابری، ص ۹۶

۳۔ ایضاً

۴۔ 'دارالادب' اکبرآباد (تذکرہ نگاران آگرہ) از ڈاکٹر سید اختیار جعفری ۲۰۰۸ء ص ۱۸۳، ۱۸۵

۵۔ خطبات دتاسی، ص ۳۰۶ (حصہ اول جلد اول)

۶۔ 'تاریخ بغاوت ہند' نومبر ۱۸۵۹ء مولفہ مکند لال مطبع مفید خلائق آگرہ، ص ۳۰۵

۷۔ ایضاً دسمبر ۱۸۵۹ء، ص ۲۶۲۔۲۶۳

۸۔ ایضاً ص ۳۰۴۔۳۰۵

۹۔ 'تاریخ بغاوت ہند'، جون ۱۸۶۰ء، ص ۶۳۲۔۶۳۳

۱۰۔ تاریخ بغاوت ہند'، (حصہ اوّل، جلد دوم)، ص ۱۰۔۱۱

۱۱۔ ایضاً ص ۴۹

۱۲۔ ایضاً، ص ۴۲۴۔۴۲۶

☆☆☆

ڈاکٹر نزہت فاطمہ
گیسٹ فیکلٹی تاریخ قرون وسطیٰ، حمیدیہ گرلس پی۔جی۔کالج، الہ آباد

Scanned with CamScanner

اودھ پنچ کی ادبی وصحافت خدمات

اودھ صحافت کی تاریخ میں ''اودھ پنچ'' کا مقام قابل قدر ہے۔ جس نے زبان وادب کی ترقی کے پیش نظر اپنے خدمات انجام خدمات انجام دئے۔ لکھنؤ کا مشہور اخبار اودھ پنچ جب منظر عام پر آیا۔ اس وقت اردو صحافت کی شروعات ہو چکی تھی۔ منشی سجاد حسین کا اخبار اودھ پنچ ۱۴ر جنوری ۱۸۷۷ء کو جاری ہوا۔ اودھ پنچ کا زمانہ انگریزی حکومت کے اقتدار اور ان کے ظلم وستم کا زمانہ تھا۔ تحریکات کا زمانہ تھا۔ نئے نئے قانون نافظ ہو رہے تھے۔ اودھ پنچ کا طنزیہ اور ظریفانہ انداز برطانیہ حکومت کے ظلم وستم پر ایک خاص انداز میں جنگ تھی جو قلم کے ذریعہ لڑی گئی۔ اودھ پنچ کی نظر عوام کے حقوق پر رہتی تھی۔ عوام کے خیالات کی ترجمانی کرتا تھا۔ برطانیہ حکومت کے خلاف بے باکی سے لکھتا تھا۔

انکم ٹیکس اور البرٹ بل وغیرہ کے متعلق نظم ونثر میں آزادانہ تبصرے کرتا تھا۔ انکم ٹیکس کی مخالفت میں ۲۹ مئی ۱۸۷۷ء کے شمارے میں ''ٹیکس واویلا'' عنوان سے نظم شائع ہوئی۔ ملاحظہ ہو۔

کہتے ہے جسے ٹکس وہ ہے قہر الٰہی
دیکھیں ہمیں کب ہوتی ہے اس سے رہائی

روٹی ہی نہیں صبح سے تا شام میسر
اس حال میں ہو ٹکس کی کس طرح سمائی

الٹی یہ بنا لیتا ہے عالم کی حجامت
ہے ٹکس بھی شاید کوئی اللہ کا نائی

کانٹا سا کھٹکتا ہے یہ آنکھوں میں ہماری
نشتر سا چبھا دل میں جانوں پہ بن آئی

کونسل سے چلا ٹیکس اُدھر چرخ سے ہیضہ
دونوں نے پہنچتے ہی عجب دھوم مچائی

وہ مال کا جج ہے تو یہ جانوں کا کلکٹر
منظور ہے دونو کو سر رشتے کی صفائی

بربادی کے آثار خرابی کی علامت
اس ٹیکس میں ہر شخص کو دیتے ہیں دکھائی

کھٹکتا ہے کہیں شعر پہ بھی ٹکس نہ بندھ جائے

Scanned with CamScanner

اودھ پنچ میں ہر طرح کے مضامیں شائع ہوتے تھے۔لطیفوں کے ساتھ اودھ پنچ میں صحتِ زبان کے متعلق اور شعراء کے کلام پر اصلاح بھی ہوتی تھی۔امداد صابری لکھے ہیں۔

''اودھ کے مضامین کا دائرہ بہت وسیع تھا۔دنیا کا کوئی مسلہ ایسا نہ تھا جس پر اودھ پنچ کا قلم نہ اُٹھتا ۔خاص طور پر لکھنؤ کے طرزِ معاشرت کی پر مذاق اور دلکش تصویروں سے اس کی صفحات مزین رہتے تھے۔محرم، چہلم، عید، شبِ برات، ہولی، دیوالی، بسنت کے جلسے، عیش باغ کے میلے، مشاعرے، مرغ بازی، بٹیر بازی، الیکشن کے مصر کے اس اخبار کے ظریفوں کی نظر میں رہتے تھے۔اودھ پنچ کے مشہور مضمون نگار مرزا مچھو بیگ معروف ستم ظریف، جناب احمد علی شوق، پنڈت تربھون ناتھ، ہجر، نواب سید محمد آزاد، بابو جوالا پرشاد، برق، منشی احمد علی کسمنڈوی اور جناب اکبر حسین اکبر الہ آبادی کے نام قابل ذکر ہیں۔''[1]

منشی سجاد حسین اردو اخبار نویسی میں طرز مذاق وظرافت کے موجد لکھنؤ کی زبان وا پنے رنگ کے استاد تھے۔اودھ پنچ کے ذریعہ جو خدمات آپ نے اردو ادب کی انجام دی وہ قابل قدر اضافہ اس زبان میں آپ کی کوششوں کی بدولت ہوا۔انتخاب اودھ پنچ میں رتن ناتھ سرشار کا مضمون کچھ اس مزاحیہ انداز میں لکھا ہے عنوان ہے:

کیا یہی ہے لن ترانی آپ کی　　دیکھو طاؤس خوش بیانی آپ کی

ہم۔اودھ پنچ ذرا ادھر آؤ تمہیں واللہ ایک بات سنتے جاؤ خدا کی قسم وہ لطیفہ سناؤ کے ہنستے ہنسے لوٹن کبوتر ہو جائے۔

اودھ پنچ۔تو بھی ہم ہے سنے ہی کھل کھلا کے ہنس دیتے ہیں۔ہاہاہا

ہم۔یار اس کی بند نہیں آخر عجلت کیا ہے۔

اودھ پنچ۔واہ۔واہ عجلت کیا ہے! اور سنیے صاحب۔روس کا حال سننا ہیں۔پرنس

Scanned with CamScanner

بسمارک کی ملازمت کرنا ہے۔ڈزریلی صاحب کی خبر لانی ہے۔روسیوں کی خیر سنانی ہے کیا آپ کی طرہ لونڈے پڑھانے ہیں۔

ہم۔واللہ کیا کہی ہے۔لانا ہاتھ کیوں سچ کہنا چپکے سے ہاتھ کیا سوجھی ہے۔ورنہ تم ہاتھ نہ لگتے۔

اودھ پنچ۔اے لاحول ہاتھ دے کے ہم پھل پایا اچھا کہو کیا کہتے ہو؟''

اودھ پنچ ظرافت کا سرچشمہ تھا۔اس کے پڑھنے اور سننے والے اس کے فقروں اور لطیفوں پر لوٹ جاتے تھے۔اس کی پھبتی دور۔دور تک مشہور ہو جاتی تھی۔اودھ پنچ ریاستوں کی خوشامد چاپلوسی سے اپنا دامن پاک رکھا ہمیشہ ان کی غفلت پسندی کا پردہ فاش کرتا تھا۔اس دور میں اودھ پنچ کے ذریعہ اردو شاعری میں طنز و مزاح کی شروعات ہوئی۔وزیر آغا تحریر فرماتے ہیں۔

''اودھ پنچ ۱۸۷۷ء میں منظر عام پر آیا اور اشاعت پزیر ہوتے ہی فضا قہقہوں سے لبریز ہوگئی ۔طنز و مزاح کا ایک ایسا سیلاب تھا کہ مسکراہٹوں کو اپنے جلو میں لیے امڈا اور چاروں طرف پھیل گیا۔شاعروں اور مضمون نگاروں کا ایک پورا گروہ طنز و مزاح کے حربوں سے ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں کو نشانہ تمسخیر بنانے لگا۔''[۲]

اودھ پنچ میں پنڈت تربھون ناتھ ہجر نے غالب کی ایک غزل کی تحریف کی ہے لیکن دراصل اس کا سہارا لے کر اپنے زمانے کی بدحالی کو پیش کیا۔

اک مہینے سے چپکے بیٹھے ہیں　　واہ کیا واقعہ نگاری ہے

بیٹھے کوئی نہ آئے دفتر میں　　نادری حکم اب یہ جاری ہے

کیا کریں اب بچارے اپرینٹس　　رات دن شغلِ آہ وزاری ہے

ہائے تخفیف اور ٹیکس کے بیچ　　رو چکے سب ہماری باری ہے

Scanned with CamScanner

اودھ پنچ میں مضامین کے علاوہ نظم کا حصہ بہت اہمیت رکھتا ہے وہ ایک ادبی خزانہ ہے۔ اس میں حکمراں طبقوں اور حاکموں کو بھی بے نقاب کیا گیا ہے۔ ہندوستانیوں کو انگریز کالا آدمی کہہ کر حکارت اور نفرت کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ اس ذہنیت پر جناب شہرت نے ایک غزل کہی جو نومبر ۱۸۷۷ء کے اودھ پنچ میں شائع ہوئی۔

کچھ نہیں کام ہے لیاقت کا — مرتبہ ہے تو گوری رنگت کا
سول سروس سے ہو گئے محروم — خانہ بربادی ایسی رنگت کا
پوشش خوش ہے کوٹ اور پتلون — ہندی پہناوا ہے جہالت کا
طوف لندن کا جو ہے کر آیا — نہیں قائل وہ ہوتا جنت کا

ہنس کے کہتے ہیں لوگ سب سنکر
ریختہ خمدہ ہے یہ شہرت کا

اودھ پنچ کے لکھنے والے زندہ دلی کی زندہ تصویریں ہیں جن کا نام طنز و مزاح کی دنیا میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اودھ پنچ کا اہم کام عوام کو اس دور کے واقعات کے بارے میں خبر دینا۔ انگریزی حکومت کے خلاف مورچوں کو مضبوط کرنا تھا۔ اس نے حکومت کے رعب کو ہندوستانیوں کے دل و دماغ سے دور کیا۔ بقول ڈاکٹر عبدالرزاق فاروقی۔

" اودھ پنچ کی نمایاں خصوصیت تھی اس کے گرد لکھنے والوں کا ایک حلقہ تیار ہو چکا تھا۔ ہم اس کو موجودہ اصطلاح میں صحافیون کی تربیت" تو نہیں کہہ سکتے البتہ اودھ پنچ کے الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کے مستقل نامہ اس انداز سے اپنے افکار کا اظہار کرتے تھے جو اودھ پنچ کا خاصہ تھا۔ اس وضح کے صحافیوں کا حلقہ بعد کے اردو روزناموں اور ہفتہ وار جرائد میں تیار ہوتا رہا۔" [۳]

اودھ پنچ میں لکھنے والے نہ صرف خود توجہ اور محنت سے لکھتے تھے بلکہ اپنے ادبی سرمایہ سے بھی باموقع استفادہ کرتے تھے۔ طنز و مزاح یہ نئی شکل مقبولیت کے حصول کے لیے اختیار کی گئی تھی۔ اس لئے

Scanned with CamScanner

اکثر غیر ضروری الفاظ بھی استعمال کئے جاتے تھے۔ اودھ پنچ کا مقابلہ انگریزی حکومت کے ساتھ ساتھ ادیبوں، شاعروں اور معاصر اخباروں سب ہی سے تھا۔ اس کی پھبتیوں کے جواب میں دوسرے اخبارات نے خوب لکھا۔ ''اودھ اخبار'' کو بنیا اخبار'' کا نام دے رکھا تھا۔ چنانچہ اس کو ''شیخوڑے پنچ'' سے یاد رکھتا تھا۔ اودھ پنچ پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر رزاق لکھتے ہیں:

''اودھ پنچ چونکہ ایک ادبی اخبار تھا اس لئے اس میں خبروں کی جگہ حالات و واقعات پر تبصرے اور خیال آرائی زیادہ ہوتی تھی۔ مضامین کے ساتھ۔ ساتھ نظمیں اور کارٹون پیش کئے جاتے تھے۔ ان سب میں ایک خوبی نظر نہیں آتی جو صحافت کی جان یعنی اختصار نویسی میں اس اخبار کے صفحات بات کا بتنگڑ بنانے میں ہمیشہ پیش۔ پیش رہے۔

نظم ہو یا نثر ہر جگہ اس کے نامہ نگار بے تکان لکھتے جاتے ہیں۔ یہ انداز تحریر آج کے دور مین کس طرح کس طرح قابل تقلید نہیں ہوسکتا۔ البتہ اس وضع کی تحریر کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ بات گھوم پھر کر حکومت کی فانوسی گرفت سے اکثر بچ کر نکل جاتی ہے۔.....داستانوں، افسانوں، طویل مرثیوں اور مثنویوں کے ادبی ماحول میں اودھ پنچ کے نامہ نگاروں کی یہ تفصیلی ہے تکان خانہ فرسائی اس زمانہ میں نبھ گئی جو ایک طرح سے اس کی خوبی بھی ہے اور خاصی بھی۔''[۴]

اودھ پنچ کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے اپنے پڑھنے والوں کا ایک وسیع حلقہ تیار کرلیا تھا۔ اس زمانے میں جب عام اخبار کی اشاعت دو تین سو تھی اور اودھ پنچ کی تیرہ ہزار کاپیاں چھپتی تھی۔ اس اخبار نے اردو زبان کو ہر دلعزیز بنانے اور اکبار بینی کے شوق کو عام کرنے میں خدمات انجام دیئے۔ باکمال اہل علم حضرات کے تعاون سے اس اخبار کو کافی شہرت حاصل ہوئی۔ ۱۹۱۶ء کو یہ اخبار بند ہوگیا۔

حواشی

۱۔ تاریخ صحافت اردو، جلد سوم، امداد صابری، جدید پرنٹنگ پریس جامع مسجد دہلی، ص۔ ۹۳

Scanned with CamScanner

۲۔ اردو ادب میں طنز و مزاح، وزیر آغا، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۲۰۱۱ء، ص۔ ۱۲۰
۳۔ اودھ پنچ کی ادبی خدمات، ڈاکٹر محمد عبدالرزاق فاروقی، شاہین کمپ کرنول ۱۹۸۲ء، ص۔ ۸۱
۴۔ اودھ پنچ کی ادبی خامات، ڈاکٹر محمد عبدالرزاق فاروقی، شاہین کمپ کرنول ۱۹۸۲ء، ص۔ ۸۱

☆☆☆

ڈاکٹر فرح ہاشم
وزیٹنگ فیکلٹی
شعبۂ پی جی اردو
حمیدیہ گرلس ڈگری کالج الہ آباد

farahhashim73@yahoo.in

سرسیّد اور صحافت

17 اکتوبر 1817ء، یہ وہ تاریخ اور سال ہے جس میں ہندوستانی مسلمانوں کی سسکتی زندگی کو علم و عرفان کا آبِ حیات پلانے والے سرسیّد احمد خاں کا وجودِ مسعود مقدر ہوا۔ کون تھے یہ سرسیّد؟ اور کیسے تھے؟ آیئے اسماعیل پانی پتی کی وہ قلمی تصویر دیکھتے ہیں جو انھوں نے 'نقوش' لاہور کے 'شخصیات نمبر' میں کچھ یوں بیان کی تھی:

> ''رنگ سرخ و سفید، چہرہ نہایت پر رعب، پیشانی بلند، سر بڑا، بھویں جدا جدا، آنکھیں متناسب اور نہایت روشن، ناک چھوٹی، کان لمبے، گلے میں بڑی سی رسولی، لمبی داڑھی میں بالکل چھپی ہوئی، جسم فربہ، قد لمبا، ہڈی چوڑی چکلی، ہاتھ پاؤں قوی اور زبردست، بدن گٹھیلا اور مضبوط، صورت وجیہ، وزن پورا ساڑھے تین من، لباس ترکی، معاشرت انگریزی۔ یہ تھے جواد الدولہ عارف جنگ ڈاکٹر سرسیّد احمد خاں مرحوم، بانی علی گڑھ کالج، مجدد زبان اُردو، باعثِ تخلیق 'مسدسِ حالی'۔''[1]

لیکن اس تصویر سے سرسیّد کی زندگی، ان کے افکار و نظریات اور علمی و قومی خدمات مکمل طور سے سامنے نہیں آتیں۔ کیونکہ سرسیّد کا صرف ظاہری وجود ہی بھاری بھر کم نہیں تھا بلکہ فکری اور سیاسی شعور اس سے زیادہ تھا، وہ نہ صرف شخصی رعب و وجاہت کے حامل تھے بلکہ ان کی علمی گیرائی و گہرائی اس سے آگے تھی۔ کبھی آیاتِ قرآنیہ کی تفسیر کر رہے ہیں تو کبھی 'خطباتِ احمدیہ' لکھ کر مستشرقین کے خلاف تیغِ بے نیام ہیں، کہیں جج نظر آتے ہیں تو کہیں صدر الصدور، کبھی اہم موضوعات پر قلم اُٹھانے والے مصنف ہیں، تو کبھی علی گڑھ کالج کے بانی اور روحِ رواں، کبھی اُردو کے معماروں کی صف میں کھڑے ہیں تو کبھی صحافت کو نئی زندگی دینے والے عظیم صحافی ہیں۔ غرض کیا کیا بیان کیجیے اور کس کس پہلو پر قلم اُٹھایئے۔ داستان بہت میٹھی ہے اس لیے طویل ہو جائے

Scanned with CamScanner

گی، اس لیے اس مقالہ میں صرف سرسیّد کی صحافت پر ہی ارتکاز کرتے ہیں۔

سرسیّد کا صحافت سے اوّلین تعارف:

سرسیّد کا صحافت سے اوّلین تعارف آپ کے بڑے بھائی سیّد محمد خاں کے 'سیدالاخبار' کے ذریعہ ہوا، جس کو سیّد محمد خاں نے 1841ء میں دہلی سے جاری کیا تھا، اسی اخبار میں سرسیّد کے ابتدائی مضامین شائع ہوئے اور سیّد محمد خاں کے انتقال کے بعد 'سیّدالاخبار' کی ادارتی ذمہ داریاں بھی آپ نے ہی سنبھالیں، اور اس کا نام 'سیّدالاخبار' سے بدل کر 'مطبع الاخبار' کر دیا۔ آگے چل کر 1849ء میں یہ اخبار بند ہو گیا۔

سائنٹفک سوسائٹی کا قیام اور اخبار 'سائنٹفک سوسائٹی' کا اجرا سرسیّد مرحوم اپنی قوم کی زبوں حالی اور علمی بے مائیگی سے بخوبی واقف تھے، اور اس سلسلہ میں ان کو ہمیشہ فکر دامن گیر رہتی تھی، چنانچہ زمانۂ ملازمت میں جب سرسیّد کا قیام غازیپور میں تھا، آپ کو فکر ہوئی کہ کوئی علمی مجلس قائم کی جائے، اور اپنی اس فکر کو 9 جنوری 1864ء کو 'سائنٹفک سوسائٹی' قائم کر کے عملی جامہ پہنایا۔ اسی سال سرسیّد علی گڑھ آ گئے تو سوسائٹی کا دفتر بھی علی گڑھ منتقل ہو گیا۔ سوسائٹی سے ایک اخبار 30 مارچ 1866ء کو سرسیّد نے شروع کیا، جو کہ ہفت روزہ تھا لیکن مئی 1877ء کے بعد سہ روزہ انیسویں صدی کے اخیر عشرہ میں دوبارہ ہفت روزہ کر دیا گیا۔

اخبار کے مشمولات میں ایڈیٹوریل، سوسائٹی کی سرگرمیاں اور کچھ خبریں ہوا کرتی تھیں۔ علاوہ ازیں مختلف علمی، سماجی اور اصلاحی مضامین بھی شامل ہوتے تھے۔ اُردو میں 'اخبار سائنٹفک سوسائٹی' اور انگریزی میں 'The Aligarh Institute Gazatte' نام تجویز پایا۔ اخبار میں دو کالم ہوتے تھے، ایک اُردو میں اور ایک انگریزی میں۔ مضامین عموماً یکساں ہوتے تھے اور کبھی کبھی مختلف بھی، اور اس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانیوں اور انگریزوں کے درمیان قربت پیدا کی جا سکے اور حاکم و محکوم کے بیچ کی خلیج کو پاٹ دیا جائے اور بہر صورت غلط فہمیوں کا

Scanned with CamScanner

ازالہ ہو۔

سوسائٹی کا قیام اور اخبار کی اشاعت کیونکر ہوئی، خود سرسیّد کی زبانی سنیے، جس میں سوسائٹی کے مقاصد بھی آ گئے ہیں:

''اس زمانہ میں میرے خیالات یہ تھے کہ ہندوستان میں علم کے پھیلانے اور ترقی دینے کے لیے ایک مجلس مقرر کرنی چاہیے جو اپنے قدیم مصنفوں کی عمدہ کتابیں اور انگریزی کی مفید کتابیں ہیں، اُردو میں ترجمہ کرا کے چھاپے۔ بذریعہ ترجموں کے جو اُردو زبان میں ہوں اپنی قوم کو اعلیٰ درجہ کے یورپین علوم وفنون سے بہرہ یاب کر سکتی ہوں۔ اس پر کوشش اور 1864ء میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی جس کی عالیشان عمارت علی گڑھ میں آپ دیکھتے ہیں۔ بہت سی کتابوں کا اُردو ترجمہ ہوا اور اس کا ایک اخبار میرے اہتمام سے جاری ہوا۔''[۲]

'اخبار سائنٹفک سوسائٹی' کی خصوصیات

اس اخبار کو ہندوستانی صحافت میں جو اہمیت اور مرتبہ حاصل ہے وہ کسی ہوشمند اور صاحبِ مطالعہ سے مخفی نہیں۔ یہ اس زمانہ کا ممتاز اخبار تھا، اس اخبار میں وہ خصوصیات تھیں جو پہلے کے اخباروں میں نہیں پائی جاتی تھیں، ذیل میں کچھ خصوصیات ذکر کی جاتی ہیں:

(1) اس اخبار کے ذریعہ اُردو کو پہلی مرتبہ حقیقت پسندانہ بامقصد صحافت ملی۔

(2) یہ اخبار ہندوستانی صحافت کی تاریخ میں قدیم وجدید صحافت کا سنگم ہے۔

(3) اس اخبار نے ایڈیٹوریل کو ہندوستانی صحافت میں اہم ستون کی حیثیت سے روشناس کرایا، اس سے پہلے اُردو اخبارات میں ایڈیٹوریل کا وجود ہی عنقا تھا۔

(4) سابقہ اخبارات کے برخلاف اس اخبار نے آسان اور سہل زبان کو ترویج دی۔

Scanned with CamScanner

(5) اس سے پہلے کے اخبارات ٹائپ سے نا آشنا تھے، یہ اخبار سب سے پہلے ٹائپ ہو کر شائع ہونے والا اخبار ہے۔

(6) اخبار کا بنیادی مقصد تعلیم کا فروغ اور امت میں سیاسی بیداری پیدا کرنا تھا، اس کے علاوہ آپسی بھائی چارہ، تفرقہ کی مخالفت اور عملی جدوجہد کی دعوت بھی اس کے مقاصد میں شامل تھے۔

(7) اس اخبار نے اندھی مذہبی تقلید اور بے جا رسوم ورواج کی شدت سے مخالفت کی۔[۳]

اس سلسلہ میں مولانا حالیؔ 'حیاتِ جاوید' میں لکھتے ہیں:

''1866ء ہی میں سر سیّد نے سائنٹفک سوسائٹی سے اخبار نکالا، اس اخبار کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس کا ایک کالم انگریزی میں اور ایک اُردو میں ہوتا تھا۔ اس کا خاص مقصد گورنمنٹ اور ہندوستانیوں کے حالات اور معاملات اور خیالات سے آگاہ کرنا اور ہندوستانیوں کو انگریزی طرزِ حکومت سے آشنا کرتا تھا۔ اس میں سوشل، اخلاقی، علمی اور پولیٹیکل ہر قسم کے مضامین برابر چھپتے تھے۔ یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں ہے کہ کم سے کم شمالی ہندوستان میں عام خیالات کی تبدیلی اور معلومات کی ترقی اسی پرچہ کے اجرا سے شروع ہوئی۔ وہ ہمیشہ رعیت کو آزادی اور اطاعت سکھاتا تھا اور ان کی خیر خواہی اور وفاداری کے خیالات گورنمنٹ پر ظاہر کرتا تھا۔ ایک وصف جو اس اخبار کے ساتھ مخصوص تھا وہ یہ تھا کہ اس نے اپنی طرزِ تحریر میں برخلاف اپنے تمام ہمعصروں کے کبھی کسی قوم یا فرقہ یا کسی خاص شخص کی دل آزادی روا نہیں رکھی۔ ہندوستانی مسلمانوں کے مذہبی جھگڑوں سے وہ ہمیشہ بے تعلق رہا اور اگر کبھی کچھ بولا تو دونوں کو صلح وآشتی کی نصیحت کی۔ باوجودیکہ وہ گورنمنٹ اور اس کے مدبروں پر اکثر نکتہ چینی کرتا

تھا مگر اعتدال اور ادب اور تعظیم کو جو ایک محکوم قوم کا زیور ہے اس نے ہمیشہ ملحوظ رکھا..... ایک اور خصوصیت اس اخبار کی اس کی باقاعدگی، جو اکثر دیسی اخباروں میں مفقود ہے اور اس کی خبروں کا نہایت معتبر ذریعہ سے لیا جانا تھا۔ اس کی باقاعدگی کا یہ حال تھا کہ وہ بتیس برس برابر جاری رہا اور اس عرصہ میں شاید ہی کوئی نمبر ایسا ہوگا جو اپنی تاریخ معین پر نہ نکلا ہو۔"[4]

عام شہرت تو اسی بات کی ہے کہ اخبار گورنمنٹ کا حامی اور خیر خواہ تھا، اس کے باوجود گورنمنٹ کے کسی غلط اقدام یا قوم کی دل آزاری کو اخبار نے کبھی برداشت نہیں کیا، بلکہ ہمیشہ اس سلسلہ میں جرأتِ اظہار اور حق گوئی اس کا طرۂ امتیاز رہی۔

1876ء میں انگریزی حکام نے چھ ہندوستانیوں کو قتل کیا تو اخبار نے اس خبر کو کچھ یوں شائع کیا:

"یہ چھ خبریں قتل کی ہیں، جن میں چھ غریب ہندوستانی مقتول اور چھ صاحب بہادر قاتل ہیں اور ان جملہ مقدمات میں اب تک یہ معلوم نہیں ہوا ہے کہ قاتلوں سے کیا مواخذہ ہوا۔ کیا غریب ہندوستانی اسی طرح کام آویں گے کہ ہمیشہ صاحب لوگوں کے گھونسوں اور لاتوں اور بوٹوں سے پٹ کر جان دیں گے۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر گورنمنٹ انگریزی میں جان کی حفاظت کا دعویٰ شاید صحیح نہ ہوگا۔"[5]

اس خبر کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اخبار کی انگریز حکام پر تنقید کرنے میں کیا پالیسی اور کیا رُخ تھا۔

1857ء کے غدر کے بعد مسلمانوں کی حالت اور 'تہذیب الاخلاق' کی اشاعت

1857ء میں غدر ہونا، اور اس کی ناکامی کے بعد مسلمانوں کا انگریز حکومت کے ظلم وستم کا تختۂ مشق بننا، یہ دونوں باتیں ایسی تھیں جن سے سرسیّد بے چین ہو گئے تھے۔ کیونکہ اوّلاً تو سرسیّد

انگریز حکومت کے خلاف غدر کے ہی مخالف تھے۔ ثانیاً غدر کی پاداش میں صرف مسلمان ہی سزا کے مستحق ٹھہرے تھے۔ اسی لیے سرسیّد نے انگریز حکومت کا غصہ اور مسلمانوں کے تئیں نفرت کم کرنے کی غرض سے 'لائل محمڈنز آف انڈیا' کے نام سے مختلف رسالے لکھے اور انگریز حکومت کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی مسلمان گورنمنٹ کے مخالف نہیں تھے۔ سرسیّد بقلم خود لکھتے ہیں:

''میں اس زمانہ میں دیکھتا کہ مسلمانوں نے جو خیر خواہیاں کیں ان کا ذکر اخباروں میں بہت کم چھپتا ہے اور بغاوت کی جو کتابیں چھپی ہیں ان میں تو اس کا ذکر ہی نہیں۔ اس لیے میں نے ارادہ کیا کہ مسلمان خیر خواہوں کا تذکرہ رسالہ میں شروع کردوں۔ میں نے چند رسالے لکھے اور مشتہر کیے جو 'لائل محمڈنز آف انڈیا' کے نام سے مشہور ہیں۔[6]''

لیکن یہ رسائل سرسیّد کو اپنے مقصد کی برآری کے کے لیے ناکافی نظر آئے، چنانچہ سرسیّد نے مسلم قوم کے حالات کا بہت دقت نظری سے جائزہ لیا اور قوم کے مسائل و مشکلات کا اصل سبب جاننے کی کوشش کی، اور یہ کوشش دو نتیجے سامنے لائی: (1) ساری مشکلات اور مسائل کا بنیادی سبب قوم کا اعلیٰ معیاری تعلیم سے عاری ہونا ہے، (2) دوسرا اہم سبب حاکم قوم کے ساتھ میل جول اور راہ و رسم کا نہ ہونا ہے۔ سرسیّد نے ان پہلوؤں کو سامنے لانے کے لیے 'اسباب بغاوتِ ہند' لکھی۔ خود لکھتے ہیں:

''میں نے یقین کیا کہ اگر یہ دونوں باتیں نہ ہوتیں تو یا غدر واقع نہ ہوتا، اگر ہوتا تو جو سخت مصیبت گورنمنٹ پر، ہماری قوم پر واقع ہوئی اس قدر نہ ہوتی۔ تو میں نے رسالہ 'اسباب بغاوتِ ہند' لکھا۔''[7]

گویا مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کو سرسیّد نے نہ صرف ان کی پستی و ذلت کا سبب جانا، بلکہ اس کو دور کرنے کے لیے فکر مند بھی ہوئے۔ ان کو یقین ہو چلا کہ اگر قوم میں نئی روح پھونکنی ہے اور اس کو غیر قوموں کے شانہ بشانہ کھڑا کرنا ہے تو سوائے تعلیم کے کوئی دوسرا راستہ نہیں جو منزل تک

Scanned with CamScanner

لے جا سکے اور قوم کی ڈگمگاتی کشتی کو کنارے لگا سکے۔ سرسیّد مرحوم کو اس سلسلہ میں کیا فکرمندیاں لاحق تھیں اس کا اندازہ صرف ان دو جملوں سے لگایا جا سکتا ہے:

''جو حال اس وقت قوم کا تھا وہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ چند روز اسی خیال اور اسی غم میں رہا۔ آپ یقین کیجیے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دیے۔'' ۸

آگے لکھتے ہیں:

''آخر کو یقین ہو گیا کہ جب تک ہندوستان میں تعلیم عام نہ ہوگی ان خرابیوں کا کلی انسداد کسی طرح نہیں ہو سکتا۔'' ۹

تعلیم اور تہذیب، جس سے کہ انگریز قوم مالا مال تھی، کے کیا طریقہائے کار انھوں نے اپنائے، کن کن تدبیروں سے وہ اس درجہ تک پہنچے، اس کو جاننے اور سمجھنے، اور سمجھنے کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے لیے اس کو برتنے کی غرض سے سرسیّد نے انگلستان کے سفر کی نیت کی اور اپریل 1869ء میں اپنے دونوں بیٹوں سیّد محمود اور سیّد حامد کے ساتھ رختِ سفر باندھا اور لندن جا کر طریقۂ تعلیم کو اچھی طرح دیکھا اور سمجھا۔ اپنے اسی مقصد کو سرسیّد یوں بیان کرتے ہیں:

''میرا ایک بڑا مقصد انگلستان کے طریقۂ تعلیم کو دیکھنا تھا اور اس پر غور کرنا تھا، چنانچہ اس غرض سے کیمبرج یونیورسٹی کو خود جا کر دیکھا اور بڑی اور چھوٹی چیز کو غور سے دیکھا، تمام نقشہ ذہن نشین کر لیا اور عام تعلیم پر غور کیا۔'' ۱۰

قیامِ لندن ہی کے دوران سرسیّد نے نہ صرف تعلیم کی تمام تجاویز مرتب کر لی تھیں بلکہ کالج کا نقشہ بھی وہیں بنوا لیا تھا۔ اپنے اس تعلیمی مشن کو شروع کرنے کی کچھ ترکیبیں بھی تجویز کی تھیں جن میں سے ایک اس طرح تھی:

''ایک ایسی تدبیر اختیار کی جائے جس سے عموماً خیالات تعصب جو مسلمانوں کے دِلوں میں بیٹھے ہوئے ہیں اور یورپین سائنسز اور لٹریچر کا پڑھنا کفر اور

Scanned with CamScanner

مذہب اسلام کے برخلاف سمجھتے ہیں، دور ہوں۔[11]"

اس تجویز کو بروئے عمل لانے کی خاطر سرسیّد نے ہندوستان آ کر وہ انقلابی رسالہ جاری کیا جس کو لوگ 'تہذیب الاخلاق' کے نام سے جانتے ہیں۔ رسالہ کیا تھا بم تھا جس نے خوابیدہ قوم کو بیدار ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس رسالہ کے ذریعہ ملت کے افراد کو صحافت کا وہ رنگ دیکھنے کو ملا جو اس سے قبل نہیں دیکھا گیا تھا، ایک ایسا رسالہ جس میں نہ خبریں ہوتی تھیں نہ گھسے پٹے موضوعات پر بے اثر مضامین بلکہ رسالہ اپنے جلو میں انقلاب کے ایسے ایسے رنگ لایا جو کبھی قوم نے دیکھے نہ تھے، رسالہ نے ایسی ایسی صدائیں قوم کے کانوں میں ڈالیں جو اس سے پہلے کبھی پڑی نہ تھیں۔ رسالہ میں قوم نے کبھی سیاست کے نقارے سنے کبھی اپنی مفلوک الحالی اور بے سروسامانی کی سسکیاں بھی، اس رسالہ میں ملت نے اپنی تعلیمی محرومی کو الفاظ کا جامہ پہنے دیکھا تو کبھی انگریز حکومت کی مدح سرائی بھی پڑھنے کو ملی، کبھی یہ رسالہ ان کو دین و دنیا سنوارنے کی دعوت دینے والا واعظ نظر آیا، کبھی قوم کی اخلاقی اور نفسانی بیماریوں پر انگلی رکھنے والا معالج دکھائی دیا۔ غرض زندگی کا کون سا شعبہ اور زیست کا کون سا پہلو ایسا ہے جس پر اس رسالہ نے قوم کو جگایا نہ ہو۔

رسالہ کا پہلا شمارہ ۲۴ر دسمبر 1870ء مطابق یکم شوال 1287ھ کو شائع ہوا اُردو نام 'تہذیب الاخلاق' اور انگریزی نام 'The Mohammeden Social Reformer' رکھا گیا۔ سرورق پر عربی میں ایک عبارت یوں لکھی ہوتی تھی: "حب القوم من الایمان فمن یسع فی إعزاز قومه إنما یسعی فی إعزاز دینه." البتہ مضامین کی زبان صرف اُردو تھی۔ رسالہ ماہانہ ہوگا یا پندرہ روزہ کوئی طے نہیں تھا اسی لیے رسالہ کے پہلے شمارہ میں اس کی وضاحت کر دی گئی کہ:

"یہ پرچہ مہینہ میں ایک بار یا دو بار جیسا کہ مقتضائے مضامین ہوگا چھپا کرے گا۔"[12]

سرسیّد نے رسالہ کے اغراض و مقاصد پہلے ہی شمارہ میں واضح کر دیئے تھے۔ لکھتے ہیں:

"اس پرچہ کے اجرا سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ کی

Scanned with CamScanner

سویلزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جاوے تا کہ جس حقارت سے سویلزڈ یعنی مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہو اور وہ بھی دنیا میں معزز و مہذب قوم کہلاویں۔''

مزید لکھتے ہیں:

''اسلام میں وہ سب سچی باتیں ہیں جو کہ دنیا کی ترقی کو حاصل کرنے والی اور انسانیت اور تہذیب اور رحم دِلی کو کمال کے درجہ پر پہنچانے والی ہیں، مگر ہم کو اپنی بہت سی رسوم و عادات کو جو اگلے زمانہ میں مفید تھیں مگر حال کے زمانہ میں نہایت مضر ہو گئی ہیں چھوڑنا چاہئے۔'' [۲۱]

گویا کہ رسالہ کا مقصد مسلمانوں کو تعلیمی اور تہذیبی پستی کے قعرِ مذلت سے نکال کر مہذب قوموں کے شانہ بشانہ کھڑا کرنا اور پرانی فرسودہ مذہبی رسوم و تقالید کے طوق غلامی سے نجات دلانا تھا۔ آخر الذکر مقصد کی خاطر سرسیّد اور ان کے رفقاء قلم کار کے قلم سے مذہبی امور سے متعلق کچھ ایسی باتیں سپردِ قرطاس ہوئیں جو خصوصاً طبقۂ علماء کے لیے دل کی پھانس بن گئیں۔

خاص طور پر دنیا کا چھ دن میں بن جانا، قصہ آدم، شیطان اور فرشتوں کو تمثیل قرار دینا، جنت و جہنم کو استعارہ سے تعبیر کرنا وغیرہ۔ یہ وہ اُمور ہیں جن کو 'تہذیب الاخلاق' میں جگہ دی گئی اور نتیجتاً ایک فضا 'تہذیب الاخلاق' کے خلاف بنتی چلی گئی اور صرف دو مہینے بعد ہی ان افکار کی تردید اور مخالفت میں کانپور سے دو پرچے مولانا امداد علی نے جاری کئے پہلا 'نور الانوار' جو کہ جنوری 1871ء کو نکالا اور دوسرا 'نور الآفاق' اگست 1871ء کو۔ ان دو پرچوں کے علاوہ دیگر اہم مخالف پرچے اس طرح ہیں:

'تیرہویں صدی' آگرہ سے نکلا۔ 'لوحِ محفوظ'، 'تائید الاسلام' اور 'اکسیر اعظم' مراد آباد سے نکلے۔ 'اشاعت السنۃ' پنجاب سے اور 'رفیقِ ہند' لاہور سے نکلا۔

لیکن مخالفت کے باوجود تہذیب الاخلاق' کے قدم اپنے مشن سے ڈگمگائے نہیں،

Scanned with CamScanner

کیونکہ 'تہذیب الاخلاق' اور اس کے لکھنے والے (ان کی دینی آراء سے قطع نظر) اپنی نیت میں مخلص تھے۔ اور اسی طرح مخالفین بھی اخلاص ہی کا دامن تھامے ہوئے تھے۔ 'روحِ صحافت' میں امداد صابری رقم طراز ہیں:

''جو شخص بھی 'تہذیب الاخلاق' اور اس کے مخالف اخبارات کا مطالعہ کرے گا، اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ یہ دونوں طبقے اپنی اپنی جگہ نیک نیت اور مخلص تھے۔''[14]

اس کے باوجود دونوں میں فرق یہ تھا کہ تہذیب الاخلاق نے کبھی تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا جبکہ مخالفین نے ہر بے اعتدالی اور طعن و تشنیع کو روا رکھا۔

'تہذیب الاخلاق' اپنے مشن میں کامیاب ہوا یا نہیں، اس کا اثر قوم کے کس طبقہ پر پڑا اور کونسا طبقہ اس کے زیرِ اثر نہ آ سکا، اس سلسلہ میں مولانا الطاف حسین حالؔی کی یہ تحریر رہنمائی کرتی ہے، لکھتے ہیں:

'' 'تہذیب الاخلاق' کے جاری ہونے سے رفتہ رفتہ ایک معتدبہ گروہ مسلمانوں میں ایسا بھی پیدا ہو گیا جو اس پرچہ کا ویسا ہی دلدادہ تھا جیسے انگلستان والے 'ٹیٹلر' اور 'اسپیکٹیٹر' کے دلدادہ تھے، وہ اس کے مضامین پر وجد کرتے تھے اور تاریخ معین پر اس کے انتظار میں ہمہ تن چشم رہتے تھے۔ اگر سرسیّد یہ پرچہ جاری نہ کرتے اور مسلمانوں کے خیالات کی اصلاح کا اظہار چھوڑ دیتے، بلکہ صرف ان کی تعلیم کا انتظام کرتے تو ظاہراً ان کی مخالفت کم ہوتی بلکہ شاید نہ ہوتی، مگر اس کے ساتھ ہی اعانت اور امداد بھی کم ہوتی اور جو تحریک چند سال میں مسلمانوں میں پیدا ہو گئی اس کا صدیوں تک کہیں نام و نشان نہ ہوتا۔''[15]

مزید لکھتے ہیں:

''چونکہ یہ پرچہ اسلام کو ایسی صورت میں ظاہر کرتا تھا جو مسلمانوں کے عام

Scanned with CamScanner

خیالات کے برخلاف تھی اور ان کے کان میں وہ صدائیں پہنچاتا تھا جو اُنھوں نے پہلے کبھی نہ سنی تھی۔ اس لیے اوّل اوّل لوگ اس سے بہت بھڑکے، مگر رفتہ رفتہ مسلمانوں کے محدود دائرے میں اس کا اثر پھیل گیا۔ اَن پڑھ مسلمان جن کی تعداد ہمیشہ ایک گری ہوئی قوم میں پڑھے لکھوں کی نسبت بہت زیادہ ہوتی ہے، وہ تو یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ 'تہذیب الاخلاق' کس جانور کا نام ہے۔ مولویوں اور واعظوں پر بھی اس کا منتر نہیں چل سکتا تھا، کیونکہ وہ اس کو نہ صرف مذہب کے حق میں بلکہ شاید اپنے حق میں بھی مضر جانتے تھے۔ امرا تک اس کی رسائی ہونی سخت دشوار تھی کیونکہ ان کو مسلمانوں کے تنزل کا یقین دلانا ایسا مشکل تھا جیسا کہ مرغابی کو طوفان سے خوف دلانا۔ اس لیے 'تہذیب الاخلاق' کا اثر صرف متوسط طبقے کے لوگوں میں محدود رہا، جو نہ محض جاہل تھے اور نہ جامع علوم عقلیہ ونقلیہ، اور مقدور کے لحاظ سے نہ نہایت پست حالت میں تھے اور نہ اعلیٰ درجہ میں۔"[16]

سرسیّد کی حیات میں 'تہذیب الاخلاق' کی اشاعت تین ادوار میں ہوئی، تفصیل حسب ذیل ہے:

(1) پہلا دور 24 دسمبر 1870ء تا 20 ستمبر 1876ء

(2) دوسرا دور 23 اپریل 1879ء تا 28 جولائی 1881ء

Scanned with CamScanner

(3) اس رسالہ کی دعوت اور مشن پر ہندوستان میں مسلمانوں کو فکر لاحق ہوئی کہ جدید تعلیمی مراکز قائم کیے جائیں۔ سب سے زیادہ بڑا اور اہم نفع بلکہ احسان اس رسالہ کا یہ ہے کہ اس کے ذریعہ محمڈن کالج (موجودہ مادرِ علمی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کو قائم کرنے کی فضا ہموار ہوئی اور جہالت و بدتہذیبی کے اندھیروں میں بھٹکتی مسلم قوم کو تعلیم و تہذیب کی روشنی ملی۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ اُردو صحافت سرسیّد کی رہینِ منّت ہے۔ سرسیّد ہی نے صحافت کو تقلید اور فرسودگی کی قید سے نکال کر ایک نئی جہت دی تھی، جرأتِ اظہار، حق گوئی و بیبا کی، حالات کا گہری نگاہ سے تجزیہ، شستہ ادبی زبان، یہ سب صحافت کو سرسیّد سے ملا، اور تہذیب نے اس روش کو اپنا کر اُردو صحافت کو آدابِ صحافت سے روشناس کرایا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ سرسیّد کی صحافت یا یوں کہیے کہ 'تہذیب الاخلاق' اُردو صحافت کے باوا آدم ہیں، اُردو صحافت کا پہلا باب ہی 'تہذیب الاخلاق' ہے، اس کے بغیر اُردو صحافت کے وجود کا تصور ہی نہیں۔ 'تہذیب الاخلاق' کے بعد تمام اخبار و رسائل نے اسی کے بتائے اصولوں پر عمل کیا اور اسی کو اپنا راہ نما جانا۔ اور یہی وجہ لکھتے ہیں: ''اگر لوگوں کا یہ خیال صحیح ہے کہ 'تہذیب' نے تمام ہندوستانیوں کو ہلا دیا اور لوگوں کے دلوں کو قومی ہمدردی پر مائل کر دیا تو شاید میری نجات کے لیے کافی ہوگا۔''[۵]

حواشی:

۱۔ منقول از 'انتخاب مضامینِ سرسیّد' ترتیب: انور صدیقی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی۔

۲۔ عظیم الشان صدیقی 'مشاہیر کی آپ بیتیاں' ص 33، اُردو اکادمی، دہلی

۳۔ دیکھیے 'الصحافة الاسلامية فی الهند تاریخها و تطورها' ڈاکٹر سلیم الرحمٰن خان ندوی، ص 60-59

۴۔ 'حیاتِ جاوید' مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان سے اختصار کے ساتھ منقول۔ از ص 131 تا 134

۵۔ 'اخبار سائنٹفک سوسائٹی' 15 ستمبر 1876ء، بروز جمعہ، بحوالہ عبدالحئی، 'اُردو صحافت

Scanned with CamScanner

اور تیسرا دور 17 اپریل 1894ء تا 3 فروری 1897ء

آخری شمارہ کے بعد 'تہذیب الاخلاق' کو 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' میں ضم کر دیا گیا۔

'تہذیب الاخلاق' کی خصوصیات اور کارنامے

تھی کہ خود سرسیّد مرحوم بھی 'تہذیب الاخلاق' کو اپنی زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ

تھے،

گردانتے

'تہذیب الاخلاق' جو مشن لے کر چلا تھا وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب رہا اور اُردو صحافت کی تاریخ میں ایک ایسی مثال قائم کی جس کی نظیر نہیں ملتی، ذیل میں اس کی اہم خصوصیات اور کامیابیاں درج کی جاتی ہیں:

(1) یہ رسالہ صرف اور صرف مسلمانوں کے مسائل اور ان کی ترقی کے لیے جاری کیا گیا تھا برخلاف 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' کے کہ وہ ہندوستانی قوم کے لیے تھا۔

(2) اس رسالہ نے اُردو نثر نگاری کو نئی جہت دی اور اس کو مسجع و مقفّیٰ درباری زبان سے ایک عام ترسیل کی زبان بنایا۔

(3) مسلمانوں کی ہندوستان میں زبوں حالی کو دور کیا اور زندگی کو ایک نئی روشنی دی۔

(4) سرسیّد احمد خاں، ص 97

۶ عظیم الشان صدیقی 'مشاہر کی آپ بیتیاں'، ص 30

۷ عظیم الشان صدیقی 'مشاہر کی آپ بیتیاں'، ص 30

۸ عظیم الشان صدیقی 'مشاہر کی آپ بیتیاں'، ص 29

۹ عظیم الشان صدیقی 'مشاہر کی آپ بیتیاں'، ص 30

۱۰ عظیم الشان صدیقی 'مشاہر کی آپ بیتیاں'، ص 42

۱۱ عظیم الشان صدیقی 'مشاہر کی آپ بیتیاں'، ص 44

۱۲ 'تہذیب الاخلاق' یکم شوال 1287ھ، جلد اوّل، شمارہ 1

Scanned with CamScanner

۱۳۔ 'تہذیب الاخلاق' یکم شوال 1287ھ، جلد اول، شمارہ 1

۱۴۔ منقول از 'اردو صحافت اور سرسید احمد خاں'، ص 91

۱۵۔ مولانا الطاف حسین حالی 'آب حیات' ص 165

۱۶۔ مولانا الطاف حسین حالی 'آب حیات' ص 167

۱۷۔ عظیم الشان صدیقی 'مشاہیر کی آپ بیتیاں'، ص 44

صدیقہ جابر

Scanned with CamScanner

لکھنؤ میں اردو اخبارات کی روایت اور نظم اخبار

(انیسویں صدی کے حوالے سے)

انیسویں صدی ہندوستان میں تہذیبی و ادبی نقطۂ نظر سے ایک اہم صدی رہی ہے۔ اس صدی کے مخصوص سماجی و سیاسی حالات و واقعات نے ادب و سماج پر مثبت و منفی دونوں طرح کے اثرات مرتب کیے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یہ صدی مکمل طور پر تغیر و تبدل کی صدی رہی ہے اور خالص ادبی و اور لسانی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس صدی نے جہاں ایک طرف ادب میں موضوعات کی سطح پر تبدیلیوں کے امکانات پیدا کیے وہیں دوسری طرف اردو زبان میں صحافت کی ابتداء کا سبب بھی بنی۔ اردو صحافت کی ابتدا، تشکیل اور نشو نما اسی صدی میں ہوئی۔ اردو صحافت کا نقش اولیں ''جام جہاں نما'' کی شکل میں نظر آتا ہے جو ۱۸۲۲ء میں اردو کے لسانی مرکز سے دور کلکتہ میں نمودار ہوا۔

اردو صحافت کے فروغ میں مختلف بلاد و شہور کا بہت ہی اہم کردار رہا ہے۔ ان میں ایک نام لکھنؤ کا بھی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی مختلف ادوار کو پیش نظر رکھ کے اردو زبان و ادب کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''جیسے پندرھویں تا سترھویں صدی دکنی اردو ادب کی صدی ہے، اور اٹھارویں صدی مغلیہ سلطنت کے مرکز دہلی کی صدی رہی ہے، اسی طرح انیسویں صدی دہلی کے ساتھ بیشتر لکھنؤ کی صدی ہے۔''[1]

لکھنؤ اردو زبان و ادب اور تہذیب و تمدن کا ایک اہم مرکز رہا ہے۔ یہاں کی سماجی و ادبی فضا نے اردو زبان کو بہت سے اہم فن کار، خدمت گار اور صحافی دیے ہیں۔ لکھنو میں اردو صحافت کی ابتداء ۱۸۴۷ء میں 'لکھنؤ اخبار' سے ہوئی جسے لال جی نے جاری کیا تھا لیکن اس کے

Scanned with CamScanner

متعلق زیادہ معلومات ہمیں میسر نہیں ہیں۔اس کے کچھ عرصہ بعد ۱۰ر جولائی ۱۸۵۶ء کو محمد یعقوب فرنگی محلی نے ایک اخبار ''طلسم لکھنؤ'' کے نام سے جاری کیا۔یہ آٹھ صفحات پر مشتمل ہفت روزہ اخبار تھا۔اس میں دو کالم ہوا کرتے تھے،ابتدائی دو تین صفحات مقامی خبروں کے لیے مختص تھے باقی پانچ چھ صفحات ملکی اور غیر ملکی خبروں کے لیے صرف کیے جاتے تھے،جو فارسی اور انگریزی اخبارات کی خبروں سے ماخوذ ہوتی تھیں۔جس زمانے میں یہ اخبار وجود میں آیا وہ اودھ کی ضبطگی اور نواب واجد علی شاہ کی معزولی کا زمانہ تھا چونکہ ''طلسم لکھنؤ'' ایک قوم پرست اور سیاسی اخبار تھا۔لہٰذا اس نے بڑی بے باکی اور جراءت مندی کے ساتھ انگریزوں کی حکمت عملی کی مخالفت کی۔مثال کے طور پر ۶ر فروری ۱۸۵۷ء کی خبر کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔:

> ''جس دن سے شہر میں عمل انگریزی ہے بدمعاشوں کی بن آئی ہے۔جعل سازی ہے فتنہ انگیزی ہے چنانچہ محلات اور بیگمات پر نالشیں محکمہ دیوانی اور فوج داری میں دائر ہوئیں۔چپراسیوں نے ڈیوڑھیوں پر جا کے ہنگامے اٹھائے ،حکومت جدید کے رعب بٹھائے۔پہلے زہرہ محل صاحبہ کی مغلانی کو عدالت میں بلایا تھا اب یہ صورت ہے کہ ہر برقنداز چپراسی بات بات پر ڈیوڑھیوں پر آتے ہیں۔کڑی نرم سناتے ہیں۔[۲]

محولہ بالا اقتباس سے اخبار کی بے باکی کا اظہار تو ہوتا ہی ہے ساتھ ہی لکھنو کی مخصوص تہذیب ، اسلوب اور زبان کا بھی انعکاس ہوتا ہے۔''طلسم لکھنؤ'' کے کچھ عرصہ بعد ۱۷ر نومبر ۱۸۵۶ء کو ایک اور ہفت روزہ اخبار ''سحر سامری'' جاری ہوا جو ابتداء میں امیر مینائی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔اس میں بھی 'طلسم لکھنؤ' کی طرح مقامی خبروں کے علاوہ ملکی اور غیر ملکی خبریں شائع ہوتی تھیں۔یہ اخبار نواب واجد علی شاہ کا بڑا دلدادہ اور حامی تھا اسی لیے بالخصوص نواب واجد علی شاہ کے تعلق سے زیادہ خبریں شائع ہوتی تھیں۔مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یہ اخبار موجودہ عہد کے لکھنو کی اقتصادی،سماجی اور ثقافتی زندگی کا ترجمان تھا۔خبر کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

Scanned with CamScanner

''ابھی تک ملکہ فرنگ مصروف سیر شکار ہیں۔ مسافران لندن محو انتظار ہیں۔ مگر تیر مدعا نشانے کے قریب تر ہے۔ ملکہ فرنگ کی شکار سے جلد پلٹنے کی خبر ہے۔ بڑے بڑے انگریز جلیل الشان، اونچی اونچی کچہری، پارلیمنٹ کے ارکان ہم زبان ہیں کہ داد گستر کے آنے تک تیغ انصاف کو جوہر نہاں ہیں۔ ادھر ملکہ شکار سے پھریں ادھر برگشتہ طالعوں کے دن پھر جائیں گے، جتنے ستارے گردش کے ہیں، اشک ندامت کی طرح چشم فلک سے گر جائیں گے پھر وہی بادشاہ اودھ کا دور دورہ ہوگا۔ وہی حشمت کا انداز، وہی سلطنت کا ظہور ہوگا۔''[۳]

''سحر سامری'' کے حوالے سے امداد صابری نے لکھا ہے کہ ایک اخبار ''مخزن الاخبار'' کے نام سے نکلتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور اخبار لکھنو میں ''اعجاز'' کے نام سے جنوری ۱۸۵۷ء میں جاری ہوا۔[۴] ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ماحول سازی اور اس تحریک کو ملک گیر بنانے میں دیگر سماجی و سیاسی عوامل کے ساتھ ساتھ جن اخبارات نے اپنی خدمات انجام دیں ان میں دیگر شہروں اور صوبوں سے نکلنے والے اخبارات کی طرح 'طلسم لکھنؤ' اور 'سحر سامری' نے بھی ایک اہم رول ادا کیا اور آخر کار انگریزوں کے عتاب کا شکار ہو کر زیادہ تر اخبارات کی طرح ان کو بھی بند کر دیا گیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے قبل مذکورہ بالا پانچ اخبارات کا ذکر ہمیں ملتا ہے جن میں صرف دو کے متعلق ہی تفصیل ملتی ہے۔ ۱۸۵۷ء سے قبل لکھنؤ سے زیادہ تعداد میں اخبارات شائع نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ:

''لکھنؤ جیسے تہذیبی و ادبی مرکز میں اردو صحافت کی روایت ۱۸۵۷ء سے قبل اس لیے مستحکم نہ ہو سکی کہ ۱۸۴۹ء میں ایک کتاب کی اشاعت نواب اودھ کو ناگوار گزری جس کے بعد وہاں ہر قسم کی کی طباعت پر پابندی عائد کر دی گئی تھی۔''[۵]

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد لکھنؤ سے جاری ہونے والے اخبارات کی ایک طویل فہرست ہے۔ لہٰذا انفرادی طور پر طوالت کو ملحوظ رکھتے ہوئے، سب کا جائزہ لینا یہاں ممکن

Scanned with CamScanner

نہیں ہے اس لیے سہولت کی خاطر یہاں صرف نمائندہ اخبارات کا ہی ذکر تفصیل سے کیا جائے گا ان میں بالخصوص 'نظم' اخبار کے تجزیاتی مطالعے کو مرکزیت حاصل رہے گی۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد لکھنؤ سے نکلنے والا پہلا اردو اخبار "اودھ اخبار" جسے منشی نول کشور نے جنوری ۱۸۵۹ء میں اپنے قائم کردہ پریس مطبع نول کشور سے جاری کیا۔ ابتداء میں یہ ہفت روزہ تھا بعد میں ہفتے میں تین مرتبہ اور دو مرتبہ شائع ہونے لگا اور آخر کار ۱۸۷۷ء میں روزنامہ ہو گیا، یہ اردو کا پہلا روزنامہ اخبار تھا۔[۶] اس میں قومی اور بین الاقوامی خبروں کے علاوہ ادبی و تاریخی مضامین کے ساتھ ساتھ فارسی و اردو کا کلام نیز کتابوں پر تبصرے بھی شائع ہوتے تھے۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار کا مشہور زمانہ ناول 'فسانہ آزاد' جسے لکھنوی تہذیب و تمدن کا ترجمان بھی تصور کیا جاتا ہے، پہلی مرتبہ اسی اخبار میں قسط وار شائع ہوا۔ اس اخبار نے مصلحتاً ابتدا میں انگریزوں کی حمایت کی لیکن آہستہ آہستہ جب اخبار کے بند ہونے کا خدشہ جاتا رہا تو اس نے بھی انگریزوں کے ظلم و جبر کے خلاف صدائے احتجاج اپنے بلند کرنا شروع کر دیا لیکن اس کی آواز میں وہ بلند آہنگی نہیں تھی جو دیگر اخبارات کے مزاج و میلان کا خاصہ تھی۔ مثال کے طور پر ایک خبر ملاحظہ ہو جس میں ایک انگریز حاکم کے ذریعے مختار کی ذلت کا حال بیان کرتے ہوئے ہندوستانیوں کو غیرت دلائی گئی ہے:

> "ممالک مغربی کے ایک حاکم صاحب بہادر نے ایک مختار کی جو جوتا پہن کر صاحب بہادر کی حضور میں حاضر ہوا تھا یہاں تک تواضع کی کہ ان ہی جوتوں کو جو وہ پہن کر آیا تھا اس کے پاؤں سے نکلوا کر اس کے سر پر رکھوا دیا اور عرصہ تک کھڑا رکھا اور فرمایا کہاب تم سمجھا کہ ہم اس سے ناراض ہوتے ہیں۔ اگر یہ خبر صحیح ہے اور قوی ہے کہ صحیح ہی ہوگی کیونکہ کئی تحریریں چند صاحبوں کی اس کے مضمن موصول ہوئیں، تو ہم انگریزی جوتے پہننے والے ہندوستانیوں پر سخت افسوس کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہی عزت اس جوتے کی ہے جس کی ہم

تعریف کرتے ہیں، فی الواقع جوتے کی عزت میں تو اب بھی فرق نہیں آیا بلکہ اس کی عزت بدرجہا بڑھ گئی گو ایک انسان کی عزت و آبرو خاک میں ملی۔ بڑی شرم کی بات ہے اور کمال غیرت کا موجب ہے گر اب بھی اس وضع کے تمام رئیس اور وکیل اور مختار متفق ہو کر اس کا استغاثہ نہ کریں۔ پس جیسی عزت یا ذلت ایک شخص کی ہوئی ویسی ہی سب کی ہوئی۔ مناسب ہے کہ اس کا جب تک پورا پورا فیصلہ نہ کر لیں اس وقت تک انگریزی جوتے کو ہرگز نہ پہنیں، ہندوستانی جوتے نہیں ہیں، یا وہ اچھے نہ معلوم ہوں تو ننگے پاؤں پھریں۔'' ؎

'اودھ اخبار' ان خوش نصیب اخبارات میں سے ہے جس کو منشی نول کشور جیسا ادب دوست مالک ملا اور جس سے مولانا عبدالحلیم شرر، پنڈت رتن ناتھ سرشار، یاس یگانہ چنگیزی، دوارکا پرشاد افق، منشی پریم چند، شوکت تھانوی اور مرزا محمد عسکری جیسی مشہور و معروف علمی و ادبی ہستیاں منسلک رہیں۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو 'اودھ اخبار' سماجی، سیاسی اور ادبی قدروں کا ترجمان تھا۔ اس نے اردو ادب و صحافت کی بے پایاں خدمت انجام دی۔

انیسویں صدی کے ربع آخر میں اردو صحافت کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز پنچ اخبارات سے ہوا، جس کے زیر اثر ڈاکٹر طاہر مسعود کے مطابق ۲۸ شہروں سے تقریباً ۷۰ اخبارات منظر عام پر آئے۔[۱۸] اسی سلسلے کی ایک کڑی لکھنؤ کا 'اودھ پنچ' اخبار تھا جو دیگر پنچ اخبارات میں سب سے ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ اودھ پنچ ۱۸۷۷ء میں جاری ہوا۔ اس کے مالک اور مدیر منشی سجاد حسین تھے۔ یہ ابتداء میں آٹھ صفحات پر مشتمل تھا بعد میں بارہ صفحات پر شائع ہونے لگا۔ اردو نثر کے حوالے سے سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اس کے ذریعے با قاعدہ طور پر اردو نثر میں طنز و مزاح کی داغ بیل پڑی۔ اس اخبار نے اپنے لکھنے والوں کے ذریعے مغرب پرستی اور مغربی تہذیب کی کورانہ تقلید کے نتیجے میں برآمد ہونے والے نقصان دہ نتائج سے آگاہ کیا۔ ہندوستان پر انگریزوں کے برسرِ اقتدار کے بعد اردو ادب میں طنز و مزاح کے جتنے بھی فن پارے وجود میں آئے ان

Scanned with CamScanner

کے خالقوں نے مغربی تہذیب کی کورانہ تقلید کی مخالفت کی۔ وہ ترقی کے خلاف نہ تھے بلکہ ہندوستانی تہذیب کے پیروکار اور دلدادہ تھے۔لہٰذا ان شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں نے ان سبھی تحریکات اور اشخاص کو اپنی تحریروں میں طنز و تشنیع کا نشانہ بنایا جو مغربی تہذیب کے حامی اور پیروکار تھے۔'اودھ پنچ' نے بھی مغربی تہذیب، علی گڑھ تحریک اور سرسید کی کھل کر مخالفت کی۔ مثال کے طور پر ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''ٹھیک ہینڈ کرتا ہوں میں اس ریفارمر سے دنیاوی ترقی حاصل کرنے کی غرض سے، عہد کرتا ہوں کہ تجاوز نہ کرونگا ایک قدم بھی اس راستے سے جو راستہ میرا ریفارمر مجھے بتلائے (چاہے وہ جہنم کا راستہ ہو) نہ واسطہ رکھوں گا دین اور ایمان اور کل مذہبی خیالات سے کسی طرح۔ مقدم سمجھوں گا خوشنودی یورپ والوں کی، خدا کی خوشنودی پر، تعمیل کرونگا ان کے احکام کی، احکام الٰہی کو چھوڑ کر، نہ فرق کرونگا حلال و حرام میں، قولاً ہو یا فعلاً، نہ گرد پھٹکوں گا ان پرانے ڈھکوسلوں کے جن کو فرض، واجب یا سنت مستحب کہتے ہیں..... جھٹلاؤں گا حدیثوں کو..... باطل سمجھونگا اس کلام کو جس کو نادان اللہ کا کلام کہتے ہیں۔ حقیر سمجھوں گا ان لوگوں کو جو پابند ہوں گے مذہب کے..... پلٹا دوں گا قرآن و حدیث کے معنی کو..... اے میرے ریفارمر! اگر لڑکھڑائیں میرے قدم ان راہوں پر چلتے ہوئے تو انجام میرا ہو ساتھ پرانی روشنی والوں کے اور نہ نصیب ہو مجھ کو اس پاک چیز کا جو بکسوں میں بند ہو کر ولایت سے آتی ہیں۔۹

مندرجہ بالا اقتباس سے 'اودھ پنچ' کے مزاج اور مقصد کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ اس اخبار نے صحافت کے ساتھ زبان و ادب کو بھی فروغ دیا۔ لکھنو سے ایک اور طنزیہ اخبار 'سرپنچ ہند' ۱۵ر ستمبر ۱۸۷۷ء میں جاری ہوا ۱۰۔ یہ ایک ہفت روزہ آٹھ صفحات پر مشتمل اخبار تھا۔ اس کے مدیر اور مالک منشی انبکا پرشاد تھے۔ یہ اپنے مزاج اور خدوخال کے لحاظ سے دیگر ہم

Scanned with CamScanner

عصر اخبارات سے مماثل تھا۔ صرف ایک چیز تھی جو اس کو منفرد بناتی تھی وہ اس میں شائع ہونے والے کارٹون تھے جو اس وقت کے سماجی اور تہذیبی تغیرات پر طنز کرتے دکھائی دیتے تھے۔ اس کے علاوہ لکھنو سے نکلنے والے طنزیہ و مزاحیہ اخبارات میں 'انڈین پنچ' (ار مئی ۱۸۸۰ء)، 'شوخ اودھ' (۲۳ر مئی ۱۸۸۲ء)، 'مہر ظرافت' (ار ستمبر ۱۸۸۲ء)، 'سلطان الظرفا' (مہر جنوری ۱۸۸۳ء)، 'لکھنؤ پنچ' (۸ر جنوری ۱۸۸۳ء)، 'محشر' (ار جولائی ۱۸۸۴ء)، 'قیامت' (ار جنوری ۱۸۸۵ء)، 'زندہ دل' (۵ر جنوری ۱۸۸۶ء) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مذکورہ بالا سیاسی، سماجی اور طنزیہ و مزاحیہ اخبارات کے علاوہ بہت سے ایسے اخبارات اور رسائل بھی تھے جو مختلف انجمنوں، مذہبی عقائد اور مخصوص موضوعات کے تحت شائع ہوتے تھے اور مکمل طور پر انھیں کے ترجمان ہوا کرتے تھے۔ انجمنوں کے زیر اہتمام شائع ہونے والے اخبارات اور رسائل میں 'انجمن ہند' جو 'انجمن ہند' کے زیر اہتمام شائع ہوتا تھا اور جس کا اجرا ۱۸۶۲ء میں ہوا یہ ایک ہفت روزہ اخبار تھا۔ اس کے مہتمم منشی پیارے لال تھے، علاوہ ازیں 'مرقع تہذیب لکھنؤ' پندرہ روزہ اخبار تھا جو ار اکتوبر ۱۸۷۳ء کو جاری ہوا اور جو انجمن تہذیب لکھنؤ کی جانب سے شائع ہوتا تھا۔ مخصوص موضوعات کے تحت شائع ہونے اخبارات میں 'منبع الاحکام' اور 'جامع الاحکام' قانون سے متعلق اخبارات تھے جن میں عدالتوں کے فیصلے اور قانون سے متعلق خبریں شائع ہوتی تھیں۔ ان کے علاوہ مذہبی عقیدوں کے ترجمان اخبارات جیسے اخبار الاخیار، امامیہ، آثار الامصار، رفیق نسواں وغیرہ جیسے اخبار کسی خاص عقیدیا ور مذہب کی اشاعت کے مقصد سے شائع کیے جاتے تھے۔

انیسویں صدی کے اخبارات پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں تو ایک بات نمایاں طور نظر آتی ہے وہ یہ کہ زیادہ تر اخبارات کے مالک اور ایڈیٹر غیر مسلم نظر آتے ہیں اس کی بہت وجہیں ہو سکتی ہیں لیکن فوری طور پر ہمیں جو وجہ نظر آتی ہے وہ اردو زبان کا جادو ہے جو کسی مذہب اور خطے تک

Scanned with CamScanner

محدود نہیں تھا بلکہ پورے ملک پر یکساں طور پر اثر انداز تھا اور آج بھی ہے۔

اردو صحافت کے فروغ میں غیر مسلم صحافیوں کا بہت اہم کردار رہا ہے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی ملک الشعراء منشی دوارکا پرساد افق ہیں جو ایک زود گو شاعر اور متنوع و ہمہ جہت فنی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ وہ بیک وقت شاعر، نثر نگار، مترجم اور صحافی بھی تھے۔ افق نے نظم و نثر کی شکل میں ایک گراں مایہ سرمایہ اردو ادب کو عطا کیا ہے۔ افق کی نثری اور شعری خدمات سے قطع نظر صحافت کے میدان میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ 'نظم' اخبار ہے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے اردو صحافت کا سب سے منفرد و یکتا اخبار تھا۔ اس کی سب سے بڑی انفرادیت خود اس کا منظوم ہونا ہے۔ منظوم اخبار کی روایت پر نظر ڈالیں تو نظم' اخبار اردو کے آسمان پر واحد درخشاں ستارے کی صورت میں نظر آتا ہے۔

منشی دوارکا پرساد افق کا تعلق علم و ادب سے شغف رکھنے والے خاندان سے تھا۔ ان کے دادا، والد اور بھائی سبھی شاعر تھے۔ افق نے بھی موزوں طبیعت پائی تھی۔ نتیجتاً افق کی فنی صلاحیتیں نثر سے زیادہ نظم کی شکل میں نظر آتی ہیں راماین منظوم، راماین یک قافیہ اور سوانح گرو گوبند سنگھ منظوم وغیرہ اس کی بین دلیل ہیں۔ افق کے خاندان میں صحافت کی روایت پہلے سے موجود تھی۔ ان کے والد منشی پورن چند ذرہ ہفت روزہ اخبار 'تمنائی' کے بانی اور مالک تھے اور ان کے بڑے بھائی منشی رام سہائے تمنا اس کے مدیر تھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایک ماہنامہ رسالہ بھی 'گلدستہ سخن' کے نام سے ۲۴ر جولائی ۱۸۷۶ء میں جاری کیا۔ خاندانی ماحول و روایت نے افق میں بھی ادب و صحافت سے دلچسپی پیدا کر دی لہٰذا ان کی تخلیقات و نگارشات وقتاً فوقتاً اس دور کے نمائندہ اخبارات، 'اودھ اخبار'، 'اودھ پنچ'، 'بھارت پرتاپ' اور 'زمانہ' میں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ 'نظم' اخبار کے علاوہ افق پنجاب سماچار اور دھرم سجیون کے مدیر بھی رہے۔ مسعود حسن رضوی ادیب دوارکا پرشاد افق کی ہمہ جہت شخصیت اور شعری و ادبی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جناب افق نے مختلف حیثیتوں شعر و ادب کی

Scanned with CamScanner

بڑی خدمت کی ،وہ کئی اخباروں کے ایڈیٹر
رہے۔کئی ناولیں تصنیف کیں ،کئی مختصر سوانح
عمریاں لکھیں ،رسالوں میں مضامین شائع کیے
۔گیت بنائے ،ڈرامے لکھے۔اہم کتابوں کا اردو
میں ترجمہ کیا اور خاص طور پر شاعری میں بہت
شہرت حاصل کی۔انھوں نے غزل سے زیادہ نظم
کی طرف توجہ کی وہ تمام اصناف سخن پر قادر تھے اور
ان کی نظموں کا میدان بہت وسیع تھا۔ان کا نظم
اخبار جو تقریباً تمام وکمال نظم میں ہوتا تھا،ان کی پر
گوئی اور زود گوئی کا شاہد ہے۔ان کا تصنیفی سرمایہ
مقدار و معیار دونوں حیثیتوں سے قابل قدر
ہے۔"[11]

افق نے اپنی ادارت میں 'نظم' اخبار ۱۸۸۸ء میں جاری کیا جو لکھنؤ پریس سے شائع ہوتا تھا۔اس کے معاون مدیران کے بڑے بھائی منشی رام سہائے تمنا تھے۔یہ بارہ صفحات پر مشتمل پندرہ روزہ اخبار تھا۔ابتدائی آٹھ صفحات کی خبریں منظوم اور باقی چار منثور ہوتی تھیں۔صفحہ اول کے سرنامے پر یہ شعر درج ہوتا تھا :

اے تمنائے تمنا و
تمنائے افق
گشت نظم اخبار مہر
عالم آرائے تمنا

اس کے بعد اسی صفحہ پر ایک طویل مثنوی نما نظم شائع ہوتی تھی جس سے اخبار کی

Scanned with CamScanner

پالیسی اور اغراض و مقاصد کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں

ہے شکر اس خالق عالی صفت کا
مصنف ہے جو بند شش جہت کا
مچا دے افتخار نظم دھوم
دکھا دے جلوہ اخبار منظوم
مہینے میں ہو جو جوش نظم دوبارہ
بنے ماہ دو ہفتہ جس میں اخبار
ہر انداز کے مضموں ہوں اس میں
مطالب نثر کے موزوں ہوں اس میں
ملے غافل جو محو خواب آرام
تو یہ پانی کے چھینٹے کا کرے کام
خبر کے واسطے یہ تار ہو جائے
گلوئے علم و فن کا ہار ہو جائے
بڑھا تاریخ سے توقیر اشعار
رقم کر بے بدل منظوم اخبار

'نظم' ایک سماجی، سیاسی اور ادبی اخبار تھا۔ سیاسی سرگرمیوں اور ادبی محفلوں کے متعلق خبروں کے علاوہ کلام اور ان پر تبصرے بھی شائع ہوتے تھے۔ ۵/ مارچ ۱۸۹۰ء کے شمارے میں شاہ کابل کے ہندوستان آمد اور لارڈ گورنر سے ملاقات کرنے پر اخبار نے یہ منظوم خبر شائع کی تھی :

خبر مشہور کرتے ہیں یہ اخبار
کہ یاں آئے گا پھر کابل کا سردار
جو ملنا لاٹ صاحب سے ہے منظور

Scanned with CamScanner

تو ہوگا تخت گاہے خاص سے دور

ذرا اے ہند تو ہشیار ہو جا

ٹکس کے واسطے تیار ہو جا

ٹکس صاحب کے بانی آئیں گے پھر

خزانے دیشیوں کے جائیں گے پھر

نہ افلاس و ناداری سے خائف

خزانے کھول دے بحر تحائف

مہیا ساز و سامان حشم کر

مسافر مہمانی کے بہم کر

نہ کر پرواہ اگر ہو زر یاری

نہ گھبرا جو ہو حالت غم کی طاری

لگا دے گھر میں پھر صراف کے آگ

لنگوٹی میں ذرا پھر کھیل لے پھاگ

سباب آخرت ہے میزبانی

حج اکبر ہے صرف ایک مہمانی

مندرجہ بالا خبر میں شعری پیرایہ اظہار کی شکل میں اس وقت کے سرکاری اور معاشی پالسی کے جائزے کے ساتھ ساتھ اس پر طنز بھی کیا گیا ہے۔ کاٹھیاواڑ کے ڈاکوؤں کے ذریعے کئے گئے جرائم کی خبر کو اس طرح منظوم کیا گیا ہے :

عجب سرکش ہیں اس خطے کے ڈاکو

بجا ہے گر کہیں ان کو ہلاکو

ہیں ان کے شور و شر کے زیر شہزور

Scanned with CamScanner

کسی کے رعب سے دبتی نہیں کور
جفا کاری سے باز آتے نہیں ہیں
سدا محو دل آزاری یہ ہیں
کیا اہل پولیس کو حال میں تنگ
دکھا کر جوہر شمشیر کی جنگ

مندرجہ بالا منظوم خبروں کے علاوہ 'نظم' اخبار کے باقی چار صفحات جو منثور شکل میں شائع ہوتے تھے ان میں بھی منظوم خبروں کی طرح سیاسی، سماجی اور وطن کی آزادی اور جدوجہد سے متعلق خبریں شائع ہوتی تھیں۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ نظم اخبار کا ایک بڑا مقصد ہندوستانیوں کو بیدار کر کے ان میں آزادی کا شعور اور جوش بھرنا تھا۔ اسی سلسلے کی ایک منثور خبر ملاحظہ ہو جو ۱۵ر ستمبر ۱۸۸۸ء کو دہلی میں منعقدہ کانگریس کے جلسے سے متعلق ہے :

"۱۰ر ستمبر ۱۸۸۸ء کو دہلی میں ایک بہت بڑا جلسہ نیشنل کانگریس کا ٹاؤن ہال میں منعقد ہوا جس میں خواجہ علی محمد، بھیم جی رئیس بمبئی اور جناب مرلی دھر صاحب وکیل انبالہ اور جناب امراؤ مرزا صاحب نے نہایت عمدہ اور مفید اسپیچ میں بیان فرمایا۔ حضرین نہایت خوش ہوئے اور بڑی بڑی تعریفیں ہوئیں خیالات مخالفانہ کی جڑ کٹی۔ ان تینوں اسپیکروں کی لیاقت اور فصاحت وغیرہ کی عالم میں دھوم مچ گئی۔ چیئرس پر چیئرس ہوتے تھے جناب حیرت صاحب نے ایک درد انگیز نظم پڑھی جس پر نعرہ تعریف بلند ہوتے تھے۔ اس

Scanned with CamScanner

جلسے میں تقریباً ایک ہزار معزز ہندو اور پانچ سو
باعزت مسلمان اور ۱۲ یورپین موجود تھے
۔جناب شیخ حفیظ اللہ صاحب میونسپل کمشنر اس
جلسہ کے چیئرمین تھے۔ہم ہمدردان ملک کو اس
جلسہ کی کامیابی کے لیے مبارکباد دیتے ہیں۔''۱۲

محولہ بالا خبر سے اخبار کی حب الوطنی کا انداہ لگایا جاسکتا ہے۔زبان بھی سادہ اور عام فہم ہے جو بڑی بات ہے کیونکہ اس دور میں لکھنؤ میں رہ کر ایسی زبان استعمال کرنا آسان نہ تھا ۔لیکن افقؔ اس بات ست آگاہ تھے کہ اپنی بات زیادہ سے زیادہ لوگوں اور عوام تک عام فہم زبان کے ذریعے ہی پہنچائی جاسکتی ہے۔نظم ایک مقبول خاص وعام اخبار تھا اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد بھی تھا یہی وجہ ہے کہ اس دور کے اخبارات نے اس کی خاطر خواہ پزیرائی کی۔'آگرہ اخبار' نے اپنے ۵ر فروری ۱۸۹۰ء کے شمارے میں 'نظم' اخبار کا منظوم تجزیہ اس طرح کیا :

شکر صد شکر کہ پھولی چمنستاں میں بہار
صفحہ کاغذ کا بنا تختہ خط گلزارا
مرحبا فرقہ تعالی ارباب دیار
سنئے گلشن سے ذرا زمزمہ ہود ہزار
واہ کس رنگ سے گلزار سخن پھل لایا
نظم اخبار نہ تھا ہند میں وہ بھی آیا
ہیں تمنا وافقؔ زمزمہ پیرا اسکے
ایسا اخبار نہ دیکھا نہ سنے یہ نغمے
مشق اول کے ورق ہیں کہ سخن کے چربے
حق تعالیٰ نظر بد سے بچائے رکھے

Scanned with CamScanner

کونپلیں پھوٹی ہیں، نخل سخن اردو میں
پھول پھیلے ہوئے دیکھو چمن اردو میں

افق کی شاعرانہ طبیعت کے علاوہ نظم اخبار کے منظوم ہونے کی دو وجوہات سمجھ میں آتی ہیں۔ پہلی تو یہ کہ جس دور میں یہ اخبار وجود میں آیا وہ لکھنو میں شاعرانہ نزاکتوں اور مقفیٰ و مسجع اور پر تکلف زبان (جو شاعری کا ہی لطف دیتی ہے) کا دور تھا اور شاعری لوگوں کے مزاج اور خون میں رچ بس چکی تھی لہٰذا منشی دوارکا پرشاد افق نے عوام کی پسند اور مزاج کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس اخبار کو منظوم شکل میں نکالنے کا فیصلہ کیا ہوگا۔ دوسری وجہ جو اس سے بھی قوی نظر آتی ہے وہ نئی نظم یا جدید نظم کی تحریک سے وابستہ ہے۔ ۱۸۷۴ء میں انجمن پنجاب کے زیر اہتمام آزاد اور حالی کی کوششوں سے طرحی مشاعروں کی جگہ جس قسم کے مناظموں کا آغاز ہوا اسے نئی نظم کی تحریک کا نام دیا جاتا ہے۔ تحریک کے آغاز سے ہی اس کی مخالفت اور موافقت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور رفتہ رفتہ یہ تحریک مثبت اور منفی دونوں اعتبار سے ملک گیر سطح پر مشہور ہو گئی۔ ہو سکتا ہے افق اس تحریک سے متاثر ہوئے ہوں جس کے زیر اثر 'نظم' اخبار وجود میں آیا۔ حالانکہ ان وجوہات کے شواہد نظر سے نہیں گذرے لیکن ہر فن کار اپنے عہد کے سیاسی، سماجی اور ادبی حالات سے متاثر ضرور ہوتا ہے۔ وجہ چاہے جو رہی ہو لیکن 'نظم' اخبار کی اولیت اور افضلیت منظوم ہونے کی حیثیت سے مسلم ہے۔

حواشی:

۱۔ تاریخ ادب اردو جلد سوم از جمیل جالبی، ص ۱۵، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۱۲ء
۲۔ اردو صحافت انیسویں صدی میں از طاہر مسعود، ص ۳۱۱، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۰۹ء
۳۔ [سحر سامری' اردسمبر ۱۸۵۶ء بحوالہ اردو صحافت انیسویں صدی میں از طاہر مسعود، ص ۳۱۷، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۰۹ء
۴۔ تاریخ صحافت اردو جلد اول از امداد صابری، ص ۵۲۵ و ۵۳۵، دہلی ۱۹۵۳ء
۵۔ اردو صحافت انیسویں صدی میں از طاہر مسعود، ص ۷۷۰، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس

Scanned with CamScanner

،دہلی ۲۰۰۹ء
۶۔ ایضاً ص ۹۹۵
۷۔ 'اودھ اخبار' ۶ر مارچ ۱۸۷۶ء بحوالہ تاریخ صحافت اردو جلد دوم از امداد صابری، ص ۶۱، دہلی
۸۔ اردو صحافت انیسویں صدی میں از طاہر مسعود، ص ۹۳۷، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ،دہلی ۲۰۰۹ء
۹۔ 'اودھ پنچ' لکھنؤ ۱۰ر جولائی ۱۸۸۳ء بحوالہ اردو صحافت انیسویں صدی میں از طاہر مسعود، ص ۹۴۵۔۹۴۶، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۰۹ء
۱۰۔ اردو صحافت انیسویں صدی میں از طاہر مسعود، ص ۹۹۵، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ،دہلی ۲۰۰۹ء
۱۱۔ مسعود حسن رضوی ادیب بحوالہ مضمون اردو کے چند ممتاز ہندو شعرا اور ان کی خدمات از ویریندر پرشاد سکسینہ، بشمولہ نیا دور لکھنؤ، ص ۴۰۔۴۱ جلد ۳۶، شمارہ نمبر ۲، مئی ۱۹۸۱ء
۱۲۔ 'نظم' ۲۰ر ستمبر ۱۸۸۸ء بحوالہ تاریخ صحافت اردو جلد سوم از امداد صابری، ص ۵۴۵۔۵۴۶، دہلی ۱۹۶۲ء

☆☆☆

محمد افضل
ریسرچ اسکالر
شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد
موبائل نمبر۔09696962678
ای میل۔urduomania@gmail.com

Scanned with CamScanner

"وتفقد الطیر فقال مالی لا اری الھدھد ام کان من الغائبین لاعذبنہٗ عذابا شدیدا اولا ذبحنہٗ او لیاتینی بسلطن مبین فمکث غیر بعید فقال احطت بمالم تحط بہ وجئتک من سبابنبایقین"

(سورۃ نمل، آیت ۲۰ تا ۲۲)

(اور پرندوں کا جایزہ لیا تو بولا مجھے کیا ہوا کہ میں ھد ھد کو نہیں دیکھتا یا وہ واقعی حاضر نہیں۔ ضرور میں اسے سخت عذاب کروں گا یا ذبح کر دوں گا یا کوئی روشن سند میرے پاس لائے تو ھد ھد کچھ زیادہ دیر نہ ٹھہرا اور آ کر عرض کی کہ میں وہ بات دیکھ آیا ہوں جو حضور نے نہ دیکھی اور میں شہر سبا سے حضور کے پاس ایک یقینی خبر لایا ہوں۔)

چیونٹی چیونٹے کی سرگوشیاں بھانپ لینے والے پیغمبر حضرت سلیمان غضبناک ہو کر بولے کہ اے ھد ھد کہاں غائب ہے؟ آنے تو دو اچھی خبر لوں گا اس کی۔ مگر یہ کہ وہ مجھے کوئی اہم بات بتائے۔ اتنے میں ھد ھد حاضر ہوتا ہے اور نہایت عجز و انکساری اور ادب و تواضع کے ساتھ معافی چاہ کر یہ کہکر ان کا غصہ ٹھنڈا کر دیتا ہے! جناب والا میرے پاس ایسی خبر ہے کہ جس سے سرکار بھی لاعلم ہیں۔

حضرت سلیمان و ھد ھد کا قصہ ہمیں بتاتا ہے کہ خبر، اخبار کی کیا حیثیت تھی اور بڑے بڑے فرماں روا بھی اس کے محتاج و نیاز مندوں میں سے تھے۔

اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ خبر جوئی و خبر رسائی کا سلسلہ ابتداً آفرینش سے کم و بیش موجود رہا ہے پرچہ نویسی، وقایع نگاری، روزنامچہ نویسی ہر عہد میں نظم زندگی کا لازمی عنصر رہے ہیں۔

Scanned with CamScanner

چھاپا خانہ کی ایجاد کے پہلے خبر رسانی کا طریقہ زبانی و قلمی تھا اس کے بعد رفتہ رفتہ اس نے طباعت کا وسیلہ اپنایا تو ''اخباری خطوط'' سے یہ سلسلہ شروع ہوا صحافت لفظ صحیفہ سے نکلا ہے جس کے لغوی معنی کتاب یا رسالہ کے ہوتے ہیں۔ مگر صحافت سے ایک ایسا مطبوعہ مواد بھی مراد لیا جاتا ہے جو مقررہ وقت پر شایع ہوتا ہے اس اعتبار سے اخبار و رسائل کو صحیفہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ورنہ صحافت بنیادی طور پر اخبار نویسی و رسالہ نگاری کے عمل کا نام ہے۔ تازہ خبریں حالات حاضرہ پر تبصرہ اور مختلف قسم کے مضامین جمع کر کے انہیں معین وقت سے شائع کرنا صحافت ہے۔ خبر اور خبر سے متعلقہ مواد کا حصول، جمع کاری، ترتیب و تدوین، تنقید و تبصرہ اور فیچر نگاری کے بعد اخبار رسالہ، ریڈیو، ٹیلی ویژن، قلم و تحریر کے وسیلہ سے اس کی اشاعت و تقسیم ''صحافت'' ہے۔ مختصرا یہ کہ صحافت شب و روز کے حالات کی عکاسی نیز ان حالات کے پس منظر سے ابھرنے والے انسانی نظریات کی ترویج و اشاعت اور حالیہ امور سے متعلق موضوعات کی ترسیل و تبلیغ کا نام ہے۔ مگر اپنے نظریہ کا بگھار دیکر۔

دراصل ہندوستان میں صحافت کا آغاز احتجاج اور بغاوت کے حصول میں ہوا تھا۔ سب سے پہلے مسٹر ولیم بولٹس نے ہندوستان پر فائز ایسٹ انڈیا کمپنی کے بد اطوار، رشوت خور، انصاف دشمن اور سفاک انگریز حکمرانوں کی انسانیت سوز حرکتوں کو طشت از بام کرنے کی غرض سے ایک چھاپا خانہ قایم کر کے خبروں کی اشاعت کا اعلان کیا۔ حکمران طبقہ میں اس اعلان سے تہلکہ مچ گیا اور ولیم بوسٹ کو بالآخر ۱۸۔ اپریل ۱۷۶۸ کو ملک بدر کر دیا گیا، لیکن اس نے انگلستان پہونچنے کے بعد ہندستانی امور پر ۵۰۰ صفحہ پر مشتمل ایک کتاب سپرد قلم کی۔ جس میں ولیم بولٹس نے تحریر کیا:

''ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک میں اب ایسٹ انڈیا کمپنی ایک خود مختار حکمراں بن چکی ہے ملک کی تجارت پر کمپنی کو انتہائی ظالمانہ اور تباہ کن اجارہ داری حاصل ہے لاکھوں انسان چند ایسے بد باطن فرنگیوں کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں جو عوام کو لوٹ

Scanned with CamScanner

کھسوٹ کر ان کی دولت سمجھ کر آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں۔ فوجیوں پر ظلم واستبداد کے باعث ملک مطلق العنانی کا شکار ہو کر رہ گیا ہے۔''

بہر حال ولیم بوسٹ نے انگریز حکام کے خلاف احتجاج کی جو شمع روشن کی تھی اس کی لو ایک دوسرے انگریز جیمس اگسٹس ھکی نے بجھنے نہ دی اور ۲۹ جنوری ۱۷۸۰ء کو ھندوستان کا سب سے پہلا انگریزاخبار ''ھکی گزٹ'' کے نام سے شائع کر کے انگریز حکام کی بداعمالیوں، بد عنوانیوں اور ریشہ دوانیوں کا پردہ چاک کرنے کی مہم شروع کر دی اس کی اس کوشش کے خلاف انگریز حکام نے سخت کاروائی کی۔ عدالت نے ھکی کو چار ماہ قید اور پانچ سو روپیہ جرمانے کی سزا دی۔ اسی طرح ایک دوسرے معاملے میں ھکی کو عدالت نے ایک سال کی قید اور دو ھزار روپئے جرمانے کی سزا دی۔ لیکن ھکی نے ھمت سے کام لیا اور قید و بند میں رہتے ہوئے اپنا اخبار مسلسل جاری رکھا اور انگریز حکمرانوں کی نکتہ چینی کرتا رھا۔ اس پر فرنگی حکمرانوں کے ظلم اور زیادتیاں اتنی بڑھ گئیں کہ اسے مجبوراً اپنا یہ اخبار بند ہی کرنا پڑا۔

یوں تو ''ہکی گزٹ'' کی زندگی بہ مشکل دو برس ھی تھی لیکن اس کی تاریخی اہمیت کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ھے کہ اسی گزٹ نے برصغیر میں بیباک صحافت کی بنیاد رکھی اور ۱۹۴۷ء تک فارسی اور اردو کے علاوہ مختلف زبانوں میں اخبارات نے اس کی پیروی مین تحریک آزادی کے ہر اول دستے کا شاندار کارنامہ سرانجام دیا۔ ھندوستانی صحافت کی تاریخ شاہد ھے کہ برٹش راج کے خلاف جدو جہد پر آمادہ کرنے اور عوامی شعور کو بیدار کرنے میں صحافیوں نے موثر کردار ادا کیا۔ ان میں بعض غداری کے الزام میں قتل ہوئے، جیل گئے اور صعوبتیں برداشت کیں۔

انگریز صحافیوں کے بعد ہندوستان کا سب سے پہلا اخبار ''جام جہاں نما'' ۲۷ مارچ ۱۸۲۲ء کو کلکتہ سے شائع ہوا اس کے مدیر منشی سدا سکھ مرزا پوری تھے یہ اخبار فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔ ابتداء میں اس کے کچھ شمارے ھی اردو میں نکل سکے اس کے بعد اس کو فارسی زبان میں منتقل کر دیا گیا اور پھر ایک سال بعد فارسی اخبار کے ساتھ چار ورقی اردو ضمیمہ

منسلک کیا گیا۔ جو اپنی ایک الگ پہچان رکھتا تھا۔ وہ فارسی اخبار کے ساتھ بھی بکتا تھا اور انفرادی طور پر بھی اس کی مانگ تھی۔ یہ اخبار کم وبیش پانچ سال تجاری رہا اس وقت تک انگریزی صحافت اپنی جڑیں کافی مضبوط کر چکی تھی۔ ملک کے تین بڑے شہر کلکتہ، ممبئی اور مدراس میں انگریزی کے بیسوں اخبار ورسائل نکل رہے تھے۔

''جام جہاں نما'' کے بعد فارسی زبان میں راجہ رام موھن رائے نے ۲۰۔ اپریل ۱۸۲۲ء کو ''مراۃ الاخبار'' کے نام سے ایک اخبار جاری کیا لیکن انہوں نے ''جام جہام نما'' (ہفت روزہ) کی اشاعت کے ایک سال کے بعد ۱۴۔ اپریل ۱۸۲۳ء کو اپنا یہ اخبار ایسٹ انڈیا کمپنی کے پریس ایکٹ ۱۸۲۳ء کے خلاف احتجاج کرتے ھوئے بند کر دیا۔ یہ ایک دلچسپ تاریخی حقیقت ہے کہ ''جام جہاں نما'' کے بعد ادب نواز اور علم دوست غیر مسلم اردو اخبارات نکالتے رہے اور اردو اور فارسی دونوں ہی اخباروں کے پہلے صحافی کا شرف بھی غیر مسلم صحافیوں کو حاصل ہوا۔

اس کے بعد فروری ۱۸۳۱ء کو مولوی سراج الدین نے ''آئینہ سکندری'' کے نام سے فارسی اخبار جاری کیا اس اخبار کو مرزا غالب کا تعاون حاصل تھا۔ آئینہ سکندری میں غالب کی فارسی غزلیں شائع ہوتی تھیں اس اخبار کی اہم خوبی یہ تھی کہ ہر خبر کی سرخی کے نیچے ایک شعر بھی لکھا جاتا تھا۔

واجد علی شاہ نے آگرہ سے ''زبدۃ الاخبار'' کے نام سے ایک اخبار فارسی میں جاری کیا۔ یہ اخبار راجاؤں اور نوابوں کے زیر سرپرستی شائع ہوتا تھا۔ جس کی وجہ سے ''زبدۃ الاخبار'' مالی طور پر خوشحال اخبار تھا واجد علی خان محتاط قسم کے ایڈیٹر تھے وہ اخبار میں حکومت کے مخالف خبر سے گریز کرتے تھے ان کی تحریروں کا اہم مآخذ انگریزی اخبارات تھے۔

''ماہ عالم افروز'' جون ۱۸۳۳ء کو کلکتہ سے شائع ہوا جس کے ایڈیٹر مولوی وھاج الدین تھے۔ اس اخبار میں معلوماتی تحریروں کے علاوہ انگریز افسروں کی جانب سے مقامی

Scanned with CamScanner

آبادی پر ناروا ظلم و جبر کو نمایاں انداز میں شائع کیا جاتا تھا۔

کلکتہ سے ''سلطان الاخبار'' اگست ۱۸۳۵ء کو رجب علی لکھنوی نے جاری کیا۔ شکل وصورت سے یہ اخبار دوسرے ہم عصر فارسی اخبارات سے مختلف نہ تھا لیکن مواد اور انداز تحریر کے اعتبار سے قدرے مختلف تھا اس دور میں جب کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف معمولی خبر نشر کرنا بھی بڑے دل گردے کی بات تھی، سلطان الاخبار بڑی بے باکی اور جرأت کے ساتھ انگریزوں کی چیرہ دستی کے خلاف کلمۂ حق بلند کرتا تھا۔

ایک ہفتہ میں تین بار شائع ہونے والا کلکتہ کا فارسی اخبار ''مہر منیر'' یکم جنوری ۱۸۴۱ء کو محمد علی شاہ نے جاری کیا۔ اس اخبار کی ماہانہ قیمت دو روپیہ تھی جبکہ سہ ماہی چندہ پیشگی ادا کرنے سے اس کی قیمت ایک روپیہ ماہانہ ہو جاتی تھی جو اُس وقت کے اخبارات سے خاصی کم تھی مرزا غالب کی قمار بازی کے جرم میں گرفتاری کو اس اخبار نے افسوس ناک واقعہ قرار دیا تھا۔

''سراج الاخبار'' دہلی کے ہفتہ وار فارسی اخبار کا آغاز ۱۸۴۱ء میں ہوا۔ یہ آخری مغلیہ حکمران بہادر شاہ ظفر کے دربار کا سرکاری گزٹ تھا۔ اس کے صفحات کی تعداد آٹھ ہوتی تھی اخبار کے ابتدائی حصہ میں بادشاہ کے شب و روز کا ذکر ہوتا تھا جب کہ باقی صفحہ پر ملکی اور غیر ملکی خبریں ہوتی تھیں۔

۹ نومبر ۱۸۴۴ء کو ممبئی سے ہفتہ وار فارسی اخبار جاری ہوا جس کا نام احسان الاخبار تھا اس اخبار میں دہلی اور قلعہ معلّیٰ کی خبریں اہتمام سے شائع کی جاتی تھیں۔

اس کے علاوہ کلکتہ میں فارسی کا شائع ہونے والا مشہور و معروف اخبار ''حبل المتین'' ہے یہ اخبار ۱۸۹۳ء میں جاری ہوا۔ اس کے ایڈیٹر سید حسن حبل المتین اور مدیر اعلیٰ شیخ یحییٰ کاشی تھے۔ یہ فارسی اخبار بڑی آب و تاب کے ساتھ جب کلکتہ سے شائع ہوا تو ہندوستان ہی نہیں بلکہ ایران اور دیگر ممالک کے شعراء و ادباء کی نظمیں، غزلیں اور مقالے بھی شائع ہوتے تھے۔ کیوں کہ اس وقت ایران میں ناصر الدین شاہ قاجار کی حکومت تھی اور وہ بہت ہی ظالم بادشاہ تھا۔

Scanned with CamScanner

''حبل المتین'' کی اہمیت وافادیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ایک غیر ہندوستانی سید حسن ملقب مؤید الاسلام نے اس کی بنا ڈالی اور مسلسل ۳۸ سال تک کلکتہ سے شائع ہوتا رہا۔

احمد کسروی ''تاریخ مشروطہ ایران'' میں رقم طراز ہیں کہ:

''این مرد مؤید الاسلام کاشانی است کہ قریب ۳۸ سال در کلکتہ روزنامہ حبل المتین را منتشر کرد''

دوسری جگہ احمد کسروی نے روزنامہ ''حبل المتین'' کو معروف ومشہور قرار دیا ہے کہتے ہیں:

''این نامہ ھفتگی از ھمہ روزھای آن زمان بزرگتر و بہ نامتری بود و در ھندوستان چاپ شدہ۔''

مختصراً فارسی صحافت کی اس خدمت کو جو اس نے انیسوی صدی میں انجام دیا فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

منابع و مآخذ

۱۔ کاروان صحافت: ڈاکٹر عبد السلام خورشید ۱۹۶۴

۲۔ تاریخ مشروطہ ایران: احمد کسروی ۱۳۵۲ش

۳۔ تاریخ بیداری ایرانیان: ناظم السلام کرمانی ۱۳۴۶ش

۴۔ صحافتی زبان: سہیل احمد ۱۹۶۶

۵۔ روزنامہ حبل المتین ۱۹۲۵۔۱۹۲۶

☆☆☆

عابدہ خاتون

ریسرچ اسکالر شعبۂ عربی وفارسی

الہ آباد یونیورسٹی الہ آباد۔211002

Scanned with CamScanner

دوارکا پرشاد افق۔ادب وصحافت کے آئینے میں

منشی دوارکا پرشاد افق ایک نامور اور مشہور ادبی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ان کے آباواجداد دلی کے باشندے تھے اور بقول کول بھٹناگر ''مغل بادشاہ محمد شاہ کی سلطنت میں اچھے عہدوں پر فائز تھے۔بادشاہ کے وفاداروں میں ہونے کی وجہ سے نادر شاہ کے حملے اور اس کے ساتھ ہوئے قتل وغارت میں اس خاندان کے بھی کئی لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔صرف دو نوجوان اس قہر سے بچ نکلے اور ان دونوں بھائیوں نے لکھنؤ کے محلہ نوبستہ میں سکونت اختیار کر لی۔ان بھائیوں میں سے ایک کا نام جگن ناتھ تھا اور دوارکا پرشاد افق جگن ناتھ کی ساتویں پیڑھی کے چشم وچراغ تھے۔''[1]

افق کے گھرانے کا ماحول خالص ادبی تھا۔ان کے خاندان میں فارسی اور اردو شاعری اور نثر نگاری کا سلسلہ کئی پیڑھیوں سے چلا آرہا تھا۔افق کے پردادا، دادا اور والد اور ان کے دونوں بڑے بھائیوں کا شمار فارسی اور اردو کے اچھے شاعروں میں ہوتا تھا۔اس کے ساتھ ساتھ نثر نگاری میں بھی انھوں نے غیر معمولی خدمات انجام دیں۔افق کی ادبی صلاحیت کو چار چاند لگانے والے منشی شنکر دیال فرحت تھے، جو افق کے حقیقی ماموں اور استاد تھے۔ان کے تلمذ کا اثر تھا کہ افق محض ۲۰ سال کی عمر میں اپنا شاہکار 'رامائن منظوم' اور 'رامائن یک قافیہ' پیش کرنے میں کامیاب ہوئے۔ استاد کی مایۂ ناز تعلیم اور خاندان کے خالص ادبی ماحول نے ان کے فن کو بام عروج پر پہنچادیا۔گھر

کے شاعرانہ ماحول اور طبیعت کے مطابق شعر گوئی کے شوق میں مبتلا ہو گئے جس کے زیر اثر شاعری کی جانب رجوع کیا۔ ان کی موزوں طبیعت نے انھیں اس فن میں کمال شہرت بخشی۔ عربی، فارسی، اردو اور ہندی ادب کی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔ اگر ہم یہ کہیں تو غلط نہ ہوگا کہ افق کو ادبی صلاحیت اپنے آباواجداد سے کچھ حد تک ورثے میں ملی تھی۔

اپنی خاندانی روایت کے مطابق اپنے ادبی سفر کا آغاز انھوں نے شاعری سے کیا۔ ان کی شروعاتی دور کی غزلوں پر کلاسکی رنگ خصوصاً امیر مینائی اور داغ کی شاعری کا اثر نمایاں ہوتا ہے۔ پہلے دل اور بعد میں افق تخلص اختیار کیا۔ زبان و بیان اور تغزل کے ساتھ ظرافت بھی ان کی شاعری سے لطف اندوز کرتی ہے۔ انھوں نے اردو شاعری کے جس دور میں آنکھ کھولی وہ آزاد اور حالی کی اصلاحی تحریک کا زمانہ تھا۔ آتش، ناسخ، دیا شنکر نسیم، انیس، دبیر اور مرزا شوق وغیرہ شاعری کے بام عروج پر فائز تھے۔ ان کے کلام میں فصاحت و بلاغت کے ساتھ سادگی اور نئے پن کی خوبیاں بھی جابجا نظر آتی ہیں۔ اسی ماحول میں افق نے بھی اپنی شاعری کا آغاز کیا۔ بعض غزلیں اور اشعار اعلیٰ شاعری کی مثال ہیں۔ لیکن جلد ہی ان کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ ان کی آزاد طبیعت محض غزلوں تک محدود نہیں رہ سکتی چنانچہ اردو شاعری میں آزاد اور حال کی رہنمائی میں چلائی گئی نشاۃ الثانیہ تحریک کا اثر قبول کرتے ہوئی اپنی توجہ غزل سے نظم کی جانب مبذول کی اور خاص طور سے مسدس اور مثنوی کو اپنے فن کے اظہار خیال کے لئے منتخب کیا۔ جس میں انھوں نے مسدس کو صف اول رکھا۔ مسدس سے دلچسپی کے باعث اس صنف میں ان کے قلم نے زیادہ زور پکڑا۔ انھوں نے قومی، مذہبی، اخلاقی، حب الوطنی، درس عمل، خودی، اتفاق، آدمیت، زبان، حسن کی

Scanned with CamScanner

بہار، شراب کی مذمت، پابندی وقت، حسن و عشق، تندرستی، وقت، دروغ گوئی، زر کی تعریف وغیرہ کو اپنی مسدس کے عنوانات کے لئے منتخب کیا۔ جن میں معتبر تاریخی حوالے بھی دئے ہیں۔ انھوں نے اہل وطن اور وطن کی محبت کے جذبے سے بھرپور مسدس لکھے۔ جس نے خواب غفلت سے بے زار ہونے والے محبّ وطن کو اور بھی زیادہ توانائی بخشی۔ 'مسدس افق' اور 'قومی مسدس' اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ جناب رتن پنڈوروی کے اس شعر سے میں اپنی بات کی وضاحت کرتی ہوں کہ

نظم میں بھی تو نے انداز تغزل بھر دیا
شعر کی دنیا میں میر کارواں کہیے تجھے

افق نے بزمیہ، منظریہ، رزمیہ اور مذہبی سبھی طرح کی مثنویاں کہی ہیں۔ ۲۰ برس کی عمر میں ہی ان کا ادبی مایۂ ناز 'رامائن منظوم' اور 'رامائن یک قافیہ' شائع ہو چکی تھی۔ جس میں انھوں نے رامائن کی پوری کہانی کو مثنوی کی صنف میں ایک ہی قافیہ میں بیان کیا ہے۔ یہ ۱۳۰۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کی ایک اور خصوصیت اس کی زبان ہے جو لکھنؤ کی ٹکسالی اردو ہے۔ گرو گوبند سنگھ کی سوانح عمری می بھی انھوں نے مثنوی کی فارم میں لکھی ہے۔ انھوں نے عورتوں کو بھی اپنی مثنویوں کا محور بنایا ہے۔ 'مرقع عورت' اس کی خوبصورت مثال ہے۔ اس کے علاوہ نور جہاں، پدماوتی، شکار میں شکار وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ 'حیات باقی' بھی ان کی ایک بہت عمدہ مثنوی ہے۔ جو مرحوم راجا گردھاری پرشاد باقی رئیس حیدرآباد کے حالات زندگی سے متعلق ہے۔

Scanned with CamScanner

قصیدے کے میدان میں بھی انھوں نے اپنی صلاحیت کا ثبوت دیا ہے۔ان کے قصائد میں بلند تخیل ، زبان کا لطف ،تشبیہات، تلمیحات و استعارات کی خوطصورت مثالیں ملتی ہیں۔لفظوں میں نشست و برخاست اپنی ایک الگ حیثیت رکھتے ہیں۔ان کی رباعیاں بھی بڑی قدر کی حامل ہیں جو کہ ہماری کلاسکی ادب میں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔حضرت امام حسین ایسی شخصیت ہیں جن کے عزادار مختلف رنگ و نسل کے ہیں۔لکھنؤ تو ہندوستانی تہذیب کا مرکز ہے۔ افق نے لکھنؤ کے محرم اور مراسم عزا کو نہ صرف قریب سے دیکھا ہے بلکہ اس میں شریک بھی رہے۔ چوک لکھنؤ کا نوبستہ علاقہ کائستھوں کا مرکز رہا ہے۔یہ لوگ عزاداری، جلوس اور مجلس میں شریک ہوتے رہے ہیں۔افق نے اپنی عزائیہ شاعری میں اپنے عہد کے لکھنؤ کا بیان بڑے ہی انفرادی انداز میں کیا ہے۔

افق کو تمام شعری اصناف اور اس کے فن میں مہارت حاصل تھی۔انھوں نے تقریباً تمام اصناف کے فنی لوازمات کو برتنے میں کوئی کثر نہیں چھوڑی اور ہمیشہ کامیابی حاصل کی۔اخلاقیات، انسانی اقدار، خلوص و محبت، معاشرتی نظام، گنگا جمنی تہذیب وغیرہ ان کی شاعری میں جابجا نظر آتا ہے۔نظام حیدرآباد میر محبوب علی خاں نے انھیں اپنی اسی خصوصیات کے باعث ملک الشعراء کے خطاب سے نوازا تھا۔

افق ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔شاعری کے ساتھ ساتھ انھوں نے نثر میں بھی اعلیٰ درجہ کے نمونے پیش کیے۔نثر نگاری میں مسجع و مقفیٰ سے لے کر عام بول چال کی زبان کا استعمال کرنے میں ان کو زبردست ملکہ حاصل تھا۔ان کی زبان موقع و محل کے اعتبار سے تبدیل

Scanned with CamScanner

ہوتی رہتی ہے۔ مثلاً ان کو ہر طرح کی نثر لکھنے میں مہارت حاصل تھی۔ انھوں نے موضوع کے مطابق زبان کے ساتھ اور زبان کے مطابق موضوع کے ساتھ ہمیشہ انصاف کیا۔

ناول نگاری اور ڈرامے کا فن بھی افق کی قلم سے اچھوتا نہ رہ سکا۔ ناول میں کادمبری، عالم تصویر، زلف لیلیٰ، طلسم خاص، عشق وفا، انقلاب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ افق ڈرامے میں بھی اپنا سرمایہ چھوڑ گئے۔ ۱۹۰۴ء سے ۱۹۰۷ء کے دوران جب افق پنجاب ساچار کے ایڈیٹر تھے تو لاہور کے رام ناٹک کلب کی فرمائش پر انھوں نے رامائن کو ڈرامے کی شکل میں منتقل کیا تھا۔ اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ اس کلب کے لئے افق نے ''کرشن سدامہ'' ناٹک بھی لکھا۔ ایک ناٹک ''بھیشم پتامہ'' بھی زیر قلم تھا پر افسوس پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ انھوں نے 'الف لیلیٰ' کا ترجمہ اردو نثر و نظم میں کیا تھا۔ جس کی جلدیں نول کشور پریس لکھنؤ میں موجود ہیں، جو کچھ وجوہات کے باعث شائع نہ ہو سکا۔ اس کے علاوہ انھوں نے مہابھارت، رامائن بالمکی، شری مدبھاگوت گیتا اور ٹاڈ راجستھان کا بھی ترجمہ کیا۔ وکٹر ہوگو کے انگریزی ناول 'ہسٹری آف اے کرائم' کا ترجمہ نیرنگ فرنگ کے نام سے کیا۔ ان کے فکر و فن کا جائزہ لیتے ہوئے جناب سید مسعود حسن رضوی ادیب فرماتے ہیں:

''جناب افق نے مختلف حیثیتوں سے شعر و ادب کی بڑی خدمت کی۔ وہ کئی اخباروں کے ایڈیٹر رہے، کئی ناول تصنیف کئے، کئی مختصر سوانح عمریاں لکھیں، رسالوں میں مضامین شائع کئے، گیت بنائے،، ڈرامے لکھے، اہم کتابوں کے اردو ترجمے بھی کئے اور خاص طور پر شاعری میں

Scanned with CamScanner

شہرت حاصل کی۔ انھوں نے غزل سے زیادہ نظم کی طرف توجہ کی۔ وہ تمام اصناف سخن پر قادر تھے اور ان کی نظموں کا میدان بہت وسیع تھا۔ ان کا نظم اخبار جو تقریباً تمام کمال نظم میں ہوتا تھا ان کی پر گوئی کا شاہد ہے۔ ان کا تصنیفی سرمایہ مقدار اور معیار دونوں حیثیت سے قابل ذرہے۔" ۲؎

افق کے والد منشی پورن چند ذرہ نے ۱۸۷۵ء میں محلہ نوبستہ میں ایک اردو پریس قائم کیا تھا جس سے ذرہ صاحب کی نگرانی میں اور تمنا صاحب کی ادارت میں ہفت روزہ اخبار 'تمنائی' نکلنے لگا۔ اسی پریس سے ایک اور اخبار 'مہر ظرافت' ۱۸۸۴ء میں اور پھر ایک اخبار 'گلدستۂ سخن' ۱۸۹۴ء سے جاری ہونا شروع ہوا۔ جب افق نے بحیثیت صحافی ادب کے میدان میں قدم رکھا تو یہ سب ان کے پیش نظر تھا۔ انھوں نے اپنا مشہور اخبار 'نظم' ۱۸۸۸ء سے جاری کرنا شروع کر دیا۔ وہ محض ایک کامیاب شاعر ہی نہیں تھے بلکہ ایک ماہر ادیب، صحافی اور اعلیٰ درجے کے مدیر بھی تھے۔ ان کے نظم اخبار میں تمام طرح کی خبریں شائع ہوتیں تھیں۔ نظم اخبار اپنے دور کا انوکھا اور واحد اخبار تھا جس میں چار صفحے نثر اور آٹھ صفحے نظم کے ہوتے تھے۔ اس اخبار نے اردو صحافت کی تاریخ میں وہ نقش چھوڑے ہیں جو دوسروں سے قدرے مختلف ہیں۔ اس کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی کیونکہ اردو کی ادبی صحافت میں یہ ایک بالکل نیا تجربہ تھا۔ نظم اخبار کے صفحے اول پر افق کی ایک مثنوی مدتوں شائع ہوتی رہی۔ یہ مثنوی تین حصوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔ پہلے حصے میں حمد باری ہوتی تھی دوسرے میں دبستان لکھنؤ کی تعریف اور تیسرے حصے میں صحافت کے اسرار رموز کا ذکر۔ اس کا مقصد قارئین کو اخبار کی اہمیت اور ضرورت سے واقف کرانا ہوتا تھا۔

ہے شکر اس خالق عالی صفت کا

Scanned with CamScanner

مصنف ہے جو بندشش جہت کا

اشاعت نظم کی فرمائی جس نے

ردیف مہر و ماہ کی چمکائی جس نے

دکھائی خوبیاں فکر متیں کی

غزل تصنیف کی دنیا و دیں کی

کہا خمسہ حواس انس و جن کا

کیا دیواں مرتب رات دن کا

رقم کی مثنوی دین و ایماں

سنائی نظم بید و نثر قرآں

کہا قطعہ چہار انفاس تن کا

عناصر اور اخلاط بدن کا

بلاغت نظم پردہ میں دکھائی

فصاحت نثر نسریں میں دکھائی

رباعی لکھی اعتراف جہاں کی

کہی بیت ابرو و چشم بتاں کی

کیا تصنیف مطلع دو جہاں کا

بنا مصرعہ ہلال آسماں کا

Scanned with CamScanner

نظیر اس کا نہیں فکر متیں میں

کلام اس کا ہے ہر بحر وزن میں میں

اس کے علاوہ انھوں نے پنجاب سماچار' دھرم سجیون' اور کئی اخبارات کو اپنی صلاحیتوں سے فیض یاب کیا اور شاید اسی لئے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ایک ایسا اخبار نکالا جائے جو روایت سے منفرد ہو۔ نظم اخبار کئی سال تک جاری رہا۔ یہ مہینہ میں دو بار شائع ہوتا تھا۔ جو خبریں نظم میں ہوتیں تھیں اعلیٰ درجے کی ہوتی تیں۔ اس طرح قاری کو خبر کی معلومات تو ہوتی ہی تھی ساتھ ہی ساتھ ان کی شعری صلاحیت کی بھی تسکین ہوتی تھی۔ جناب احمد ابراہیم علوی اپنے ایک مضمون میں فرماتے ہیں:

''آگرہ اخبار جو ایک مقبول عام اخبار تھا اس میں نظم اخبار کی بڑی تعریف کی گئی ہے۔ ایک مسدس کے بعض بند قابل ذکر ہیں:

:

نظم اخبار کس انداز سے نکلا دیکھو

اب تلک ہند میں جو تم نے نہ دیکھا دیکھو

اور اس باغ میں ایک طوفان تماشا دیکھو

بلبل باغ کو یوں زمزمہ پیرا دیکھو

جس سے کانوں میں سدا لطف سخن کو آئے

جو ہوا آئے وہ تا تار ختن کی آئے

Scanned with CamScanner

پھول گل کھائے اگر دیکھ لے رنگ تحریر

خار کھائے جو سنے بلبل نالاں تقریر

ماہ کا داغ ہو دیکھے تو سخن کی تنویر

گھٹ کے خورشید جہانتاب بنے ذرا نظیر

شمع جل جائے اگر چرب زبانی دیکھے

تیغ کٹ جائے اگر سیف بیانی دیکھے [۳]

افق کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ وہ جو اخبار جاری کر رہے ہیں اس کی ضرورتوں کو بھی مدنظر رکھتے ہوئے پورا کرنا ہے۔ وہ خبریں بھی شائع کرتے تھے اور ہر طرح کے فتنہ و فساد سے دامن بھی بچاتے تھے۔ انھوں نے یہ بھی کوشش کی کہ وہ ایسی خبریں شائع کریں جو انسانی عظمت کے لئے چین و امن کے نعرے بلند کرے۔ اسی لئے وہ اخبار کے صفحہ اول پر مثنوی شائع کرتے تھے۔ جو ان کے اخبار کے مزاج اور ان کی فکر کو تو واضح کرتی ہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ انسان کے جذبات و احساسات کی ترجمانی بھی کرتی تھی۔ اس کے پہلے حصے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ پوری کائنات ایک نظم کے مانند ہے جس میں اس طرح حسن کاری کی گئی ہے کہ جیسے کوئی شاعر اپنی نظم کو سجاتا اور سنوارتا ہے اور ایک نئے انداز سے اپنی شاعری میں داخلیت پیدا کرتا ہے جو کہ ادبی سطح پر دیرپا نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ اخبار کی تعریف میں چند شعر ملاحضہ ہوں۔

مچادے افتخار نظم کی دھوم

Scanned with CamScanner

دکھادے جلوہ اخبار منظوم

مہینے میں ہو جوش نظم دو بار

بنے ماہ دو ہفتہ جس میں اخبار

ہر ایک انداز کے مضموں ہوں اس میں

مطالب نثر کے موضوع ہوں اس میں

ہو بہر مرگ مضموں فکر صیاد

رہے خامہ مثال سرو آزاد

ذہانت کوئی باریکی نہ چھوڑے

قلم جودت ہر ایک مضموں میں توڑے

افق نے بھارت پرتاپ، اودھ پنچ، زمانہ، شیو شمبھو، اودھ اخبار جیسے مشہور اخباروں میں بھی کام کیا۔ ان کی غزلیں اور مضامین مستقل ان اخباروں میں شائع ہوتے رہے۔ انھوں نے نول کشور پریس کے لیئے بہت سے ناولوں کے ترجمے کیے جن میں 'الو کی دم فاختہ' اور 'کل جگ کی کھونٹی' مشہور ہوئے۔ لیکن ان کا جاری کیا ہوا اخبار ان کی فکر کی ترجمانی کرتا تھا۔ جناب امداد صابری صاحب فرماتے ہیں:

''سلطان الاخبار بنگلور نے نثر میں ۴ فروری ۱۸۸۹ء میں تبصرہ کیا ہے:

کچھ عرصے سے ہندوستان کا اکلوتا اخبار تر دفتر مطبع میں آتا ہے۔ ہم نے اس اخبار کو غور

Scanned with CamScanner

کی نظر سے دیکھا اور اس کے منظومہ مضامین کی نکتی چینی کے خیال سے پڑھا۔ ہمیں خوشی حاصل ہوئی کہ باوجود اس خیال کے ہم نے اس اخبار کو ہر طرح سے عمدہ پایا۔ نظم میں فصاحت کے ساتھ شاعر از اسباب موجود، حشو نظم اخبار کے کلام سے مفقود خبروں کو موتیوں کے ملک میں ایسا پرو دیا ہے گویا دریا کو کوزہ میں بند کیا ہے۔ کہیں مسدس کہیں رباعیات اور کہیں غزلیات کی دھوم ہے۔ ہر ایک شعر میں زمانہ کی حالت اور نچرل مضامین کا ہجوم ہے۔ ایڈیٹر نے اپنی طبیعت کے ایسے جوہر دکھائے کہ بے ساختہ کہنا پڑتا ہے کہ شعر گوئی اس کا نام ہے۔ منشی دوارکا پرشاد افق نے ہندیوں پر ثابت کر دیا کہ ابھی ہند کی خاک میں وہ زور ہے کہ جس طرف متوجہ ہو وہ کام کر دکھائے کہ اہل یورپ سے بن نہ پڑے۔"[۴]

مختصر یہ کہ افق ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے اندر وہ ادبی صلاحیت تھی کہ انھوں نے اپنی ادبی کاوشوں سے ادب کے ہر گوشے کو روشن کیا اور ہر اصناف میں ان کی قلم نے جوہر دکھائے۔ شاعر، ناشر، مترجم، مورخ، ڈرامہ نگار، ناول نویس، ظرافت نگار، صحافی یہ ان کی شخصیت کے نمایاں پہلو ہیں جس نے ادب کے ہر شعبے کو منور کیا۔ مشہور و معروف نقاد پروفیسر شارب ردولوی صاحب رقم طراز ہیں:

"دوارکا پرشاد افق ایک اچھے شاعر کے ساتھ ایک اچھے نثر نگار اور مترجم بھی تھے ان کے ترجمے اور نثری کارنامے دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ۴۹ سال کی حیات مختصر میں کوئی کتنا کام کر سکتا ہے۔ وہ ایک انسان اور شاعر ہی نہیں بلکہ ایک دبستان اور ایک ادارہ تھے جس کی مثال ملنا مشکل

Scanned with CamScanner

ہے۔"[۵]

اور آخر میں ابوالفصاحت حضرت جوش ملسیانی کے شعر پر میں اپنے مقالے کو ختم کرنا چاہوں گی کہ ؎

ادب میں دوامی ہے نام افق
ادب ہی سے پوچھو مقام افق
ہوا ثبت ہر دل میں اے جوش یوں
نہ بھولے گا محفل کو نام افق

حواشی:

۱۔ ملک الشعراء منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی۔ ڈاکٹر کومل بھٹناگر۔ ص ۲

۲۔ ایضاً ص ۲۴

۳۔ نیا دور۔ ستمبر ۲۰۱۴۔ ص ۴۲

۴۔ تاریخ صحافت اردو۔ امداد صابری۔ ص ۵۶۶

۵۔ نیا دور ستمبر ۲۰۱۴۔ ص ۳۹

☆☆☆

عرشیہ سرفراز
ریسرچ اسکالر
الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

Scanned with CamScanner

انیسویں صدی میں اردو صحافت کی سمت و رفتار

ماہ و سال کے نشیب و فراز اور حالات کی سنگلاخ وادیوں سے گزرنے والی صحافت کی پیدائش تقریباً دو ہزار سال قبل ہوئی۔ جب کہ اردو صحافت دو سالہ تاریخ کی گواہ ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو اردو صحافت، عمومی صحافتی ابتدا سے تقریباً 18 سو سال چھوٹی ہے۔ تاہم اردو صحافت کو ابتدائی دنوں میں جن مسائل اور پرخطر حالات سے سابقہ پڑا، وہ روم میں شروع ہونے والے پہلے اخبار کے سامنے نہیں تھے۔ یعنی یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو صحافت کا پورا کارواں سنگلاخ وادیوں سے ہو کر گزرا ہے۔ دریافت شدہ تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ 'ایکٹا ڈائیورنا' Actadivma، دنیا کا پہلا روزنامہ اخبار ہے۔ جسے 60 قبل مسیح میں روم کے گایس جولیس سیزر (Gius Julius Ceasar) نے اپنے سینٹ کے احکامات و پیغامات کی ترسیل کے لیے جاری کیا تھا۔

(صحافت، ایم چلاپتی راؤ، صفحہ 16، بحولہ بہار میں اردو صحافت)

چوں کہ اس زمانے میں ذرائع ابلاغ محدود تھے، اس لیے جدار یہ نما اس اخبار کو سفید تختے پر عوامی آمد و رفت والے مقام چپکا دیا جاتا تھا۔ اس کا سلسلہ تقریباً ساڑھے تین سو برس جاری رہا۔ اگر ہندوستان میں تصورِ صحافت کی بات کی جائے تو اکبر بادشاہ اس لحاظ سے سرفہرست نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ بے شمار بادشاہوں نے اپنی رعایا، جنگی حالات اور آس پاس کے حالات و معاملات سے واقفیت کے لیے کوئی نہ کوئی وسیلہ ضرور اپنایا تھا۔ اکبر نے بھی 'اخبار دربار معلیٰ' نامی قلمی اخبار جاری کیا، جس میں دربار اور شاہی محل کی خبریں ہوتی تھیں اور یہ سلسلہ دراز ہوتا ہوا شاہجہاں کے عہد تک پہنچا۔ انھوں نے اس درباری اخبار کا نام تبدیل کر کے 'اخبار دار الخلافہ شاہجہاں آباد' رکھ دیا۔ ہوتے ہوتے یہی اخبار بہادر شاہ ظفر تک 'سراج الاخبار' بن گیا۔ چونکہ میرا موضوع مکمل صحافت کے تاریخی پہلو سے بحث کرنا نہیں ہے، اس لیے انیسوی صدی کی اردو صحافت کی سمت و رفتار پر مجھے ارتکاز لازمی ہے۔

Scanned with CamScanner

انیسوی صدی، ایک ایسی صدی ہے، جس میں اردو صحافت نے اس آب وگل کے چمن میں آنکھیں کھولیں۔ 1922 میں 'جام جہاں نما' نے پہلی دفعہ اردو صحافت کو اولوالعزمی، بلند حوصلگی، حب الوطنی اور آزاد خیالی کا ایسا جام پلایا، جس کا اثر آج بھی باقی ہے۔ مرورِ زمانہ کے سمندر میں بہتی بہتی آج اردو صحافت تقریباً دو سو برس کا سفر طے کر چکی ہے۔ یہ وہ اخبار تھا، جسے اردو صحافت کی خشت اول تو کہا جا سکتا ہے۔ تاہم چمن زارِ اردو صحافت کا خالص دلکش پھول نہیں۔ مولانا حسین آزاد نے لکھا ہے '1836 میں اردو کا اخبار دہلی میں جاری ہوا اور یہ اس زبان میں پہلا اخبار تھا کہ میرے والد مرحوم کے قلم سے نکلا'۔

(محمد حسین آزاد، آب حیات (طبع سوم) اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو 1953، ص 204)

یعنی انھوں نے 'دہلی اردو اخبار' کو پہلا خالص اردو اخبار تسلیم کیا ہے۔ کئی ایک نامور مورخوں نے بھی مولانا حسین آزاد کی تحقیق پر ہی مہر ثبت کی ہے۔ محققین نے انیسویں صدی میں شائع ہونے والے تقریباً 500 اخبارات کا انکشاف کیا ہے۔ آج جس طرح RNI سے سالانہ اخبارات کی تعداد منظر عام پر آتی ہے، ٹھیک اسی طرح اس دور کی حکومتیں بھی اخبارات کی تعداد پر مبنی سالانہ رپوٹ جاری کرتی تھیں۔ جسے اس عہد کے اخبارات اپنے مشمولات میں شامل کرتے تھے۔ قدیم فائلوں سے، شانتی رنجن بھٹا چارنے جو فہرست تیار کی ہے، اس سے انیسویں صدی کے اخبارات ورسائل کی صحیح تعداد کا اندازہ ہوا۔ ظاہر ہے اس چھوٹے سے مقالہ میں سلسلہ وار تمام اخباروں کا ذکر ممکن نہیں۔ اس لیے بھٹا چاریہ صاحب کے مطبوعہ مضمون ماہنامہ 'آج کل، جلد نمبر 42، شمارہ نمبر 4-5 دسمبر 1983' سے چند اخبارات کی فہرست دی جاتی ہے۔ واضح رہے کہ اس فہرست میں کسی ترتیب کا خیال رکھا گیا ہے اور نہ ہی سن اشاعت لکھنے کا اہتمام ہے۔ چنانچہ ان کے مضمون کے علاوہ اردو صحافت کی دیگر دستاویزی کتابوں سے بھی اس فہرست سازی میں مدد لی جا رہی ہے۔

'جام جہاں نما'، 'دہلی اردو خبار' کے بعد صحافتی ارتقا (انیسویں صدی کے اخبار) میں سید

Scanned with CamScanner

الاخبار 1837، اخبار الاخیار، مظفر پور 1968، طلسم لکھنؤ 1856، سحر سامری 1865، اخبار اعجاز 1856، مخزن الاخبار اور اشرف الاخبار مارچ 1857، صادق الاخبار 1854، کوہ نور 1850، خیر خواہ ہند 1857، قران السعدین 1854، فوائد الناظرین 1845، سراج الاخبار 1841، آئینہ گیتی نما 1843، کریم الاخبار 1845، خلاصہ اطراف 1847، عجائب الاخبار 1847، مفید ہند اور تحفۃ الحدائق 1848، پیسہ اخبار 1863، ضیاء الاخبار 1851، رفیق الاخبار 1851، وحید الاخبار 1852، نور مغربی اور نور مشرقی 1853 اور اسعد الاخبار 1857، اخبار سائنٹفک سوسائٹی 1866، تہذیب الاخلاق 1879، اودھ پنچ 1877، رسالہ دہلی سوسائٹی 1886، ہندوستانی اردو لغات 1882، مفید ہند، افسانۂ ایام 1885، ادیب 1898، نور بصیرت 1884، انجمن اسلام، جامع الاخبار 1875، گلدستہ نتیجۂ سخن 1822، اتالیق، ظریف بنارس، شوکت اسلام، رفارمر، مفید عالم وغیرہ اہم ہیں۔

(دہلی میں ادبی صحافت کی تاریخ اور ایوان اردو، مہیمنہ خاتون (مصنف و ناشر)، طبع سال 2010، ص 15)

اس چھوٹی سی فہرست کے بعد مناسب ہے کہ ان اخبارات و رسائل کے ایڈیٹران، موضوعات اور اس کے فروغ کے اسباب و علل پر اجمالی بحث کی جائے۔ میرا مطالعہ وثوق سے یہ تو نہیں کہہ سکتا ہے کہ انیسوی صدی میں شائع ہونے والے اخبارات و رسائل کے مدیر، پرنٹر اور پبلشر نصف سے زیادہ غیر مسلم تھے۔ البتہ سرسری مطالعے سے بھی اتنا کہنے کی گنجائش ہے کہ اردو اخبارات کے تقریباً 40 فیصد ایڈیٹر اور مالک غیر مسلم تھے۔ کولکاتا سے اردو اور انگریزی میں مشترکہ طور پر شائع ہونے والے 'اردو گائڈ' کے پرنٹر اور پبلشر ترلوک ناتھ تھے۔ کپورتھلا لکھنو سے منظر عام پر آنے والے ہفت روزہ اخبار 'اخبار سہائے' کے مالک متھر اداس بہادر تھے۔ 'اردو اخبار اکولہ' کشن چند کی ادارت میں نکلتا تھا۔ 'دار السلطنت' کولکاتا کے ایڈیٹر رام موہن گھوش، 'شام اودھ'

کے مالک دوارکا داس، 'گلدستہ مضامین' متھرا کے ایڈیٹر 'چودھری شیام لال'، 'مراۃ الہند' کے ایڈیٹر 'پنڈت شیام نرائن' ہفت روزہ 'نسیم آگرہ' کے ایڈیٹر 'بابو جمنا داس بسواس' تھے۔ ان ایڈیٹروں کے تذکرہ سے اندازہ لگایا جانا بالکل آسان ہے کہ اردو کا رشتہ کسی خاص مذہب کے ماننے والوں سے نہیں ہے۔ ظاہری بات ہے کہ جس زبان کے فروغ اور تعمیر و ترقی میں مختلف مذاہب کے ماننے والوں کا خون جگر شامل ہے، اس میں کیسے جانبداری اور مذہبی تشدد کی آمیزش ہو سکتی ہے۔ اس لیے یہ کہنا مناسب ہے کہ اردو زبان و ادب اور صحافت بھی اولین دن سے ہی سیکولرزم کے فروغ میں مصروف ہے اور حب الوطنی ہی اس کا شعار و شیوہ رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ لسانی تعصب کی کند چھری سے اردو کو ذبح کرنے کی کوشش کی جاتی رہی۔ لیکن یہ زبان اتنی سخت جان ثابت ہوئی کہ کسی بھی مذبح میں ختم نہ ہو سکی اور آج بھی اپنی حلاوت و شیرینی سے دل کو موہ لے رہی ہے۔ 1822 سے 1899 تک کے موضوعات کا جائزہ لیں تو اردو صحافت کے فروغ سیکولرزم کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ جس نازک دور میں اردو صحافت کا آغاز ہوا، اس دور میں ممکن ہی نہیں تھا کہ کسی جانبداری کو ہوا دی جائے۔ چنانچہ اردو صحافت نے اس ماحول یعنی اپنے ابتدائی دور میں جو کچھ کیا اسے فروغِ سیکولرزم کے تناظر میں انتہائی کامیاب کردار کہا جا سکتا ہے۔ خاص طور سے صحافت کی آڑ میں اردو صحافیوں نے اسلامی حمیت کو بیدار کر کے شمعِ آزادی فروزاں کرنے کی جو کوشش کی، اس کی مثال کسی بھی زبان کی صحافت میں نہیں ملے گی۔ اردو صحافت کے علاوہ کسی زبان کی صحافت کو شاید یہ بھی فخر حاصل نہیں ہے کہ اس نے اول دن سے ہی توپوں کا مقابلہ کیا ہو۔ اردو صحافت کو یہ بھی ناز کہ اس نے حب الوطنی کی قربان گاہ پر اپنی تاریخ کے اولین صحافیوں کی قربانی دی۔ آزادی کی لڑائی کسی ایک طبقہ کی نہیں تھی، کسی ایک گروہ کی نہیں تھی، پورے ملک کی تھی۔ پوری قوم کی تھی۔ اس میں اردو صحافیوں کے ذریعے انجام دئے گئے کارناموں کو کیسے سیکولرزم سے الگ کر کے کیسا دیکھا جا سکتا ہے، بلکہ انہوں نے سیکولرزم کے فروغ میں مذہبی حمیت کو بھی بیدار کیا۔ بقول شاعر:

Scanned with CamScanner

تاریخ اسے کیسے فراموش کرے گی

وہ جنگ جو اردو صحافت نے لڑی ہے

حتی کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے کہا تھا:

''یاد رکھیے ہندوؤں کے لیے ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا داخلِ حب الوطنی ہے، مگر آپ کے لیے ایک فرض دینی اور داخل جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

(الہلال 08 دسمبر 1912۔ مطبوعہ اتر پردیش، اردو اکادمی لکھنو)

ڈاکٹر مشتاق احمد نے مغربی ادبا اور دانشوروں کی کتابوں سے استفادہ کے بعد حب الوطنی کا جو تصور پیش کیا ہے، اس کے تناظر میں اگر اردو ادب و صحافت کے کردار کا جائزہ لیا جائے تو مطلقاً اردو حب الوطنی کے فروغ اور سیکولزم کی علمبردار نظر آتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

'ہمارے یہاں یہ غلط فہمی عام ہے کہ حب الوطنی اپنے مادرِ وطن کے جغرافیائی حدود سے محبت کرنے تک محدود ہے، جب کہ حقیقتاً حب الوطنی اپنے مادرِ وطن کے جغرافیائی حدود سے محبت کرنے کے ساتھ ساتھ وطن عزیز میں غلامی، غربت و افلاس پر تڑپنے والوں کی چیخ و پکار کو سن کر آہیں بھرنا، عیار و مکار سرمایہ داروں سے نفرت کا اظہار کرنا، ہر طرح کے استحصال کے خلاف جنگ لڑنے کا حوصلہ رکھنا، اپنی تہذیب و ثقافت کی بقا کے لیے جدوجہد کرنا، سب داخل حب الوطنی ہے۔'

(میزان سخن، ڈاکٹر مشتاق احمد، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی 2014، ص)

اس وسیع پسندانہ نظریہ سے دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ پر انیسویں صدی سے ہی پر خطر ملکی حالات سے نبرد آزمائی، غلامانہ رویوں سے تنفر اور ملک کے دبے کچلے افراد کو سرمایہ داروں کے چنگل سے آزادی دلانا ہی اردو صحافت کا مطمح نظر رہا ہے۔

فروغ سیکولزم اور جذبۂ حب الوطنی کے علاوہ دیگر موضوعات کے حوالے سے انیسویں صدی کے ادبی و صحافتی سفر کا جائزہ لینے سے سامنے آئے گا کہ اس صدی میں جدوجہد آزادی ہی

Scanned with CamScanner

ہندوستانیوں کی سب سے بڑی سرگرمی تھی۔ اس لیے ہر اخبار میں غلامانہ ذہنیت سے تنفر کی فضا ملتی ہے۔ پھر یہ بات بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ انیسویں صدی چونکہ اردو صحافت کا ابتدائی زمانہ ہے۔ اس لیے اس عہد میں موضوعات کے لحاظ سے اخبارات ورسائل میں کوئی بڑی تفریق نہیں کی جاتی تھی۔ ایک ہی اخبار میں ادبی اور سیاسی موضوعات ہوتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی میں ادب کا غلبہ تھا تو کسی میں سیاسی موضوعات کا۔ لیکن یک گونہ آہنگی اور مماثلت ہر جگہ تھی۔ موضوعات کے حوالے سے اپنے مضمون 'انیسویں صدی میں اردو صحافت' مطبوعہ 'آجکل' میں سوم آنند نے لکھا ہے:

'1857 کے اوائل کے ہندوستانی اخباروں میں عموماً اور اردو اخبارات میں خصوصاً انگریزوں اور ایرانیوں کی جنگ کی خبریں اس کثرت سے شائع ہوتی تھیں کہ جس کا کوئی حد وحساب نہ تھا۔ ان خبروں کا مواد اور ان کو پیش کرنے کا انداز اعلانیہ انتہائی انگریز دشمنانہ ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی کے اخباروں نے جن کے مالک اور ایڈیٹر یا تو انگریز تھے یا کمپنی کے وفادار، شور مچانا شروع کیا کہ اردو اخبارات نفرت اور بغاوت کی تبلیغ کر رہے ہیں۔'

(ماہنامہ آجکل دہلی، نومبر دسمبر، 1983)

ایڈیٹروں کے تذکرہ، موضوعاتی سروکار، فروغ سیکولرزم اور جذبہ حب الوطنی کے بعد اگر لسانی جھلک دیکھنے کی کوشش کی جائے گی تو پتا چلے گا کہ اسی صدی کی تیسری دہائی (1930) میں انگریزوں نے اردو کو سرکاری زبان تسلیم کیا۔ یعنی اردو اخبارات کی شروعات سے کوئی 8 برس بعد ہی اردو کو سرکاری طور پر وقار حاصل ہو گیا۔ لسانی سطح پر وقار پانے والی اس زبان نے اردو صحافت کی رفتار میں تیزی پیدا کر دی۔ ایک اشکال ہو سکتا ہے کہ اردو سرکاری زبان تھی، اس لیے غیر مسلموں نے معاشی نقطہ نظر سے اردو صحافت کو اپنایا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مشن کی کامیابی میں معاش کا بھی بڑا عمل دخل ہوتا ہے اور پھر جب مشن اور مشغلہ ایک ہو جائے تو بہت سے قابل قدر حالات پیدا ہو جاتے ہیں، جیسا کہ ابتدائی زمانے میں اردو صحافت کے ساتھ بھی ہوا۔ اس حقیقت سے بھی نظریں نہیں چرائی جا سکتی ہے کہ اردو کیوں نہ سرکاری زبان ہو، لیکن اردو صحافیوں کو اس عہد میں بھی

Scanned with CamScanner

حکومتوں سے لوہا لینا پڑتا تھا۔ متعدد اخبارات میں 'ضرورت ملازمین' کا اشتہار ان لفظوں میں شائع ہوتا تھا کہ جان کو قربان کرنے والے ہی اخبار میں کام کرنے کی درخواست دیں۔ ان حالات میں کیسے کہا جاسکتا ہے کہ اردو سرکاری زبان تھی۔ مراعات حاصل کرنے کے زیادہ مواقع تھے، اس لیے بردران وطن صحافیوں نے اردو کا دامن تھا۔ چنانچہ یہ بات بلاخوف وتردید کہی جاسکتی ہے کہ انیسویں صدی میں اردو صحافت نے جو کردار ادا کیا، وہ جہاں سیکولرزم کے فروغ پر مبنی ہے وہیں آزادی کی چنگاری کو شعلہ بنانے کے مترادف بھی۔ اسی طرح جہاں زبان وبیان کو معیار ومنہاج نصیب ہوا، وہیں اردو صحافت کی تابناکی کا اشاریہ بھی تیار ہوا۔ ایک طرف جہاں جذبۂ حب الوطنی کو فروغ حاصل ہوا، وہیں معاشرہ بلکہ ملک کے دبے کچلے افراد کو اعتبار دلانے کی مہم بھی چلی۔

☆☆☆

سلمان عبدالصمد

ریسرچ اسکالر، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

موبائل:9891233492

salmansamadsalman@gmail.com

Scanned with CamScanner

انیسویں صدی میں اردو صحافت

انیسویں صدی نہ صرف ادب بلکہ سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی اعتبار سے تاریخی اہمیت کی حامل رہی ہے۔ یہ وہ صدی ہے جب ہندوستان میں انگریزوں کی بخشی ہوئی برکتیں اپنے عروج پر تھیں۔ نئے سیاسی، اقتصادی اصول تہذیب وتمدن کے نئے انداز، ادب کے نئے تصورات تعلیم وتدریس کے جداگانہ معاملات نت نئے روز سامنے آرہے تھے۔ مختصر یہ کہ یہ وہ صدی تھی جب ہندوستانی زندگی پر مغربی اقدار ہر اعتبار سے حاوی ہوتی جارہی تھی اور یہی وہ دور تھا جب ہندوستان میں اردو صحافت اور چھاپے خانے کا آغاز ہوا۔

جب ۱۸ویں صدی کی ابتدا ہوئی، اس وقت بمبئی اور مدراس میں چھاپے خانے لگ چکے تھے۔ ۱۷۷۷ء میں جیمس آگسٹس نے کلکتہ میں پہلا چھاپا خانہ قائم کیا۔ ۱۷۷۹ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے چھاپا خانہ قائم کیا۔ اگلے سال پرنٹر جیمس آگسٹس نے اخبار "بنگال گزٹ" جاری کیا۔

ہندوستان کی تاریخ انیسویں صدی میں دو اعتبار سے بہت اہم ہے۔ اس صدی میں بہت ہی ایسی ہستیاں سامنے آئیں جنھوں نے اردو صحافت کو بدل کر رکھ دیا تو دوسرے یہ کہ اس زمانے میں جو مقامی بولیاں تھیں ان بولیوں میں ہی اخبار جاری ہو چکے تھے۔ ایک طرف جوشا مدرش مین اور ولیم سین وغیرہ۔

پہلا ماہنامہ ڈگ ورشن بنگال کا "سیرام پور مشن" نے جاری کیا۔ یہ اخبار بنگالی میں نہیں بلکہ ہندی اور انگریزی میں بھی نکالا اور پھر "سماچار درپن" جو اس کے ٹھیک ایک مہینے کے بعد نکلا۔ بنگال کی صحافت کی یہ ساری خدمات "سیرام پور مشن" نے انجام دی۔

Scanned with CamScanner

''جام جہاں نما'' کے مالک ہری دت تھے اور اس کے مدیر سکھ لعل تھے۔ اگر ہم اس دور کے اخبار پر نظر ڈالیں تو جس وقت ''جام جہاں نما'' شائع ہوا تو اس سے قبل اردو کا یا فارسی کا کوئی بھی اخبار نہیں نکلا تھا۔ کمپنی نے اپنے انگریزی ملازموں کو اردو اور وہاں کی جو مقامی بولی تھی اس کو سیکھنے کے لیے کہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اگر کوئی غیر زبان کا شخص کسی دوسرے وطن جاتا ہے تو وہ وہاں کی بولی سے واقف نہیں ہے تو اس کو وہاں پر پریشانی پیش آتی ہے۔ کام دھام کرنے میں مشکل ہوتی ہے۔ اپنی بات ہم دوسروں کو سمجھا نہیں پاتے اور ان کی بات ہم سمجھ نہیں سکتے ہیں کیوں کہ ہم اس زبان سے واقف نہیں ہوتے ہیں۔ اور ان پریشانیوں سے اس وقت نجات حاصل ہو سکتی ہے جب ہم اس زبان سے واقفیت حاصل کریں اور یہ تبھی ہو سکتا ہے جب ہم اس زبان کو سیکھیں۔ کمپنی بھی ان تمام باتوں سے واقف تھی اس لیے اس نے پہلے انگریز ملازموں کو وہاں کی مقامی بولی سیکھنے پر معمور کیا تا کہ جب ان کو عہدوں پر معمور کیا جائے تو ان لوگوں کو وہاں پریشانیاں نہ ہو اور یہ تب ہی ہو سکتا ہے جب ان کی زبان سے واقف ہو۔ اس وقت ہی انگریز وہاں کے عوام کے معاملات کو حل کر سکیں گے کیوں کہ زبان کی دشواری ان کے سامنے پیش نہیں آئے گی۔

فارسی سرکاری زبان ضرور تھی مگر انگریز اردو بھی سیکھنا چاہتے تھے۔ اور اس زبان کو سیکھنے میں خاص طور سے دلچسپی بھی لے رہے تھے۔ لیکن فارسی زبان کو سیکھنا اردو زبان کے مقابلے زیادہ مشکل تھا۔ اردو زبان کی ترقی میں فورٹ ولیم کالج نے بھی ایک اہم حصہ لیا۔ فورٹ ولیم کالج نے اس زبان کی ترقی کے لیے اس زبان میں کئی کتابیں ترجمہ کیں تا کہ لوگ ان کتابوں کا مطالعہ کریں۔ یہی وقت تھا جب اردو کا پہلا اخبار ''جام جہاں نما'' نکلنا شروع ہوا۔ اخبار کے مدیر ہری دت بھی اردو زبان کی مقبولیت سے واقف تھے اس لیے انھوں نے فارسی زبان کے مقابلے میں اردو زبان کو فوقیت دی۔ اس اخبار میں سیاسی، جنگی اور تعلیمی خبریں شائع ہوتی تھیں جن کی وجہ سے

Scanned with CamScanner

لوگوں میں علم اور ان کی معلومات میں کافی اضافہ ہوا۔

کلکتہ میں جب ''جام جہاں نما'' بند ہو گیا اور ''دہلی اردو اخبار'' کے اجرا تک اردو اخبار پر نظر ڈالئے تو اس وقت تک کوئی بھی اردو کا اخبار منظر عام پر نہیں آیا تھا۔ البتہ ایک فارسی اخبار ''آئینۂ سکندری'' کے وجود پذیر ہونے کی خبر تھی اور یہ اخبار گورنر بمبئی کی فرمائش پر جاری ہوا۔ ظاہر ہے کہ اگر کوئی اخبار کسی سرکاری افسر کی فرمائش پر جاری ہوا ہوگا تو یقیناً خبریں بھی اس کے مطابق ہی ہوں گی۔ یعنی کہ جن چیزوں کو گورنر پسند کرے گا وہی خبریں شائع ہوں گی اور جن خبروں کو گورنر ناپسند کرے گا وہ شائع نہیں ہوں گی اور ان حالات میں اخبار اپنے فرائض انجام نہیں دے سکتا۔ اور یہی حال اس اخبار کا تھا کہ وہ آزاد نہیں تھا بلکہ گورنر کا غلام تھا کیونکہ اس میں خبریں گورنر صاحب کے مطابق ہی شائع ہوتی تھیں۔

اردو زبان جو اس دور میں بہت مقبول ہو رہی تھی اور ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنا رہی تھی۔ ۱۸ویں صدی میں یہ زبان سب کے دلوں پر راج کر رہی تھی۔ اور ۱۹ویں صدی میں اردو پورے ہندوستان کے رابطے کی زبان بن چکی تھی۔ دیگر حوالوں کے علاوہ اردو زبان کو فروغ دینے میں فورٹ ولیم کالج نے بہت اہم روال ادا کیا اور فورٹ ولیم کالج کے اس کام کو دہلی کالج نے آگے بڑھایا۔ یہ وہ وقت تھا جب اردو زبان کو تعلیم و تدوین کا میڈیم بنانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

''دہلی اردو اخبار'' کو واعظ مولوی محمد باقر نے جاری کیا تھا۔ اسی اخبار میں ان فیصلوں کے خلاف آواز اٹھائی جاتی تھی جن فیصلوں کو سرکار نے عوام کو ذہن میں رکھے بغیر طے کر دیے تھے اور جن فیصلوں سے عوام خوش نہیں تھی۔ صاف پتہ چلتا ہے کہ دہلی کا یہ پہلا اخبار ہے جو حکومت کے خلاف تھا اور انگریزوں سے لوہا لے رہا تھا۔

''سید الاخبار'' اس اخبار کے مالک سر سید احمد خاں تھے لیکن اس اخبار کی ساری ذمہ

Scanned with CamScanner

داری عبدالغفار کے سپرد تھی۔

''قران اسعدین'' یہ دہلی سے شائع ہوتا تھا۔اس خبار کا مقصد تھا ہندوستانیوں کو تعلیم کی اہمیت سے واقف کرانا، تعلیم کا ذوق پیدا کرنا۔

''فوائد الناظرین'' اس اخبار کو ماسٹر رام چند نے جاری کیا۔اس کا مقصد ہندوستانیوں کے نئے علوم کا شوق پیدا کرنا تھا۔مگر یہ اخبارات حکومت کے ساتھ تھے۔

''فوائد الشائقین'' اس اخبار نے قانون کو خاص طور پر اپنا موضوع بنایا۔جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو میں اس وقت ہر طرح کے اخبار نکلنے لگے تھے۔

''مالوہ اخبار'' یہ اخبار اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں شائع ہوا تھا۔اس اخبار میں عوام کی دلچسپی کا پورا خیال رکھا گیا۔اس میں وہ ساری خبریں موجود ہوتی تھیں جن خبروں کو عوام پسند کرتی تھی یعنی ان کی دلچسپی کی خبریں۔

''کوہ نور'' یہ پنجاب کا پہلا اخبار تھا۔اسی اخبار کے ذریعہ پنجاب میں اردو صحافت کا آغاز ہوا۔

منشی سجاد حسین نے ''اودھ پنچ'' اخبار نکالا۔وہ اس اخبار کے مدیر تھے۔یہ اخبار ایک سیاسی اخبار تھا۔

مولوی عبدالعلیم شرر نے ایک رسالہ ''دلگداز'' جاری کیا اور ۱۸۹۰ء میں ایک ہفتہ روزہ ''مہذب'' جاری کیا۔اس اخبار میں مسلمانوں کو اہمیت دی تھی کہ مسلمانوں کے مسائل سے چاہے وہ تعلیمی ہو یا سیاسی یہ اخبار ان مسائل پر مبنی خبریں شائع کرتا تھا۔

''البشر'' یہ اخبار اٹاوہ سے جاری ہوا تھا۔یہ اخبار انیسویں صدی کے آخر میں منظر عام پر آیا اور اس اخبار نے بیسویں صدی کا عمدہ سرمایہ اپنے سینے میں محفوظ کیا۔

Scanned with CamScanner

جب جنگ آزادی کا سُر ابھرا تو جنگ کا اثر اردو صحافت پر بھی پڑا۔ اردو صحافت میں ایک نیا موڑ آیا۔ اس دوران کوئی بھی کونا دنیا کا ایسا نہیں تھا جہاں سے اخبار نہ نکل رہے ہوں۔ کیوں کہ جنگ آزادی کے حالات جنگ کی صورت حال جاننے کی لوگوں کے اندر ایک بے چینی سی ہوتی تھی اور اس بے چینی کو کم کرنے یا ختم کرنے کا ذریعہ صرف اخبار ہی تھے جو لوگوں کو تمام حالات سے روشناس کر سکتے تھے۔ ان اخباروں کے ذریعے ہی لوگ سیاسی خبروں سے واقفیت حاصل کرتے تھے۔

اردو صحافت نے انیسویں صدی میں خوانگی کی کمی، محدود رسائل اور اخبار بینی کے ذوق کے نہ ہونے کے باوجود حیرت انگیز طور پر ترقی کی اور اسی صدی کے اواخر تک اس زبان میں کثیر اشاعر اور انگریزی تعلیم کے فروغ نے اردو صحافت کو کسی قدر نقصان بھی پہنچایا۔ بالخصوص شمالی ہند میں اردو اخبارات کی اشاعت متاثر ہوئی۔ لیکن اسی عرصے میں اردو صحافت کی روایت مستحکم ہو چکی تھی۔

انیسویں صدی کے ان اخبارات کے جاری ہونے کے مقاصد، ان کے مالکان اور اخبار کی پالیسیوں، خبروں کی نوعیت کا مطالعہ فائلوں میں کریں تو پتہ چلتا ہے کہ ابتداً اردو اخبار کی زبان پر داستانوی زبان کا اثر ہے مگر آہستہ آہستہ زبان عوامی (pro-people) ہوتی گئی اور فارسی نحو کی جگہ اردو کی عام بول چال سامنے آنے لگی۔ دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس عہد کے اخباروں نے اردو نثر کے فروغ میں حصہ لیا ہی ساتھ ہی ساتھ آہستہ آہستہ یہ اخبارات حکومت برطانیہ یعنی نوآبادتی جبر کے خلاف ایک آرگن کی صورت میں سامنے آئی اور جنگ آزادی کے

Scanned with CamScanner

شعلوں کو تیز کرتے چلے گئے اور حکومت انگلشیہ کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیا۔ ایک دن ایسا آیا کہ ہم نے یہ محسوس کیا کہ آزادی کی کھلی فضا میں سانس لینے کا موقع ہمیں اردو صحافت کی بدولت میسر آیا۔

☆☆☆

روپہلا ثاقب

ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

Mob. 8810012019

E-mail: rupehelasaqibamu@gmail.com

Scanned with CamScanner

انیسویں صدی کا ادبی اور صحافتی سفر: ایک تجزیہ

مقالہ کا یہ عنوان دو پہلو پر مشتمل ہے، ایک صحافتی دوسرا ادبی سفر۔ چند صفحات میں دونوں پہلوؤں پر خاصی توجہ بہ مشکل تمام ہی دی جاسکتی ہے۔ اس لیے مناسب یہ ہے کہ میں ادبی اور اخباری صحافت پر ہی اپنی توجہ مرکوز رکھوں۔ البتہ اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ اردو اخبارات ورسائل کے ابتدائی دور میں ادب اور صحافت کی سمت ورفتار میں کوئی بنیادی فرق نہیں تھا۔ یعنی ادب اور صحافت کو الگ خانوں میں تقسیم کر کے اخبار ورسائل سامنے نہیں آرہے تھے۔ انیسویں صدی سے ہی اردو اخبار کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا ہے، ظاہر ہے اس زمانے میں ایسی کوئی تقسیم صحافت اور ادبی رسائل کے درمیان نہ تھی۔ رسائل وجرائد کے لحاظ سے باقاعدہ طور پر صحافت اور ادب کی تقسیم تو بیسویں صدی میں ہوئی۔ چند سطور کے بعد ابتدائی دور کے اخبار کا تجزیہ کیا جائے گا تو میری بات کی تائید کے لیے دلائل از خود واضح ہوں گے۔

اردو اخبار نویسی کی تاریخ انتہائی پرانی نہیں۔ اس کی شروعات چھاپہ خانے کے رواج کے بعد سے ہوئی۔ تاہم تقریباً دو سو برسوں میں روشن اور تابناک تاریخ کی کئی منزلیں اس نے طے کی۔ 1822ء میں کلکتہ سے سب سے پہلے اردو اخبار ''جام جہاں نما'' جاری ہوا۔ اس کے بانی ہری ہردت اور ایڈیٹر لالہ سدا سکھ تھے۔ انگریزی تجارتی کوٹھی کی یہ ملکیت تھی۔ یہ وضاحت ضروری ہے کہ چند اسباب کی بنیاد پر مذکورہ اخبار کو اردو کا سب سے پہلا اخبار تسلیم نہیں کیا جاتا۔ ان میں بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ اخبار کچھ زبانِ اردو اور کچھ زبانِ فارسی میں نکلتا تھا۔

'جام جہاں نما کے ذریعہ اردو صحافت کی ابتدا تو 1822ء میں ہوئی۔ مگر اس وقت تک فارسی کا غلبہ لوگوں کے دلوں میں قائم تھا جو اردو صحافت کے ارتقا میں سدراہ بنا۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدا میں اس کا ارتقا بہت سست رفتاری سے ہوا۔ گو کہ اس وقت تک اردو نثر نے فورٹ ولیم کالج کی وساطت سے، ترقی کی ابتدائی منزلیں طے کر لی تھیں۔ پھر بھی بڑے شاعر اور ادیب اپنا مافی الضمیر ادا کرنے کے لیے فارسی زبان کو ہی ترجیح دیتے تھے۔....(1)'

ظاہر ہے جب فارسی کا غلبہ تھا تو ایسے میں اردو سے انسیت کا پیدا ہو جانا کچھ محال سا لگ رہا تھا

۔لہذا اردو، فارسی کے سہارے ہی آگے بڑھ رہی تھی ۔'جام جہاں نما' کے بارے میں یہ باتیں تاریخ میں مذکورہ ہیں کہ یہ اخبار کچھ اردو تو کچھ فارسی میں نکلتا تھا۔یعنی اردو مکمل طور پر لوگ قبول نہ کر پاتے ہوں تو اس لیے فارسی کے سہارے اردو کی رسائی کا کام کیا جانے لگا۔یہ بھی کہا جاتا ہے کہ 15 مئی 1522 سے اس اخبار میں ایک کالم اردو کے بجائے فارسی میں نکلنے لگا، جو لوگوں میں بہت مقبول ہوا۔(2) اردو کے پہلے اخبار 'جام جہاں نما' میں فارسی آمیزش کی بنیاد پر ''دہلی اردو اخبار'' کو محققین نے پہلا خالص اردو کا اخبار تسلیم کیا۔مولانا حسین آزاد نے لکھا ہے:

'1836ء میں اردو کا اخبار دہلی میں جاری ہوا اور یہ اس زبان میں پہلا اخبار تھا کہ میرے والد مرحوم کے قلم سے نکلا'(3)

اس اخبار کے بانی مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر تھے۔اس میں بہت سے معلومات افزا مضامین علمی، ادبی، تاریخی اور تعلیمی موضوعات پر شائع ہوتے تھے۔1857ء کی جنگ آزادی میں اس اخبار کا بڑا اہم کردار رہا ہے۔چونکہ اس کی پالیسی آزاد خیالی پر مبنی تھی، اس لئے اس زمانہ میں سامراجی حکومت کے خلاف خوب لکھا گیا۔حکومت کے خلاف لکھنے اور متعدد وجوہات کی بنیاد پر اس کے ایڈیٹر کو پھانسی بھی دی گئی۔اس طرح حب الوطنی کی قربان گاہ پر اردو صحافت کے پہلے قوم پرور اور محبِ وطن کی قربانی ہوئی۔

یہ بھی وضاحت کر دیں کہ جس طرح ہم اردو کے ابتدائی دور کے اخبارات کا تذکرہ کرتے جائیں گے، اسی طرح انیسویں صدی کی صحافت کا سفر بھی ہمارے سا

منے آتا جائے گا۔اپنے مقالے کے 'ادبی و صحافتی سفر' جز کے متعلق لکھنے سے قبل ہم ذیل میں انیسویں صدی کے موقر اخبارات و رسائل کا تذکرہ کر رہے ہیں:

'جام جہاں نما' اور 'دہلی اردو اخبار' کے بعد صحافتی ارتقا (انیسویں صدی کے اخبار) میں 'سید الاخبار 1837ء'، 'صادق الاخبار 1854ء'، کوہ نور 1850ء، خیر خواہ ہند 1857ء، قران السعدین 1854ء، فوائد الناظرین 1845ء، سراج الاخبار 1841ء، آئینہ گیتی نما 1843ء، کریم الاخبار 1845ء، خلاصہ اطراف 1847ء، عجائب الاخبار 1847ء، مفید

Scanned with CamScanner

ہند اور تحفۃ الرائق 1848ء، پیسہ اخبار 1863ء، ضیاء الاخبار 1851ء، دقیق الاخبار 1851ء، وحید الاخبار 1852ء، نور مغربی اور نور مشرقی 1853ء اور اسعد الاخبار 1857ء، اخبار سائنٹفک سوسائٹی 1866ء، تہذیب الاخلاق 1879ء، اودھ پنچ 1877ء، رسالہ دہلی سوسائٹی 1886ء، ہندوستانی اردو لغات 1882ء، مفید ہند، افسانۂ ایام 1885ء، ادیب 1898ء، وغیرہ اہم ہیں۔ ان اخبارات کی فہرست سے انیسویں صدی کا صحافتی و ادبی منظرنامہ سامنے آتا ہے اور ان کا مطالعہ از خود ادب اور صحافت کا سفر واضح طور پر ہمارے سامنے آجائے گا۔(4)

اس فہرست کے بعد ایک سرسری نظر ان ابتدائی اخبارات کے موضوعات پر ڈالنے سے بھی ادب اور صحافت کی کڑیاں جڑتی ہوئی نظر آئیں گی۔ 'جام جہاں نما' کی بات کی جائے تو اس میں خبریں، غزلیں، تاریخی مواد اور سماجی مسائل ہوتے تھے۔(5) دہلی اردو اخبار دو کالموں میں کتابچہ کی شکل میں شائع ہوتا تھا۔ اس میں ملکی غیر ملکی، مقامی، سیاسی، سماجی، تہذیبی، تمدنی، علمی اور ادبی مسائل کے مشمولات ہوتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ جنگ آزادی کے متعلق سرگرمیوں کے لیے مختص تھا۔ اس کے بعد اسپرنگر کی سرپرستی میں دہلی کالج سے نکلنے والے رسالہ 'قران السعدین' کو لیں یا پھر ماسٹر رام چندر کے 'فوائد الناظرین' کو سامنے رکھیں تو موضوعات میں مماثلت نظر آتی ہے۔ ان دونوں رسالوں نے بھی خبروں کی ترسیل، علمی مسائل، ادبی مضامین اور مذہبی افکار و نظریات کو لوگوں تک پہنچانے میں اہم رول ادا کیا۔ 'خیر خواہ ہند' جسے پہلا اردو مجلّہ ہونے کا شرف حاصل ہے، اس کی اشاعت عیسائی مشنریوں نے اپنے مذہب کی تبلیغ کی خاطر کی تھی، تاہم اس میں بھی ادبی مسائل زیر بحث آتے تھے۔ پھر یہ بھی مسلم الثبوت ہے کہ اس زمانے میں انگریزوں نے اردو کی جو بھی خدمت کی تھی، اس میں ان کا مقصد زبان و بیان کے فروغ سے کہیں زیادہ اپنے لوگوں کو اردو سکھانا تھا۔ ایسے میں ظاہر ہے عیسائی مذہب کی تبلیغ ہی کیوں نہ کرے، ان کے طریقہ کار میں اردو کے فروغ اور ادبی مسائل ابھریں گے ہی۔ ان اخبارات و رسائل کے بعد اگر آگرہ سے نکلنے

Scanned with CamScanner

والے رسالہ 'معلم العملہ' کی بات کی جائے تو ادبی موضوعات اور صحافتی انسلاکات وہاں بھی واضح ہوتے ہیں۔ اس اخبار کی پیشانی پر لکھا ہوا ہوتا تھا 'ہر چند یہ رسالہ ایما گورنمنٹ چھاپا جاتا ہے'۔ لیکن تاریخی حقائق شاہد ہیں کہ اس میں علمی، تاریخی، سیاسی، ادبی، سائنسی مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس نقطہ نظر سے اخبارات ورسائل کا جائزہ لیتے چلے جائیں، آپ کو اندازہ ہوگا کہ اس زمانہ میں ادبی اور صحافتی مسائل کے درمیان باضابطہ تفریق نہیں کی جاتی تھی۔ ہوتا بھی عموماً یہی ہے کہ کسی بھی کام کے شروعاتی دنوں میں 'اہتمام یا تزئین کاری' کا معاملہ کوئی بہت اہم نہیں رہتا۔ اس وقت حالات اور مسائل سے ہی زیادہ سروکار رکھے جاتے ہیں، جیسا کہ اردو صحافت کے ابتدائی دور میں ہندوستانیوں کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ آزادی تھا، اس لیے ادبی مسائل سے قطع نظر صحافتی یا وقتی مسائل سے زیادہ سروکار رکھا گیا، چنانچہ ایسے وقت میں ادبی مسائل کا غلبہ نہ رہ کر صحافتی غلبہ رہا ہے۔

عتیق صدیقی کی کتاب 'ہندوستانی اخبار نویسی' کے حوالے سے اپنے مضمون 'انیسویں صدی اردو صحافت' مطبوعہ 'آجکل' میں سوم آنند لکھتے ہیں:

'1857ء کے اوائل کے ہندوستانی اخباروں میں عموماً اور اردو اخبارات میں خصوصاً انگریزوں اور ایرانیوں کی جنگ کی خبریں اس کثرت سے شائع ہوتی تھیں کہ جس کا کوئی حد وحساب نہ تھا۔ ان خبروں کا مواد اور ان کو پیش کرنے کا انداز اعلانیہ انتہائی انگریز دشمنانہ ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی کے اخباروں نے

جن کے مالک اور ایڈیٹر یا تو انگریز تھے یا کمپنی کے وفادار، شور مچانا شروع کیا کہ اردو اخبارات نفرت اور بغاوت کی تبلیغ کر رہے ہیں۔(6)

اس دور کے اخبار میں 'کوہِ نور 1850ء' کا نام انتہائی نمایاں ہے، جو لاہور سے شائع ہوتا تھا، اس میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے خلاف بھی مضامین لکھے گئے، جس کی پاداش میں اسے بند کرنا پڑا۔ ادب اور سیاست میں منشی کنول کشور کا 'اودھ پنچ' بھی بلند معیار کا تھا۔ اس کے معیاری ہونے کے ثبوت میں منشی سجاد حسین، مولانا عبدالحلیم شرر، پنڈت رتن ناتھ سرشار وغیرہ کا ایڈیٹر ہونا بھی ہے۔

Scanned with CamScanner

اسی طرح ریاض خیرآبادی کا ''ریاض الاخبار'' بھی شعروادب کے لئے معیاری تھا۔

دبدبۂ سکندری (رام پور) نور الانوار (کانپور) آصفہ الاخبار (حیدرآباد) اپنے دور کے معیاری اور بہترین اخبار تھے۔ بیسویں صدی میں سردار دیوان سنگھ کے ہفت روزہ اخبار ''ریاست'' نے بھی بڑی شہرت کمائی، معروف ومشہور والیان ریاست کے ذاتی واندرونی معاملات وحالات کی نقاب کشائی اس کے ذریعہ ہوئی، ان کے اس کارنامہ پر دھمکیاں دی گئیں، سازش رچی گئی، مگر سردار دیوا سنگھ نے ثابت قدمی دکھائی، تمام دھمکی آمیز رویہ سے لاپرواہو کر اپنے مشن میں لگے رہے۔ وہ انتہائی نڈر اور بے باک تھے۔

اردو رسائل وجرائد کے ذریعہ علم وادب کی خوب ترویج واشاعت ہوئی۔ سید امتیاز علی تاج کا ''کہکشاں'' سرسید کا ''تہذیب الاخلاق'' مولانا حسرت موہانی کا ''اردوئے معلیٰ'' سر عبدالقادر کا ''مخزن'' مولانا آزاد کا ''لسان الصدق'' حکیم محمد یوسف کا ''نیرنگ خیال'' خواجہ حسن نظامی کا ''نظام المشائخ'' راشد الخیری کا ''عصمت'' شاہد احمد دہلوی کا ''ساقی'' مولوی عبدالحق کا سہ ماہی ''اردو'' اور ماہنامہ ''سائنس'' وغیرہ ایسے پر مغز اور معیاری رسالے تھے جن سے علم وادب اور سیاست وثقافت کی عظیم الشان تاریخ وابستہ ہے۔

جیسا کہ یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ اردو فکشن کا سنہری دور بیسویں صدی ہے، اسی طرح یہ کہا جانا بھی حقیقت سے دور نہیں کہ اردو صحافت کا عہدِ زریں بیسویں صدی ہے۔ اس دور میں ہی اردو صحافت کھل کر سامنے آئی۔ اس طرح انیسویں صدی میں اردو صحافت کا آغاز ہوا۔ بیسویں صدی میں پلی بڑھی۔ نوخیزی آئی ہے۔ آج تقریباً دوسو سالہ سفر طے کر کے اردو صحافت ہم تک پہنچی ہے۔ اس لمبے سفر کے متعلق بہت سے لوگوں کی رائے یہ ہے کہ اردو صحافت بوڑھی ہوگئی ہے، تاہم میں قطعاً یہ ماننے کو تیار نہیں ہوں۔ یہاں پر ایک اقتباس:

'غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو صحافت نے نوخیزی کے جلوے تو دکھائے ضرور ہیں، تاہم اس کے عین حسنِ شباب کا دیدار تاہنوز نہیں ہوا۔ اس کا حسنِ شباب شاید اس وقت سامنے آئے گا، جب صحافت ملکی، فرقہ پرستی اور دیگر جنگ سے لاپرواہو کر فقط اپنی 'آزادی' کی جنگ ہی

Scanned with CamScanner

جیت لے۔ جدوجہد آزادی میں اردو صحافت کے کرشمے نوخیزی پر ہی مبنی ہیں۔ اب اردو صحافت اگر اپنی آزادی کی جنگ جیت لیتی ہے تو اس کا عین حسن شباب آشکار ہوگا.... اردو صحافت کی جوانی کب آئے گی کہ وہ اپنے بل پر صحافت کو گھر کی لونڈی بنانے والوں سے لوہا لے سکے۔'(7)

یعنی اب یہ کہہ کر کہ اردو صحافت بوڑھی ہو چکی ہے، اس سے امید وابستہ کرنا بہتر نہیں ہے، مناسب خیال معلوم نہیں پڑتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر طرح سے اردو صحافت مضبوط ہو رہی ہے۔ اس کا دائرہ کار وسیع ہو رہا ہے۔ اس کے امکانات روشن ہو رہے ہیں۔ بس تھوڑے دنوں میں اپنی آزادی کی جنگ بھی وہ جیت لے گی۔

بیسویں صدی اردو صحافت کا زریں عہد ہے۔ اس میں کے اولین ستاروں میں مولانا ظفر علی خان، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مولانا حسرت موہانی اور مولانا عبدالحمید وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ماقبل آزادی ہی اردو اخباروں کا جال بچھنے لگا۔ اخبارات ہی نہیں بلکہ رسائل وجرائد بھی سامنے آئے، جنہوں نے اپنی اپنی نگارشات سے عوام کی رہنمائی کی، ان میں سیاسی اور ثقافتی شعور بیدار کیا۔ الہٰ آباد، لکھنؤ، آگرہ ممبئی، امرتسر، لاہور جے پور، کشمیر غرض کہ پورے ہندوستان میں اردو صحافت بیداری کی لہر چلنے لگی۔ روزناموں میں ''پیشہ'' (لاہور) ''وکیل'' (امرتسر) ''زمیندار'' (لاہور) ''پرتاب'' (لاہور) وغیرہ سرفہرست تھے۔ ان سب نے صحافتی دنیا میں بڑا نام کمایا۔

بلاتفریق ہندو مسلم دونوں نے صحافتی میدان میں کافی طبع آزمائی کی، اردو صحافت کے فروغ میں انہوں نے تقریباً یکساں حصہ لیا۔ آزادی سے قبل لگ بھگ اردو ملک کے ہر گوشہ میں تھی، اس لئے اردو صحافت کو ملک کے چپہ چپہ اور قریہ قریہ پر فروغ ہوا۔ ہر طبقہ اپنے خیالات ونظریات کی تبلیغ واشاعت کے لئے اردو کا انتخاب کرنے لگا۔ یہی وجہ تھی کہ چند سالہ عرصہ گزرا نہیں کہ اردو صحافت کو منفرد مقام نصیب ہوا، اس کو ملک گیر حیثیت حاصل ہوگئی۔

Scanned with CamScanner

بیسویں صدی کی صحافت میں اہم اور نمایاں نام مولانا ابوالکلام آزاد (محی الدین احمد) کا ہے۔ ان کا ہفت روزہ ''الہلال والبلاغ'' اردو میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان دونوں اخبار کے ذریعہ انہوں نے مسلمانوں میں سیاسی اور قومی بیداری کی روح پھونک دی۔ مردہ ضمیر کو جھنجھور دیا۔ سرد انگیٹھیوں کو گرمایا۔ زندہ دلی اور اولوالعزمی کا سبق سکھایا۔ ان کا شاندار انداز خطابت اور بلند آہنگ اسلوب نگارش؛ دعوت وعزیمت اور استقلال وجوانمردی کا سبق لئے صحافی افق پر نئے رنگ وروپ میں نمودار ہوا۔ جس سے اصحاب قلم اور تعلیم یافتہ طبقہ بھی محو حیرت تھے۔ ان کی شعلہ نوائی اور آزاد گفتاری نے سامراجی قلعوں کو تھرا دیا۔ ''الہلال'' کی شروعات 1912ء میں ہوئی۔ اس کی آتشیں اور گرانمایہ تحریروں نے ایک ہلچل سی مچادی تو اس کی ضمانت ضبط ہوگئی۔ ضبطی کے بعد ''البلاغ'' منصۂ شہود پر آیا۔ اس کی عمر انتہائی قلیل رہی۔ کوئی سال بھر بھی یہ نکل نہ سکا۔ مولانا آزاد کو ان دونوں اخبار کے پاداش میں نہ جانے کیسی کیسی مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔ قید وبند کی صعوبتوں میں زندگی گزارنا پڑی۔ زبردست مالی خسارہ ہوا۔ مگر انہوں نے اپنی روش ترک نہ کی۔ بلاشبہ ان دونوں پرچوں سے اردو صحافت کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔

آزادی کے بعد اگرچہ اردو صحافت ورسائل کی تعداد بہت زیادہ ہے مگر اردو تعلیم کے محدود ہونے کی وجہ سے اس کا حلقہ بھی محدود ہوتا نظر آرہا ہے۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آج اردو صحافت ناموافق حالات سے دوچار ہے۔ اس کے باوجود بھی اردو کے شیدائیوں نے صحافتی معیار کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ اس کی روایت کو بڑے اہتمام سے آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے اور ایک حد تک اس کوشش میں کامیاب بھی نظر آرہے ہیں۔ ان دنوں اخبارات میں تعلیمی، سماجی، ثقافتی تحریریں بہت کم ہوتی ہیں، سیاسی مضامین کا دور دورہ ہے۔ حالانکہ سیاست کے علاوہ دیگر موضوعات کو بھی یکساں جگہ دینا قریب از فہم ہے۔

یہ انتہائی خوشی کی بات ہے کہ ناموافق حالات میں بھی اردو صحافت نے عوام کو سہارا دیا اور اب بھی دے رہی ہے، مگر بدقسمتی کی بات ہے کہ جس طرح آج سیاست سے شفافیت عنقا ہے اسی

Scanned with CamScanner

طرح صحافت سے بھی شفافیت دور ہوتی جارہی ہے۔ سیاست کا آج صحافت پر دبدبہ ہے اس لئے وہ بھی اس کے اثرات بد سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ ان دنوں جو بھی کام سیاست کی نذر ہوجائے بننے کے بجائے بگڑ جاتا ہے۔ اس لحاظ سے بھی صحافت میں دیگر موضوعات کو جگہ دینا زیادہ بہتر ہے۔

صحافت پر سیاست کے غلبہ کی وجہ سے اس کا سب سے اہم عنصر بھی غائب ہوتا نظر آرہا ہے۔ صحافت اور صحافیوں کا خمیر دراصل ''جوانمردی، اولوالعزمی، بلند حوصلگی اور بے باکی'' سے تیار ہونا چاہئے، اس میں رتی برابر بھی بدعنوانی کی گنجائش نہیں ہونی چاہئے۔ مگر افسوس کہ سیاست نے ان اوصاف پر دبیز پردے ڈال دئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علی العموم صحافیوں سے بلند حوصلگی اور بے باکی کی صفت سلب ہوتی جارہی ہے۔ ان کے نیک جذبات اور روشن خیالات بسا اوقات مالکان کے سیاسی مفاد کی بنیاد پر لفظوں کا جامہ نہیں روشنی میں صحافیوں نے آزادی کی جنگ جیتی ہے۔ حوصلہ مندی کی روشنی سے اردو تاریخ کو منور کردیا۔ نوجوانی کا کرشمہ دکھایا۔ اس طرح بیسویں صدی میں جوانی کی رمق اور جلوے دکھا کر اردو صحافت نے تاریخ کو اپنی طرف ملتفت کرلیا۔ لہذا تاریخ سنہرے حرفوں اور آب زر لیے بیسویں صدی کے آخر تک صحافت کے شانہ بہ شانہ چلتی رہی ہے۔ لیکن جوں جوں اردو صحافت آگے بڑھتی جارہی ہے یا یوں کہیں کہ بیسویں صدی میں داخل ہوتی گئی تو تاریخ کے ہاتھو

ں سے آب زر اور سنہرے الفاظ چھنتے چلے گیے۔ اس طرح آج کی صحافت کے لیے تاریخ کے پاس جو الفاظ رہ گئے، وہ ہیں 'مداہنت، غیر ذمہ دارانہ رویہ جانبداری' اور بس کچھ نہیں۔

حواشی و حوالات:

(1) ڈاکٹر شاہد حسین، ابلاغیات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2003، ص 76۔

(2) ایضاً ص 77۔

(3) محمد حسین آزاد، آب حیات (طبع سوم) اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو 1953، ص 204۔

(4) مہیمنہ خاتون (مصنف و ناشر)، دہلی میں ادبی صحافت کی تاریخ اور ایوان اردو، 2010

Scanned with CamScanner

ص15۔
(5)ڈاکٹر ہمایوں اشرف (مرتبہ)اردو صحافت : مسائل اور امکانات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی2006، ص365۔
(6)ماہنامہ آجکل دہلی، نومبر دسمبر، 1983۔
(7)مضمون نگار: سلمان عبدالصمد، مطبوعہ، روزنامہ 'دائمی پرواز' نوئیڈا، 13 ستمبر 2015۔

☆☆☆

شمشاد بی

ریسرچ اسکالر،

شعبہ اردو ایم یو

علی گڑھ

Scanned with CamScanner

انیسویں صدی کا لکھنؤ، تاریخ، ادب اور صحافت کے آئینے میں

تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ 18 ویں صدی مغلیہ سلطنت کے رو بہ زوال اور بے وقار ہونے کی صدی تھی۔ ٹیپو سلطان کی شکست و شہادت اس صدی کا ایک بڑا سانحہ تھا۔ انیسوی صدی ہندوستان کی تاریخ میں تبدیلیوں کی صدی ہے۔ یہ صدی جس قدر نشیب و فراز سے دوچار ہوئی، وہ ہماری تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے۔ انیسویں صدی کی ابتدا اور ٹیپو سلطان کی شکست کے بعد ہی ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا اور رفتہ رفتہ پورے ملک پر انگریزوں کا اقتدار قائم ہو گیا۔ 1800-1856 تک جھانسی، برار اور اودھ بھی انگریزی سلطنت کا حصہ بن گئے۔ تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انیسویں صدی میں انگریزوں نے ہندوستان پر حکومت کرنے کے لئے اپنے قدم مضبوطی کے ساتھ جمانے شروع کر دیئے تھے۔ اسی کے ساتھ ہی یہ صدی مسلسل تغیر و تبدل کی صدی بھی رہی۔ اس صدی میں ہمیں ہندوستان کی تہذیبی، معاشرتی، ثقافتی اور مذہبی اقدار میں حیرت انگیز تبدیلی واقع ہوتی نظر آتی ہے۔ ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ چیزیں نئے عہد کے تحرک اور سماجی عمل کی تبدیلی سے اپنے مقامات بدل رہی ہیں۔ مثلاً روایتی مدارس کی جگہ اسکولوں اور کالجوں نے لے لی۔ روایتی علوم کی جگہ نئے سماجی اور سائنسی علوم درس و تدریس میں جگہ پانے لگے۔ سرائے کی جگہ ہوٹلوں اور حکیموں اور وَیدوں کی جگہ ڈاکٹروں نے لے لی۔ سفر کے لئے بیل گاڑی کی جگہ ریل گاڑیاں رواں دواں ہوئیں۔ ان جدید تبدیلیوں کے باعث ہر شخص الجھن اور پریشانی کا شکار تھا۔ معاشرتی اور تہذیبی اقدار اور سماجی نظام کی اس تبدیلی نے پورے ملک کو ایک کشمکش سے دوچار کر دیا تھا۔ ایسی کشمکش میں لکھنوی معاشرے کا کیا

Scanned with CamScanner

حال تھا اور وہاں کس طرح کی اتھل پتھل تھی آیئے اس کا جائزہ لیں۔

انیسویں صدی کی ابتدا میں اودھ کی ریاست ایک خوشحال ریاست تھی۔ یہاں امن و امان کا دور دورہ تھا۔ دہلی کے زوال کے بعد مسلمانوں کا تہذیبی مرکز لکھنؤ بنا۔ یہاں ابھی تک پرانا سماجی نظام قائم تھا اور اس نظام کو کچھ عرصہ تک مزید قائم رکھنے میں اودھ کے ابتدائی حکمرانوں کی حکمتِ عملی نے اہم کردار ادا کیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی نظر ریاست پر شروع سے ہی لگی ہوئی تھی، اس کی وجہ یہ تھی کہ یہاں قدرتی وسائل کی فراوانی تھی۔ کمپنی نے شجاع الدولہ کے زمانے سے ہی اس ریاست سے فائدے حاصل کرنے شروع کر دیئے تھے۔ کمپنی نے اپنی شاطرانہ چالوں سے حکمرانوں کے اِختیارات کو محدود کرنے کا عمل جاری کر رکھا تھا اور رفتہ رفتہ اودھ پر اسے مکمل اختیار حاصل ہو گیا۔ حکمرانوں کے اِختیارات کو محدود کرنے کا سلسلہ باضابطہ طور پر 1801ء سے شروع ہوا اور مختلف النوع پیچیدگیوں کو پیدا کرتے کرتے بالآخر کمپنی نے 10 نومبر 1801ء کو نواب سعادت علی خاں سے ایک معاہدے پر دستخط کرا لیا جس کے تحت انھیں اپنی ریاست کی کئی جائدادوں سے دستبرداری اور کمپنی کے اصول وضوابط کے تحت کام کرنے کا پابند ہونا پڑا۔ اِختیارات کو محدود کرنے کا یہ سلسلہ نواب واجد علی شاہ تک بدستور قائم رہا۔ اس مدت میں جتنے بھی نوابین گزرے وہ حکومت کرنے کے سلسلے میں قدرے لاپرواہ ہونے کے ساتھ عیش وحسن پرستی کے دلدادہ تھے۔ حکمرانوں کی اسی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کمپنی کا اودھ کی ریاست پر قابض ہونا اور بھی آسان ہو گیا تھا۔

اس دور میں لکھنؤ کے شعر وادب کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح پورا معاشرہ عیش ونشاط میں ڈوبا ہوا تھا اسی طرح اس دور کا ادب بھی عیش وحسن پرستی کا دلدادہ تھا۔ لکھنوی شعر وادب مصنوعی حسن کی رنگینیوں میں گم ہو گیا تھا۔ حسن وعشق کی کیفیتوں کے بیان میں

Scanned with CamScanner

رمز و اشاریت کی جگہ جذبات کے بے ساختہ اظہار نے لے لی۔ غزل کی معنوی گہرائی نے اپنا وجود کھو دیا اور اس کے گرد لکھنؤ کی مصنوعی زندگی کے اثرات سے آرائشِ جمال کا ہالہ بن گیا۔ لکھنوی شعرا کی فہرست میں ناسخ، رنگین، پروانہ، ہوس وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے جن کے اشعار میں لکھنؤ کے اس ماحول کی عکاسی ہوئی ہے۔

غزل سے قطع نظر نثر کا ذکر کیا جائے تو رجب علی بیگ سرور کا نام سرِ فہرست ہے۔ اس دور کی نثر رنگین، عبارت مقفیٰ و مسجع تھی۔ سرور نے خاص لکھنوی انداز کی پیروی کی اور 1824ء میں ''فسانۂ عجائب'' لکھی جو کہ لکھنوی معاشرے کا آئینہ تھی۔

دیا شنکر نسیم نے اپنی مثنوی ''گلزارِ نسیم'' 1838ء میں لکھی۔ اس تخلیق میں بھی لکھنوی معاشرے کے رسم و رواج، تہذیبی و سماجی زندگی کی حقیقی تصویر ملتی ہے۔

یہ اُس دور کی تصانیف ہیں جب انگریز رفتہ رفتہ ریاست لکھنؤ کو اپنی گرفت میں لے رہے تھے جس کے اثر سے عوام ابھی تک محفوظ تھے۔ لیکن لکھنؤ کی ریاست کا امن و امان 1849ء میں متاثر ہوا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری اپنی کتاب ''فسانۂ آزاد: ایک تنقیدی تجزیہ'' میں رقم طراز ہیں:

> 1849ء میں کرنل سلیمن نے سیاسی مقاصد کے تحت اودھ کا دورہ کیا اور اس دورے کی ایک مفصل رپورٹ مرتب کی جس میں ریاست کی بد انتظامی اور ابتری کو نمایاں کیا تھا... اس رپورٹ کا حقیقی مقصد اودھ پر قبضہ کرنے سے پیشتر اس رپورٹ کے ذریعہ عمومی ردِ عمل کا جائزہ لینا تھا۔ بالآخر حالات موافق پا کر اودھ پر قبضہ کرنے کی کارروائی مکمل کر لی گئی۔'' (صفحہ 17)

Scanned with CamScanner

اس کے بعد 26 فروری 1856ء کو باضابطہ طور پر اودھ پر قبضہ کرلیا گیا۔

یہاں سے ریاست اودھ کی سرزمین میں زبردست تبدیلیاں رونما ہوئیں اور اس کا اثر ادب وصحافت پر صاف نظر آتا ہے۔ پوری ریاست میں غم واندوہ کے بادل چھا گئے اور یہاں کے لوگوں کے ذہن پر اس تباہی کا گہرا اثر پڑا۔ یہ ثقافتی آشوب اس دور کے لکھنے والوں کو بھی مسلسل متاثر کرتا رہا۔ وہ مدتوں تک اپنی تحریروں میں اس ثقافتی غم کا اظہار کرتے رہے۔ رجب علی بیگ سرورؔ صبطی اودھ کے بعد تاثرات کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان دنوں کہ 1272ھ اور مہینہ شعبان کا، مجمع پریشانیوں کے سامان کا ہے۔ شہر کا چھوٹا بڑا مبتلائے مصیبت، تختۂ مشقِ جور وجفا ہے۔ اس گلزارِ ہمیشہ بہار میں بہمن ودے کا سامان ہے۔ ایسا آباد ملک سنسان سراسر ویران ہے۔'' (شگوفۂ محبت)

سرورؔ فسانۂ عبرت میں لکھتے ہیں:

''ہر تختے میں صبا شب کو خاک اڑاتی ہے، دن کو خوف سے جان جاتی ہے۔ لو چلتی ہے، دھوپ کے تڑاقے سے زمین جلتی ہے۔ حسرت وتمنا سنگِ فرش پر سر پٹکتی ہے۔''

فدا علی عیشؔ اس تہذیبی تباہی کا منظر یوں بیان کرتے ہیں:

''جب لکھنؤ رعایا سے خالی ہوا۔ مکانوں کے کھدنے کا حکم ملا، لاکھوں گھر کھد کر زمین کے برابر ہوگئے۔ آبادی کا نام ونشان کیا، نام تک نہ رہا، لکھنؤ سنسان ہُو کا مکان ہوگیا۔'' (فسانۂ دل صفحہ 6)

مندرجہ بالا اقتباسات سے واضح ہوتا ہے کہ ریاستی عوام مکمل طور سے تباہ ہو چکے تھے۔ تبسم کاشمیری

Scanned with CamScanner

لکھتے ہیں:

''عیش پسندی اور زندگی سے فراریت کے تصور نے ذہنی سطح پر
اس معاشرے کو مفلوج کر دیا تھا۔''

(فسانۂ آزاد: ایک تنقیدی جائزہ''، صفحہ 31)

ایسے حالات میں ادب و صحافت نے عوام کی ہمت افزائی کی اور معاشرے میں ہو رہی تمام واردات پر اظہارِ خیال کیا اور اس کی تائید و تردید بھی کی۔

انیسویں صدی کے آغاز میں ہی ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی تمام تر منصوبہ بندیوں کے ساتھ مغلیہ سلطنت کو شکست دے دی تھی۔ کمپنی نے اپنے اثرات کو موثر اور مستحکم بنانے کے لئے 1830ء میں فارسی زبان کی جگہ اردو کو سرکاری زبان کا درجہ عطا کر دیا جس کا فائدہ یہ ہوا کہ اردو زبان و ادب کے ساتھ ساتھ اردو صحافت ترقی کی طرف گامزن ہوئی۔ اس سلسلے میں محمد افتخار کوکھر اپنی کتاب ''تاریخِ صحافت'' میں رقم طراز ہیں:

''1835ء میں سر چارلس مٹکاف کی جانب سے صحافت پر عائد
پابندیوں میں نرمی سے علاقائی زبانوں بالخصوص اردو صحافت کو بہت فائدہ
پہنچا۔ لیتھو طرزِ طباعت نے اخبارات کی طباعت و اشاعت کو ٹائپ کے
مقابلے میں سستا اور آسان کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ حکومتی سرپرستی نے بھی اردو
صحافت کو پروان چڑھایا۔ (صفحہ 35-34)

اودھ پرا

نگریزوں کے قبضہ کے چند مہینوں کے بعد لکھنؤ کا پہلا اخبار ''طلسم لکھنؤ'' منظر عام پر آیا۔ یہ اخبار 25 جولائی 1856ء میں جاری ہوا جس کے مدیر مولوی محمد یعقوب انصاری تھے۔

Scanned with CamScanner

''طلسم لکھنؤ'' جرأت آمیز اور بے باک اخبار تھا بلکہ یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ یہ اخبار اودھ پر انگریزوں کے قبضے کے بعد پیدا ہونے والے حالات کا واضح عکس تھا۔ کمپنی کی عمل داری کے بعد لکھنؤ کے عوام بے کاری اور فاقہ کشی میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اس صورتِ حال کی طرف مذکورہ اخبار کی یہ رپورٹ ملاحظہ ہو:

''تھانے دار نے لکھا کہ جُلا ہے فاقہ کشی میں گرفتار ہیں اسی لئے یہاں رہنے سے بیزار ہیں۔ کھانے پینے کی تکلیف پائی، مبتلائے تباہی ہوئے۔'' (''طلسم لکھنؤ''، 29 اگست 1856ء)

انگریز افسران کی رشوت خوری کا ذکر بھی اس اخبار کی ایک رپورٹ میں ملتا ہے:

''اب کے سال صاحبانِ انگریز نے رشوت ستانی کا دروازہ کھولا ہے۔ خوب گرم بازاری ہوئی۔ بڑے بڑے مال ہاتھ آئے۔ بہت کچھ ملا۔ مسٹر راورٹی صاحب اسسٹنٹ کمشنر ملتان کا حال مدت سے اخباروں میں چھپ رہا ہے۔''

(''طلسمِ لکھنؤ''، 17 اکتوبر 1856ء)

لکھنؤ کے عوام نواب واجد علی شاہ کے معزول ہو کر کلکتہ چلے جانے کے بعد بھی ان کو شدت سے یاد کرتے تھے۔ لکھنؤ میں جو کچھ بھی وارداتیں ہوئی تھیں اس کی خبر نواب صاحب کو بھی تھی۔ اس بات کی تصدیق ''طلسم لکھنؤ'' کی ایک خبر سے ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

''جب سے والی ملک نے شہر چھوڑا ہے، اہلِ شہر کا شیشۂ دل سنگِ حوادث نے توڑا ہے۔ ہر روز ایک نئی وارِدات کا ظہور ہوتا ہے، نئی نئی

Scanned with CamScanner

طرح ہر پیرائے میں فتور ہوتا ہے۔ خبر خواہ ایسے ایسے سانحے دیکھ کر روتے ہیں،
حسرت سے جان کھوتے ہیں۔'' (''طلسمِ لکھنؤ''، 14 نومبر 1856ء)

لکھنؤ کا دوسرا اخبار ''سحرِ سامری'' کے نام سے 17 نومبر 1856ء کو جاری ہوا جس کے مدیر مشہور شاعر امیر مینائی تھے۔ ''طلسمِ لکھنؤ'' کی طرح ''سحرِ سامری'' بھی اس دور کے حالات کی ترجمانی کرتا ہے۔ اخبار میں جو خبریں ریاست اودھ کے تعلق سے چھپتی تھیں ان میں وہاں کے حالات کا حال معلوم ہوتا ہے۔ اس اخبار کی خاص بات یہ تھی کہ یہ مسجع و مرصع عبارت میں اپنی تحریروں کو پیش کرتا تھا۔ ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''اِن دنوں غلّے کی گرانی ہے، گرانی خاطر کی ارزانی ہے۔ اس قدر مہنگا اناج ہے، آسیائے فلک بھی دانے کو محتاج ہے۔ بے معاشی نے ہر قماش کے آدمی کا اطمینان کھو دیا، جس نادان و دانا نے حال بربادی سنا، رو دیا۔''

''اودھ اخبار'' لکھنؤ کا تیسرا اخبار تھا اور اس کو منشی نول کشور نے جاری کیا تھا۔ یہ اخبار اُس وقت کا بہترین اخبار تھا۔ قوم پرستی اس اخبار کی پالیسی کا اہم جز تھا۔ جہاں کہیں بھی انگریزوں کے ہاتھوں ظلم و زیادتی ہوتی تھی یہ اخبار وہاں اپنا احتجاج ضرور بلند کرتا تھا۔ ''اودھ اخبار'' مغربی تہذیب و تمدن کے خلاف تھا اور اس کا سحر جس رفتار سے ہندوستانیوں کو اپنی گرفت میں قید کر رہا تھا، یہ اخبار اس کی سخت تنقید کرتا تھا۔

11 اکتوبر 1886ء کو ''صحیفۂ نامی'' نام کا اخبار حافظ خواجہ احمد حسن شوکت نے جاری کیا۔ اس

اخبار کی خبریں فکر انگیز تھیں۔ موجودہ حالات کے تحت ہونے والی تباہیوں سے بچنے اور ملک کی تجارتی ترقی کے امکانات پر بھی اس اخبار میں اظہارِ خیال کیا جاتا تھا۔ اس اخبار سے

Scanned with CamScanner

ایک مضمون کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''اوّل اپنے ملک کی تجارت کو بڑھانا، دوم مصنوعات میں ترقی کرنا۔ تجارت کے ذریعہ سے ملک سرسبز ہوسکتا ہے اور بہت سی اشیائے قدرتی خواہ مصنوعی جو ایک ملک میں میسر نہیں آتی ہیں، دوسرے ملک سے حاصل ہوسکتی ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ مصنوعات سوائے بذاتہا مفید ہونے کے جزو اعظم اشیائے تجارت ہیں۔

''اودھ پنچ'' اخبار کا پہلا شمارہ 16 جنوری 1877ء کو جاری ہوا۔ یہ اردو زبان کا پہلا مزاحیہ اخبار تھا۔ ''اودھ پنچ'' بظاہر مزاحیہ اخبار تھا لیکن ہندوستان کے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ثقافتی ماحول پر سنجیدگی کے ساتھ طنز و مزاح کے پیرائے میں اظہارِ خیال کرتا تھا۔ یہ اخبار مغربی تہذیب و علوم کا شدید مخالف تھا۔ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم و تہذیب کے پیشوا سرسید تھے اس لئے یہ اخبار ان کی بھی مخالفت کرتا تھا۔ اس کے علاوہ ''اودھ پنچ'' اخبار حکومت پر بھی جرأت مندانہ تنقید کرنے میں ماہر تھا۔ ''اودھ پنچ'' میں انگریزوں کی استحصالی تدابیر کو اپنے مخصوص طرزِ سخن میں طنز و مزاح کے پیرائے میں پیش کیا جاتا تھا۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:

> ''تہذیب! تہذیب! تہذیب! سنتے سنتے کان پک گئے۔ جدھر دیکھو ادھر تہذیب ہی تہذیب۔ اٹھنے بیٹھنے میں تہذیب، چلنے پھرنے میں تہذیب۔ تہذیب کم بخت تو جان کی عذاب ہوگئی۔''

''اودھ پنچ'' کی اشاعت کے 18 سال بعد منشی نول کشور نے اسے روزنامہ بنانے کا ارادہ کیا۔ یہ اردو کا پہلا روزنامہ تھا۔ اس اخبار میں ہر قسم کی خبریں چھپتی تھیں۔ اخبار کو خبروں کے علاوہ عوام کے مسائل سے بھی گہری ہمدردی تھی۔ اخبار فرسودہ اور نامعقول رسوم کا بھی شدید مخالف تھا۔ اس اخبار کی اہم اور خاص بات یہ تھی کہ اس میں رتن ناتھ سرشار کا ناول ''فسانۂ آزاد''

Scanned with CamScanner

1878ء سے قسط وار شائع ہونا شروع ہوا اور اس نے اس اخبار کی مقبولیت میں بہت اضافہ کیا۔ اس سلسلے میں مرزا جعفر حسین اپنی کتاب ''قدیم لکھنؤ کی آخری بہار'' میں لکھتے ہیں:

''لکھنؤ کے قدیم معاشرے میں گو کہ سیاسیات کو خواص و عوام کی زندگی میں کوئی مقام حاصل نہیں تھا لیکن صحافت کی افادیت اس وقت بھی مسلّم الثبوت تھی۔ تعیش اور فارغ البالی کے دور میں جب زندگی بسر کرنے کے انداز سہل نگاری پر قائم تھے، سماج کو نئے رخ کی طرف اودھ اخبار نے ہی موڑا تھا اور اس کی ذہنیت اور تربیت پنڈت رتن ناتھ سرشار کے ''فسانۂ آزاد'' اور ''اودھ اخبار'' کی حالاتِ زمانہ سے باخبر کرنے کی کوششوں کو دخل تھا۔'' (صفحہ 246)

1857ء کی جنگِ آزادی کے بعد پورے ہندوستان کے شعر و ادب میں تبدیلی محسوس ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ 1878ء سے لکھا جانے والا ناول ''فسانۂ آزاد'' اس کی مثال ہے جس میں لکھنؤ کی زوال آمادہ تہذیب کی عکاسی کی گئی ہے۔ 1898ء میں لکھا گیا رسوا کا ناول ''امراؤ جان ادا'' بھی اس کا عکاس ہے۔ تبسم کاشمیری اپنی کتاب ''فسانۂ آزاد: ایک تنقیدی جائزہ'' میں لکھتے ہیں:

''فسانۂ آزاد'' کے وسیع کینوس پر ہم دو دنیاؤں کا نظارہ کرتے ہیں، پرانی دنیا اور بدلتی ہوئی نئی دنیا۔ یہ دونوں دنیائیں اپنے اپنے بہاؤ میں بہتی ہیں اور کہیں کہیں ان کے وجود تصادمات کا شکار بھی ہوتے ہیں ان تصادمات میں پرانی دنیا ہمیشہ ٹوٹتی، بکھرتی اور کمزور ہوتی ہوئی دکھائی دیتی

Scanned with CamScanner

ہے جب کہ نئی دنیا اپنی تازہ توانائی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ یہ تازہ توانائی اسے نئے سماجی شعور نے دی ہے اور یہ نیا سماجی شعور پرانی دنیا کو مغلوب کرتا نظر آتا ہے مگر پھر بھی یہ مغلوب دنیا تاریخ کے پہیے کو پکڑنے کی کوششوں میں مصروف ہے۔'' (صفحہ 23)

انیسویں صدی کے لکھنوی معاشرے میں عوام سے لے کر خواص تک، سیاست سے لے کر مذہب تک، تہذیب وثقافت سے لے کر رسم ورواج تک اور معاشرے کی تمام واردات اور حادثات کا ذکر ہمیں لکھنوی شعروادب اور اخبارات میں ملتا ہے۔ مندرجہ بالا مثالوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انیسویں صدی کے لکھنوی معاشرے نے ادب کے ساتھ ساتھ صحافت کو بھی متاثر کیا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ لکھنؤ کا پہلا اخبار ''طلسمِ لکھنؤ'' تھا جو 1856ء میں جاری ہوا جب واجد علی شاہ معزول ہو کر کلکتہ جا چکے تھے اور باضابطہ طور پر کمپنی نے اودھ پر قبضہ کر لیا تھا۔ یہاں سے ریاست اودھ کی تقدیر بدل گئی اور پھر اس ریاست کے شعروادب میں تبدیلی واقع ہونے کے ساتھ ساتھ ریاست کی صحافت کا بھی آغاز ہوا۔ بلکہ یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ 1856ء میں کمپنی کے قبضے کے بعد لکھنؤ میں صحافت کی ضرورت محسوس کی گئی اور اخبارات جاری ہونے شروع ہوئے جن میں لکھنوی ماحول اور حالات کی تمام خبریں ہوتی تھیں۔ 19ویں صدی کا یہ زوال پذیر معاشرہ ادب وصحافت کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے تھا اور اس دور کے تمام اخبارات اور تخلیقات میں 19ویں صدی کا مکمل عکس موجود ہے۔

☆☆☆

سفینہ سماوی، ریسرچ اسکالر
شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

Scanned with CamScanner

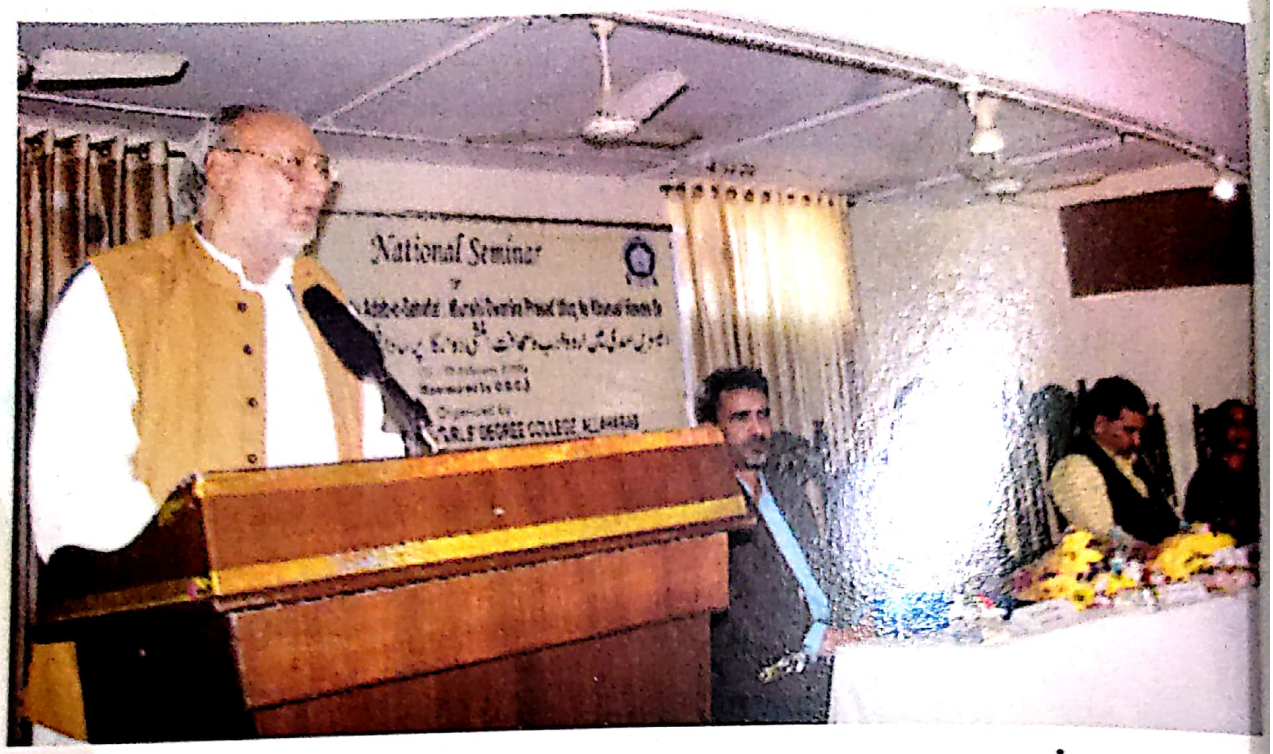

پروفیسر فضل امام سابق صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی اختتامی خطبہ پیش کرتے ہوئے

ڈاکٹر ریحانہ طارق، ڈاکٹر کومل بھٹناکر، پروفیسر فضل امام صاحب ڈاکٹر ابرار رحمانی، ڈاکٹر لئیق رضوی،
ڈاکٹر اسلم جمشید پوری ڈائس پر خطاب کرتے ہوئے

Scanned with CamScanner

2320-3781

Naqsh-e-Nau

2016-17

Annual Udru Journal

سیمینار میں شریک سامعین کا ایک منظر

Published by : Dept. of Urdu Hamidia Girls' Degree College, Allahabad

Printed by : Star Stationery & Books # 9335150370

Scanned with CamScanner